قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (القرآن)

اصلاحِ عقائد، فکرِ آخرت، تزکیۂ نفس، معرفتِ الٰہی اور انسان کے مختلف حالات و مقامات پر مشتمل

لاجواب تفسیرِ قرآن بالقرآن

اَلْاِنْسَانُ فِی الْقُرْاٰن

تصنیف منیف

شمس العارفین، سراج السالکین، جامع البرکات، غوثِ زماں، خلیفۂ اعظم اعلیٰ حضرت شرقپوری قدس سرہ العزیز

حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری قدس سرہ العزیز

تاجدار آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف

حسبِ ارشاد

شیخ طریقت، فخر المشائخ، زبدۃ العارفین، مقبول بارگاہ رسالت حضور قبلۂ عالم

حضرت پیر سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری نور اللہ مرقدہ

زیرِ انتظام

پیر طریقت رہبر شریعت عالمی مبلغ اسلام حضرت صاحبزادہ

پیر سید محمد عظمت علی شاہ صاحب بخاری

سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف

ناشر

دار التبلیغ آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف ضلع گوجرانوالہ

اصلاحِ عقائد، فکرِ آخرت، تزکیۂ نفس، معرفتِ الٰہی اور انسان کے مختلف حالات و مقامات پر مشتمل

لاجواب تفسیرِ قرآن بالقرآن

اَلاِنسان فی القرآن

تصنیف منیف

شمس العارفین، سراج السالکین، جامع البرکات، غوث زماں، خلیفۂ اعظم اعلیٰ حضرت شرقپوری قدس سرہ العزیز

حضرت سیّد نورالحسن شاہ صاحب بخاری قدس سرہٗ العزیز

تاجدار آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف

حسبِ ارشاد

شیخ طریقت، فخر المشائخ، زبدۃ العارفین، مقبول بارگاہ رسالت حضور قبلۂ عالم

حضرت پیر سیّد محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری نور اللہ مرقدہ

زیرِ انتظام

پیر طریقت رہبر شریعت عالمی مبلغ اسلام حضرت صاحبزادہ

پیر سیّد محمد عظمت علی شاہ صاحب بخاری

سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف

ناشر

دارالتبلیغ آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف

ضلع گوجرانوالہ

نام کتاب:	الانسان فی القرآن
تصنیف مبارک:	خلیفہ مجاز اعلیٰ حضرت شرقپوری قدس سرہٗ حضرت پیر سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری قدس سرہٗ تاجدار آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف
اشاعت اول، دوم، سوم:	بحکم حضرت پیر سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری قدس سرہٗ
اشاعت چہارم:	بحکم حضرت پیر سید محمد عظمت علی شاہ صاحب بخاری مدظلہ العالی سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف
بحسن سعی:	حاجی محمد شفیق کیلانی صاحب، لاہور
کمپیوٹر کمپوزنگ:	محمد عبدالغفار نوریؔ
پروف ریڈنگ:	محمد رفیق کیلانی، حافظ احمد حسن کیلانی
ایڈیشن اول:	1372 ہجری
ایڈیشن دوم:	1380 ہجری
ایڈیشن سوم:	1422 ہجری
ایڈیشن چہارم:	1438 ہجری / نومبر 2016ء
ناشر:	دارالتبلیغ آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف ضلع گوجرانوالہ
ہدیہ:	300 روپے
سٹاکسٹ:	نورانی بیرنگ سٹور 56۔ جنرل بس سٹینڈ شہباز مارکیٹ، بادامی باغ لاہور

فہرست عنوانات

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم!

لائق احترام قارئین کرام! آپ کو علم ہوگا کہ کتاب ''الانسان فی القرآن'' تصنیف لطیف قدوۃ العارفین سراج السالکین حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری نقشبندی مجددی قدس سرہٗ خلیفہ مجاز عاشق یزدانی شیر ربانی حضرت اعلیٰ میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۷۲ ہجری میں حضرت مصنف قدس سرہٗ کے وصال مبارک کے متصل بعد طبع ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں فروخت ہوگیا۔ چونکہ اس کتاب میں انسان کی ابتدائے آفرینش سے لے کر جنت و دوزخ بلکہ ابدالآباد تک حالات ومقامات اور اسکے روحانی تنزل وارتقاء وغیرہ نہایت اہم اور گراں قدر مضامین ومسائل نہایت ہی عمدگی اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس اہمیت وافادیت کا احساس کرتے ہوئے حضور قدس سرہٗ العزیز کے لخت جگر اور آپ کے مکمل جانشین سیدی ومولائی حضرت صاحبزادہ سید محمد باقر علی شاہ صاحب زینت بخش آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف نے مذکورہ کتاب کی دوبارہ طباعت کا مصمم ارادہ کرلیا اور لکھنے کیلئے کاتب صاحب کو دے دی۔

یہ حقیر ۱۳۸۶ ہجری ماہ شعبان المکرم میں سالانہ عرس مبارک کی تقریب سعید میں شمولیت کیلئے حاضر ہوا تو حضرت صاحبزادہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ ومداللہ تعالیٰ فیوضہم نے بوقت ملاقات کتاب کی دوبارہ طباعت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے فرمایا کہ پیش لفظ کے طور پر چند باتیں لکھوتا کہ وہ آغاز کتاب میں منسلک کردی جائیں اور وہ باتیں اس انداز سے لکھی جائیں کہ ساری کتاب کا اجمالی خاکہ بیان ہوجائے، تاکہ معالعہ کتاب میں مزید سہولت وآسانی ہو۔

''ولی راولی می شناسد'' کے مطابق ایک عظیم المرتبہ صاحب تحقیق بزرگ کے کلام کے مضمرات واشارات اورتمام گوشے درحقیقت اسی پایہ کے صاحب دل بزرگ پر پورے طور پر روشن ومنکشف ہو سکتے ہیں اور مجھ جیسے طفل مکتب کیلئے عظیم المرتبہ محقق بزرگ کے کلام کے متعلق کچھ عرض کرنا ایک مشکل امر ہے۔ تاہم الامرفوق الادب کوملحوظ رکھتے ہوئے چندحروف لکھنے کی جرأت کرر ہاہوں۔

اولیاء کرام وصلحاء عظام کی زندگی کا اہم ترین شعبہ اورفریضہ اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ راہِ شریعت سے برگشتہ انسانوں اورمنزل عرفان سے بےخبرلوگوں کی ہدایت وراہنمائی اوران کی اصلاح میں مصروف رہتے ہیں۔اور باطنی وروحانی جدوجہد کے ذریعہ ان کی اخلاقی حالت درست کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں کسی قسم کی ملامت وطعن وتشنیع کو خاطر میں نہیں لاتے۔کسی کی وجاہت دنیوی، کسی کا اقتدار، کسی کی فرعونیت انہیں کلمہ حق کہنے سے نہیں روک سکتی اور یہی لوگ صحیح معنوں میں وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ ہوتے ہیں۔اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کی یہ تبلیغی کوششیں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔اپنے اپنے وقت میں ان برگزیدہ ہستیوں نے بھٹکی ہوئی مخلوق کی کچھ اس انداز میں رہنمائی فرمائی کہ جوسعادت مندلوگ ان کے آستانے کے سچے غلام بن جاتے ہیں، ان کے رگ وپے میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کے احکام کی اطاعت اورحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عشق اور جذبۂ اتباع سنت کی غیرفانی روح دوڑنے لگ پڑتی ہے۔روحانی کیف ومستی اورنسبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ السلام کا یہ جام نوش کرلینے کے بعداس کے اس خماروستی کوزمانہ کی کوئی ترشی، حوادث روزگار کی کوئی تلخی دورنہیں کرسکتی۔

زیرنظر کتاب ''الانسان فی القرآن'' ان بزرگ ہستی کی تصنیف وتالیف ہے جن کی پاکیزہ زندگی کی ایک ایک ساعت، ایک ایک لمحہ یادخدااورعشقِ حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء میں گزرتا تھا۔اتباعِ شریعت واتباعِ سنت جن کا طرۂ امتیاز تھا۔کتاب کا ایک ایک فقرہ، ایک ایک جملہ رشدوہدایت اورتلقین وتربیت کے بلند پایہ مضامین ومطالب پر مشتمل ہے۔رواں دواں طرزنگارش کتاب کے حسن وجمالِ معنوی کے ساتھ حسن صوری کی شان کوبھی دوبالا کررہاہے۔خاصانِ حق تعالیٰ کی سحرانگیز شخصیتوں اوران کے پر

تاثیرات کلمات کا کیا کہنا۔ دنیا والے تو ان کو گدڑے وکمبل میں دیکھ کر حقارت کی نگاہیں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی عظمت ورفعت کے آگے عرش کی سربلندی جھکی ہوئی اور ہفت کشور کے تاج وتخت ان کے قدموں پر قربان ہونے کیلئے بیتاب رہتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس کائنات ہست وبود میں صرف انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کائنات رنگ وبو میں خلیفۃ اللہ ہونے کا رتبہ بھی حضرت انسان کو ہی عطا ہوا ہے۔ خلافت الٰہی وہ عظیم وبرتر اعزاز ہے کہ انسان کیلئے اس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان اس عظیم اعزاز ورتبہ کا اہل وسزاوار کس صلاحیت واستعداد کی بناپر قرار پایا ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جس کے گرد انسان کے کمال وزوال، عروج ونزول کی تاریخ گھومتی نظر آتی ہے اور یہی وہ سربستہ راز ہے جس پر اللہ تعالیٰ سے قرب وبعد، اس کی اطاعت یا اس کی سرکشی جیسے امور موقوف ہیں۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت، آسمانی کتابوں کا نزول، حقانی علماء کی تبلیغی واشاعتی سرگرمیاں اور پندوموعظت سے متعلق ان کی مساعی جمیلہ بھی اسی استعداد وصلاحیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس استعداد وصلاحیت کو برائے کار لانا اور مذکورہ صلاحیت کو اپنی فلاح ونجات کیلئے کام میں لانا، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ صراط مستقیم پر چلنا اور قائم رہنا پیدائش انسانی کی اصل غرض وغایت ہے اور اس استعداد وصلاحیت کو ربانی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنا ہی اصل نصب العین ہے۔ لیکن خداداد صلاحیتوں کو اس کی رضا کے کاموں میں لگانا اور اس پر استقامت، رب تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے ہی ہوسکتی ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔

''الانسان فی القرآن'' میں انہی مذکورہ امور کو قرآن حکیم کی روشنی میں نہایت شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے اور روح کی تخلیق سے لے کر ابدالآباد تک انسان کے حالات وکوائف نہایت جامع ومدلل انداز میں سپرد قلم کئے گئے ہیں۔

اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ دین اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک اعتقادیات دوسرے اعمال۔ اول الذکر حصہ مؤخر الذکر حصہ کیلئے بنیاد اور مبداء کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر معاذ اللہ اعتقاد درست نہ ہو بلکہ اس

میں خلل اور نقص ہو اور فرقہ ناجیہ اہل السنۃ والجماعۃ کے اعتقادیات صائبہ کے خلاف ہو تو اعمال صالحہ بے معنی ہو جاتے ہیں اور وہ ثمرات ونتائج جو اعمال خیر سے متوقع ہیں حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اعتقاد کی درستی وصحت تمام فرائض سے اولین فریضہ ہے۔ اس میں ادنیٰ سی کوتاہی ولا پروائی خسران وحرمان ابدی کا باعث ہے۔ زیر نظر کتاب ''الانسان فی القرآن'' میں صحت اعتقاد پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے اور ان تمام اعتقادی خطوط کو واضح واجاگر کیا گیا ہے جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے انسان کیلئے چلنا اور مستقیم رہنا ضروری ہے۔ موجودہ دورِ پرفتن میں اعتقادی بگاڑ کی جو ہلاکت انگیز آندھیاں اٹھ رہی ہیں اور عوام کالانعام جس تیز رفتاری سے فساد عقائد کا شکار ہو رہے ہیں اور گمراہی وضلالت کو اپنا رہے ہیں اس کتاب میں ان فتنوں سے بچاؤ کی تدابیر اور اس سلسلے میں لاحق ہونے والی غلط فہمیوں کی جڑوں کی مؤثر انداز میں پوری طرح بیخ کنی کی گئی ہے اور غلط استدلالات کی سوفسطائیت کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

کسی کتاب کے معیاری ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے موضوع ومقصد میں جامع اور مکمل ہو اور اِدھر اُدھر کی غیر متعلق باتوں سے محفوظ ہو۔ نیز طرز استدلال سنجیدہ، دل نشین اور لاجواب ہو۔ یہ خصوصیت بھی حضور قدس سرہٗ کی اس مبارک تصنیف میں علیٰ وجہ الاتم موجود ہے جس کا صحیح ادراک اہل علم کو ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب کی جامعیت کا اندازہ اس کے مضامین سے لگایا جاتا ہے۔ کتاب چار ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ باب اول عالم ارواح، باب دوم عالم شہود، باب سوم عالم برزخ اور باب چہارم عالم عقبیٰ۔

باب اول میں روح وماقبل روح کے حالات درج ہیں۔ اس باب میں زنادقہ اور فرقہ حلولیہ وغیرہ کا رد کیا گیا ہے جو روح کو عین خدا اور قدیم مانتے ہیں۔ چنانچہ فرقہ حلولیہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حدوث وقدم کو نہیں پہچانتے اور قدم سے حدوث کو نہیں جانتے جو شخص قدیم وحادث میں فرق نہیں جانتا وہ اپنی گفتار میں جاہل ہوتا ہے اور وہ حلولیوں کا مذہب ہے جو سراسر باطل اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔''

اوراس فرقہ حلولیہ کی غلطی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایسے شخص کی نظر میں عالم امر کا مشاہدہ بلاحجاب ہوتا ہے اور مذکورہ بالا باقی عالموں کے حجاب سے خلاصی پانے والا۔اس کی نظر میں تمام حرکات وسکنات روح سے تعبیر ہوتی ہیں، بلکہ اس کے مشاہدہ میں غیر نہیں رہتا۔تب وہ ''ہمہ اوست'' کا نعرہ بلند کرتا ہے اور یہی ان کی غلطی کا اصل ہے۔''

روح کے مخلوق ہونے کے متعلق صاف الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''پس اس عبارت سے یہ مقصود حاصل ہوا کہ یہ مدارج ومنازل انسان کی حالت کے رو سے ہویدا ہیں اوران دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روح جو ایک مقام کی حیثیت سے انسان کا نام ہے سراسر مخلوق ہے۔''

باب دوم میں عالم شہود کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل ابحاث پر تبصرہ کیا گیا ہے: ابتدائے آفرینش، تخلیق انسان، معیت روح، معرفت الٰہی، معیت خداوندی، نسبت انسان، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم، اطاعت واتباع وغیرہ۔

تیسرے باب میں عالم برزخ کے حالات، تقدیر انسان، قضا وقدر، ولایت، کرامت اور استدارج اور علم غیب وغیرہ عمدہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

چوتھے باب میں یوم آخرت میں پیش آنے والے واقعات، کشف ساق کا معنی، نامہ اعمال کی کیفیت، لواء الحمد، صراط اور دوزخ وجنت سے متعلق تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخر کتاب میں ایک ضمیمہ لگایا گیا ہے جس میں الٰہیات کے اہم ترین مطالب ومقاصد مثلاً توحید فی الذات، توحید فی السر، توحید فی الخلق، توحید میں تعلیم، توحید پر عمل اور اعتقاد فی التوحید جیسے بنیادی واصولی مسائل سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ نیز امکان کذب کا رد، خلف وعید کا رد، امتناع نظیر اور ''انسان ازلی سعید ہے۔'' کے عنوانات پر نہایت مفید باتیں درج ہیں۔ الغرض اس کتاب میں قبل روح سے لے کر دخول جنت اور دوزخ تک بلکہ ابدالآباد تک انسان کے حالات ومقامات قرآن حکیم کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کتاب میں علم تصوف وسلوک کے بنیادی قواعد واصول بیان کئے گئے ہیں۔جس طرح عقائد کے اندر بیسیوں گمراہ فرقے بن چکے ہیں اور ہر فرقہ اپنی ہی حقانیت کا مدعی بنا ہوا ہے۔ٹھیک اسی طرح تصوف وسلوک اور معرفت وفقر کے نام پر بے علم صوفیوں اور خلاف شریعت پیروں نے عوام کو اپنی خواہشات نفسانی کا شکار بنا رکھا ہے اور اپنے عمل وکردار سے شریعت حقہ کے خلاف نفرت وحقارت کی زبردست مہم شروع کر رکھی ہے۔ اور لوگ بری طرح اس فتنہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔حضور قدس سرہٗ نے ''الانسان فی القرآن'' میں تصوف وفقر کے نام پر اٹھنے والے فتنوں سے حفاظت کے لئے سلوک وعرفان کے قواعد واصول بیان فرمائے۔اتباع شریعت اور پیروی سنت پر زور دیا ہے۔مخالفت شرع کے خطرناک نتائج سے آگاہ فرمایا ہے اور اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کوشش وسعی کیلئے جو ایک قسم کا اختیار دیا ہے اس میں انسان کو شتر بے مہار کی طرح ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنے آپ کو حدود شرع کا پابند رکھنا ضروری ہے۔چنانچہ حضور قدس سرہٗ اس بات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لیکن سعی کئی وجہ پر ہے۔تو مطابق فرمان لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی کے، جدھر انسان سعی کرتا ہے، ذات پاک اس کو ادھر ہی چلنے دیتی ہے اور نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی کی سنت کے مطابق ادھر ہی چلاتی ہے۔انہی جائز (راستوں) میں سے ایک کج راہ قبولیت خلق ہے جس کو بزرگان دین نے لوہے کے زنار سے تعبیر فرمایا ہے۔یہ بہت بڑا حجاب ہے بلکہ شیطانی تصرف کا آلہ اور بہت بڑی گمراہی کا سبب، نفس امارہ کا سرمایہ، نہ ٹلنے والی بلا اور شہد میں ملی ہوئی زہر ہے، جو اخلاص کی زندگی کو ہلاک کر دینے والی اور اعمال صالحہ کو مثل خس وخاشاک کے جلا دینے والی ہے۔''

اس دور کے علماء ومشائخ، پیران عظام قبولیت خلق کے چکر میں مبتلا نظر آتے ہیں، الا ماشاء اللہ! لیکن بزرگانِ دین کے نزدیک قبولیت خلق کی آرزو رکھنے سے بڑھ کر کوئی اور تباہ کن فتنہ نہیں۔یہ ایسی ضرر رساں چیز ہے کہ اس سے انسان کا اخلاص غارت اور اعمال صالحہ تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں۔انسان ابلیس کا آلہ کار بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے۔ضلالت وگمراہی اس کا محاصرہ کر لیتی ہے۔نفس امارہ کو مسرت وشادمانی کا موقع مل جاتا ہے۔قبولیت خلق کا احساس دین وایمان کیلئے آفت اور شہد میں ملی

ہوئی زہر ہے۔ چنانچہ اسی چیز کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

''ہیہات! آج کل تو معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ عمل صالح تو درکنار، علم کے حصول میں نیت ہی درست نہیں ہوتی۔ عالم اور مناظر اور مباحث بننے، فخر و تکبر کی دستار باندھنے، حصول دنیا کا ذریعہ بنانے کیلئے عمر ضائع کر بیٹھتے ہیں اور فقط اسی یافت و یاب کو معراج کمال سمجھ لیتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ اسی پر بس نہیں ہے۔ (بلکہ) اولیاء اللہ رحمہم اللہ اجمعین اور انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو بھی اسی پر قیاس کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو ان سے زیادہ اکمل جانتے ہیں اور اپنے زعمی (خیالی) مراتب کی وجہ سے جہالت کے دریا میں ایسے مستغرق ہوئے ہیں کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ سے سر نکالنا ناممکن ہو گیا ہے۔ الامان!''

لوگوں کے غلط اور من گھڑت معیار ولایت پر تنقید کرتے ہوئے ''شیطانی فریب'' کے عنوان کے تحت ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

''لیکن آج تو صرف شریعت کی پابندی اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل ہی اعلیٰ درجہ کی ملامت ہے۔ مخلصوں کیلئے یہ وقت نایاب اور قیمتی ہے۔ کیونکہ آج کل معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ عوام شریعت کے خلاف چلنے والوں کو ولی سمجھتے ہیں اور پابند شریعت کو حقیر خیال کرتے ہیں اور فرمان ایزدی ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (یعنی غیر اسلامی طریقہ عند اللہ مردود و نامقبول ہے اور ایسے راستے کو اپنانے والا آخرت میں خسارہ اور نقصان اٹھائے گا۔)''

میرے حضرت قدس سرہٗ (حضرت اعلیٰ میاں شیر محمد صاحب قدس سرہٗ) فرمایا کرتے تھے کہ ''یکے فقر رحمانی و یکے شیطانی۔'' سبحان اللہ! کیا ہی لطیف اور پر حقیقت ارشاد مبارک ہے۔''

ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہیہات! آج عوام الناس کے نزدیک جو کوئی اسلام کے برخلاف راستہ اختیار کرے اور ایمان کے احکام کو فنا کرے وہ ولی ہوتا ہے لیکن عند اللہ و عند الرسول ایسا شخص شیطان ہے۔''

حسب الحکم یہ چند سطور ہدیہ قارئین کرام کردی گئی ہیں۔ کتاب کے مضامین سے متعارف کرانے کیلئے کتاب میں قائم کردہ عنوانات کی اجمالی فہرست بھی پیش کردی ہے۔ کتاب کی جامعیت وافادیت کے متعلق بھی کچھ عرض کردیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ الامر فوق الادب کے تحت ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ چند شکستہ حروف کتاب کی عظمت وجلالت شان کے اظہار کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''۔ ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کے مطابق ارباب علم ودانش خود اندازہ کرلیں گے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زندقہ والحاد کے دور میں اس طرح کی کتابوں کی اشاعت عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ لوگوں کے قلوب علم وعرفان کی صحیح روشنی سے منور ومعمور ہوں اور انہیں تزکیہ نفوس اور تزکیہ قلوب کیلئے صالح غذا نصیب ہوسکے۔ اور جہل وکج روی کے راستوں سے نجات پاسکیں۔ آخر میں دعا ہے کہ مولیٰ کریم اس ناچیز اور حضور قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے تمام خدام ومتوسلین کے سینے حضور قدس سرہٗ کی خالص نسبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتسلیم کی سنت مبارکہ اور آپ کے دین اسلام پر خاتمہ نصیب فرمائے اور آخرت میں صالحین کے زمرے میں حشر فرمائے۔ آمین ثم آمین

راقم الحروف

محمد سعید احمد نقشبندی مجددی

سابق خطیب جامع مسجد حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

تمام تعریف اس ذات پاک کیلئے ہے جس نے اپنی الوہیت وربوبیت کے اظہار کیلئے انبیاء کرام علیہم السلام سے ابتدا فرمائی اوران کوعلم لدن سے عالم فرما کر انسان کی رہنمائی کا سبب بنایا۔اس سلسلہ کا آغاز حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کرکے ایک لاکھ چوبیس ہزار کا شجر رسالت یکے بعد دیگرے حسب ضرورت علم وکتاب اور معجزات سے بہرہ ور فرما کر ہماری رہنمائی کے لئے مرسل کیا اور اختتام نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوا،اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین کا لقب عطا فرما کر سلسلہ نبوت کو تکمیل تک اور شجر رسالت کو ثمر تک پہنچا دیا۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی،اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ولایت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آغاز ہوا اور عنایت الٰہی سے قیامت تک یہ سلسلہ قائم ودائم رہے گا۔چنانچہ اس دور ظلمات میں بھی ایسے بزرگان دین پیدا فرمائے جنہوں نے حسب ضرورت ظاہری وباطنی تعلیم سے گم گشتگان راہ کیلئے مشعل ہدایت ورشد روشن فرمائی اور آج جبکہ تفرقہ بازی اور کفر و الحاد اپنے شباب پر ہے، ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت مبارک میں بمصداق:

"اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ۝ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّہَا وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ۝ [ابراھیم: ۲۴،۲۵]

ترجمہ: "کیا نہیں دیکھا تو نے کہ کس طرح بیان فرمائی اللہ تعالیٰ نے مثال کلمہ طیبہ کی، مانند درخت پاکیزہ کے، جڑ اس کی مضبوط ہے اور شاخیں اس کی آسمان میں، دیتا ہے وہ میوہ اپنا ہر وقت اپنے رب کے اذن سے اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں واسطے لوگوں کے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

نسبت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معمور ہو کر علم معرفت کے بیش بہا کلمات طیبہ اور عالم موجودات سے لے

کر عالم معروفات تک کے مدارج کو بِاِذْنِ رَبِّھَا کے مطابق آگاہ فرما کر تُؤْتِیْ اُکُلُھَا کے ثمر رسالت سے حصہ عطا فرما کر مشکور فرمایا اور دین الحق سے ہر طرح خبردار کیا۔

یہ کتاب کن حالات میں تیار ہوئی؟ احباب حلقہ ارادت تو اس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ صرف ناواقف حضرات کی آگاہی کیلئے مختصر عرض کرتا ہوں کہ دراصل یہ کتاب حضور رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات متبرکہ، ملفوظات مقدسہ اور مکتوبات مطہرہ کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں بعض احباب کے استفسارات کے جواب میں صفحہ قرطاس پر شہود میں آئے اور جناب محترم حضرت سید منیر حسین شاہ صاحب تبرکاً ان کو قلمبند کر کے یہ نقلیں اپنے پاس جمع کرتے رہے۔

شروع شروع میں مضامین کو کتابی شکل میں لانے کا حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کو خیال نہ تھا۔ لیکن احباب ارادت کے اصرار پر آپ کچھ رضامند ہوئے۔ تاہم فرماتے کہ چونکہ ان مضامین کو کسی مستقل کتاب کے عنوان کے ماتحت تحریر نہیں کیا گیا اور نہ ہی مجھے یہ خیال تھا۔ دوسرے میری زبان بھی کچھ پرانی قسم کی ہے، لہٰذا کتابی شکل میں لانے کیلئے ان کو دوبارہ تحریر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کانٹ چھانٹ کر کے ان کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے اور تکرار وغیرہ ہٹا دیئے جائیں۔ نیز عبارت کی قدامت کو بھی نئے اور شستہ الفاظ سے مزین کیا جائے۔ مگر قضا وقدر کے ارادہ ازلی میں ایسا ہی مرقوم ومنظور تھا کہ آپ وجع المفاصل کی قسم کے دردوں سے صاحب فراش ہو گئے اور یہ ارادہ ملتوی ہو گیا۔ بلکہ جب کبھی برادران طریقت ان کی طباعت کے متعلق اظہار خیال کرتے تو جواباً یہی فرماتے کہ ان مضامین کو نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا۔ مولیٰ کریم کو منظور ہوا تو ہو جائے گا ورنہ خیر۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔''

کچھ عرصہ کے بعد آپ نے اس عاجز کے استفسار پر اتنا فرمایا کہ ''اچھا! تم خود ہی (محترم) سید منیر حسین شاہ صاحب کی معیت میں ان کی نظر ثانی کر کے ان کو مربوط اور مسلسل کر لو۔ لیکن مجھ میں تو ان مضامین کو کما حقہ، سمجھنے کی بھی اہلیت نہ تھی، چہ جائیکہ ان میں کسی قسم کی قطع وبرید کرتا۔ بالآخر آپ نے اس مسلسل تکلیف کے دوران میں صرف اتنا کیا کہ ایک دو مضامین کو سن کر چند ایک فقروں کو منسوخ کر کے چند ایک کا ایزاد فرما دیا اور اس مجموعہ کا نام ''الانسان فی القرآن'' تجویز فرمایا۔ کچھ مضامین کی ترتیب بھی سمجھا دی اور کتاب کی اجازت بھی دے دی۔

آپ کے اس اچانک اجازت دینے سے مجھے خوشی بھی ہوئی لیکن یقین جانئے کہ دل میں ایک دھڑکن بھی شروع ہو گئی کہ یہ اجازت بلاوجہ نہیں۔ شاید کہیں کتاب کی تیاری کے بعد ہمیں رشد وعرفان کے اس آفتاب سے

حجاب نہ ہو جائے! لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ قدرت کتابت کی بھی مہلت نہ دے گی۔ مسطر وغیرہ کی تیاری میں مزید دو مہینے گزر گئے اور ابھی کم وبیش پچاس صفحات تک ہی کتابت پہنچی تھی کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے واصل ہوگئے۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

بالآخر آپ کے جانشین حضرت صاحبزادہ سید محمد باقر علی شاہ صاحب مدفیوضہم کے ایما سے کتابت کو جاری رکھا گیا، اور علاوہ کسی تحریری سہو کے تمام مضامین کو بغیر کسی ردوبدل کے من وعن لکھ دیا گیا ہے اور آپ کے الفاظ کو متبرک جانتے ہوئے اس حد تک پابندی کی گئی ہے کہ حتی الامکان عنوان بھی آپ کی عبارت ہی کے الفاظ سے اخذ کئے گئے ہیں اور مضمون کے تسلسل کو بھی نہیں توڑا گیا ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر ایک عام ناظر اور قارئین کرام کو اس کتاب میں کئی مقامات پر تکرار نظر آئے گی اور پڑھتے پڑھتے قاری یہ محسوس کرے گا کہ یہ چیز پہلے بھی بیان ہو چکی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک طرح سے قرآن حکیم ہی کی اقتدا ہے، تاکہ ہر ایک مضمون اپنی سالمیت میں دوسرے مضامین کے احتیاج سے بے نیاز ہو۔

کتاب کا نفس مضمون تو میرے کسی تبصرے کا محتاج نہیں اور نہ ہی مجھ ایسے کم علم میں یہ اہلیت ہو سکتی ہے کہ ایک کامل عارف باللہ کی تحریر پر اس سے بڑھ کر کوئی مزید روشنی ڈال سکوں۔ کتاب اپنی تعریف خود اور اپنی نوعیت میں اپنی مثال آپ ہے اور ہر پڑھنے والا اپنی علمی وسعت کے مطابق مستفید ہوگا۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے انسان کی ابتداء سے انتہا تک کے مقامات جسمانی اور مدارج روحانی اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرح وبسط کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں، جو مقام اسرار، عالم ارواح اور اس کے علم، میدان دنیا اور اس کی حقیقت، عالم برزخ اور اس کی کیفیات، یوم القیامۃ اور اس کے حالات اور دوزخ وجنت تک کے مقامات پر مشتمل ہیں۔ گویا فرمان الٰہی كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ [البقرۃ: ۲۸] (یعنی تم مردہ تھے پس تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف پھیرے جاؤ گے) کی تفسیر اور انسان کے اس حقیقی اور مسلسل سفر کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

اعتقاد کے میدان میں توحید ورسالت، ایمان واسلام، قضاوقدر، علم غیب، علم الانسان وعلم الرحمٰن اور امکان کذب وخلف وعید وغیرہم پر وہ حقیقت پرور اور بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے ہر وہ مسلمان جو اس دور فتن میں راہ راست سے بھٹک رہا ہو۔ صراط مستقیم پر آسانی سے چل سکتا ہے۔ صرف عصبیت سے دور رہ کر جستجوئے حق شرط ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، حضور رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مضامین کو قرآن حکیم کے استدلال سے ثابت کیا ہے۔ آپ فرمایا کرتے کہ ''میں نے سوائے کلام پاک کے کبھی کوئی کتاب مطالعہ نہیں کی۔ البتہ ابتدائی ایام میں صرف کشف المحجوب دیکھی تھی۔'' اور جو چند ایک احادیث ضمناً بیان ہوئی ہیں، مسودات میں صرف یہ لکھا ہوتا ہے کہ ''یہاں پر فلاں حدیث شریف یا فلاں حوالہ دیکھ کر درج کر لیا جائے۔'' گویا یہ جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا صرف علم لدن سے عطائے الٰہی ہے جو آپ کے قول ''عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔'' کی تائید ہے۔

آپ کی درسی تعلیم صرف پانچویں چھٹی جماعت تک محدود تھی، جیسا کہ آپ کی سوانح حیات ''انشراح الصدور بتذکرۃ النور'' میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ آپ کی تحریر اتنی بلند ہے کہ سوائے پورے عالم کے (جس کو عربی زبان اور دینی کتابوں پر پورا عبور ہو) آپ کے بیان کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ آپ اپنے کلام میں قرآن مجید کی آیات کو اس خوبی سے سمو لیتے ہیں جس سے عالم ہی محظوظ ہو سکتا ہے اور عربی یا قرآن حکیم سے ناواقف مفہوم سے قطعاً نا آشنا رہتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس دوسرے ایڈیشن میں ایسی آیات کا ترجمہ نیچے حواشی کی شکل میں درج کر دیا ہے۔ گو اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے پوری آیت بلکہ سیاق وسباق کے پورے مضمون کا جاننا ضروری ہے۔ تاہم ترجمہ کی افادیت مسلمہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ایسی آیات کا ترجمہ درج نہیں تھا۔

محمد یوسف خوشنویس کان اللہ لہ

حضرت کیلیانوالہ شریف

ضلع گوجرانوالہ

۱۴ اپریل ۱۹۶۷ء، ۳ محرم الحرام ۱۳۸۷ھ

چوتھا ایڈیشن

اللہ تبارک وتعالیٰ واجب الوجود مطلق وبسیط وبے حد جل جلالہ جب کسی بندے پر مہربانی فرماتا ہے تو اسے اپنے محبوب دوستوں کی خدمت کا اعزاز عطا فرماتا ہے، بندہ ناچیز محمد شفیق اپنے آپ کو ان خوش نصیب لوگوں میں سمجھتا ہے جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی مہربانی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تصدق سے اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے، بندہ ناچیز حقیر اپنے لئے اس نگاہ کرم کو سرمایہ دنیا وآخرت سمجھتا ہے جو بندہ کے ہادی ورہنما شیخ حقانی مرشد کامل پیر طریقت رہبر شریعت سرتاج اولیاء، زبدۃ الاصفیا قبلہ عالم حضرت پیر سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری نقشبندی مجددی قدس سرہٗ سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف نے فرمائی کہ تصوف وطریقت اور حقیقت ومعرفت کے رموز سے بھرپور خزانہ اور عظیم نسخہ، ''الانسان فی القرآن'' کے تیسرے ایڈیشن کو ۱۴۲۲ ہجری میں شائع کرنے کے لیے حکم فرمایا، حضور قیوم العالم میرے شیخ کامل سیدی وآقائی حضرت الحاج پیر سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا 20 جون 2014ء کو ظاہری وصال مبارک ہوگیا لیکن آپ کی پرنور تربت اقدس سے فیضان کا چشمہ اور حضور قدس سرہٗ کے لخت جگر قطب عالم حضور سیدی وآقائی، آپ کے حقیقی جانشین وسجادہ نشین حضور چن جی سرکار کی صورت میں باطنی وظاہری فیضان کا سلسلہ جاری وساری ہے اور انشاء اللہ سدا جاری رہے گا۔ الحمدللہ! حضور سیدی وسندی جانِ بہارِ نقشبندیت، پروردۂ آغوش ولایت، عالمی مبلغ اسلام، ترجمان مسلک مجدد الف ثانی، قاسمِ فیوض اعلیٰ حضرت شیر ربانی وحضور پیر کیلانی حضرت قبلہ عالم پیر سید محمد عظمت علی شاہ صاحب بخاری سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف کے حکم وخصوصی اجازت سے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کی سعادت بھی بندۂ ناچیز کو حاصل ہو رہی ہے۔ مزید اعزاز اور خوشی اس امر کی ہے کہ

پروردہ آغوش ولایت جامع معقول ومنقول پیرطریقت رہبرشریعت فخرالمشائخ ابوالحسنین حضرت الحاج پیرسید محمد عظمت علی شاہ صاحب بخاری دامت برکاتہم عالیہ کی کتابت وطباعت کے تمام مراحل میں ذاتی نگرانی وخصوصی توجہ سے بندہ ناچیز اس عظیم کام کوسرانجام دینے کے قابل ہوا ہے۔

موجودہ چوتھے ایڈیشن سن طباعت نومبر 2016ء کیلئے کتاب کی مکمل دوبارہ کمپیوٹر کمپوزنگ کی گئی ہے تیسرے ایڈیشن میں آیات مبارکہ پراعراب نہیں تھے، اعراب تمام آیات پر لگادیئے گئے ہیں۔سورت کا نام اورآیت نمبرلکھا گیا ہے، فارسی اشعار کا ترجمہ بھی حاشیہ میں کردیا گیا ہے۔حتی الوسع مغلق، ادق اورمشکل ومتروک الفاظ کا ترجمہ بھی توسین یا حاشیہ میں کردیا گیا ہے۔

کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں حتی الامکان انسانی طاقت کے مطابق کوشش کی گئی ہے کہ کوئی غلطی نہ ہو، تاہم صحت اوردرستگی کے اہتمام کے باوجود کتاب میں لفظی غلطی ممکن ہے، لہٰذا قارئین کرام سے التماس ہے کہ نگاہ محبت سے اس عظیم کتاب ''الانسان فی القرآن'' کے مطالعہ کے دوران جہاں کہیں غلطی ملاحظہ فرمائیں تو بندہ ناچیز محمد شفیق کیلانیکو مطلع فرماکر احسان عظیم فرمائیں۔

خاکپائے دربار عالیہ
محمد شفیق عفی عنہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِO

حضور رحمۃ اللہ علیہ کے

مختصر سوانح حیات

آباؤاجداد:

حضرت شاہ جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت کیلیانوالہ شریف میں یہ مشہور ہے کہ یہ دو بھائی تھے جو شرقپور شریف ضلع شیخوپورہ سے حضرت کیلیانوالہ شریف میں حضرت عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے جو اس وقت کے بزرگان عظام میں سے تھے اور ان سے بیعت کر کے سلسلہ طریقت میں منسلک ہوئے، حضرت عبدالسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سیدزادوں کا نکاح اپنی صاحبزادیوں سے کر دیا، اب حضرت کیلیانوالہ شریف اور بعض دوسرے اضلاع میں یہ خاندان سادات آباد ہے۔

حضرت شاہ جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں، آپ قادری چشتی، خاندان حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت نوشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قلمی کتب موجود ہیں جن میں آپ نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ میرے وقت میں حضرت شیخ احمد سرہندی اور حضرت شاہ جی صاحب بڑے بلند پایہ بزرگ ہیں۔

والدین:

حضور رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد سید غلام علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دو بھائی تھے، ایک حافظ غلام مصطفٰی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے آپ، حضور رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت اللہ بخش صاحب تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق باطنی رکھتے تھے اور بڑے دیندار بزرگ تھے، آپ موضوع احمد نگر تحصیل وزیر آباد میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور عمر کا بڑا حصہ وہیں گزرا، حضور کی والدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا کا سلسلہ طریقت بیعت حضرت سید فضل شاہ صاحب سے تھا جن کا سلسلہ طریقت ایک دو واسطوں سے حضرت حاجی حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکان شریف والوں سے ملتا ہے، خدا کے فضل سے جو بات منہ سے نکلتی تھی پوری ہو کر

رہتی تھی، حضور رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم کو آپ بہت دعائیں دیا کرتی تھی کہ مولیٰ کریم تم کو عرش بریں پر رنگ لگائیں گے لیکن میں نہیں دیکھ سکوگی، چنانچہ آپ کا یہ فرمان بالکل درست ہو کر رہا، حضور کے والدین کے مزارات حضرت کیلیانوالہ شریف میں ہیں۔

قبل از پیدائش:

حضور رحمۃ اللہ علیہ کے برادر اکبر سید حسین شاہ صاحب جب دس گیارہ برس کے ہوئے تو سید قربان علی شاہ صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور سائیں صاحب آپ سے والہانہ محبت کرتے تھے، ایک دن حضور رحمۃ اللہ علیہ کے والدین نے سید حسین شاہ صاحب کو فرمایا کہ سائیں صاحب سے دعا کراؤ کہ مولیٰ کریم تمہیں ایک بھائی عطا فرمائے، چنانچہ سائیں صاحب سے دعا کی درخواست کی گئی، آپ نے فرمایا کہ بچے نو ماہ کے پیدا ہوتے ہیں، تیرا بھائی سات ماہ کا پیدا ہوگا اور صرف بالشت بھر ہوگا، لیکن جوان ہو کر قد و قامت میں تم سے بڑا ہوگا اور یہ بھی فرمایا کہ دنیا کے کاموں میں وہ آپ کے کام نہ آئیں گے، چنانچہ فقیر صاحب کی دعا سے سات ماہ کے بعد حضور رحمۃ اللہ علیہ نے اس عالم شہود پر ظہور فرمایا اور واقع ہی بالشت بھر قد و قامت کے تھے، دوسری پیش گوئیاں بھی حرف بحرف درست ثابت ہوئیں، یعنی کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ اپنے برادر اکبر سے جسیم تھے اور دنیوی کاروبار میں بھی ان کے کام نہ آئے۔

آپ کا اسم مبارک بھی قربان علی شاہ صاحب کے فرمان کے مطابق نور الحسنؒ رکھا گیا۔

ولادت باسعادت:

حضور رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کے بیاض شریف میں حضور رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ ولادت بدیں الفاظ مرقوم ہے:

بوقت شب کہ از شب یک نیم پاس باقی بود، بروز چہار شنبہ یعنی شب چہارم شنبہ برخوردار سعادت اطوار نور الحسن متولد شد ''۲۷ جمادی الاول ۱۳۰۶ ہجری'' مطابق ۳۰ جنوری ۱۸۸۹ء موافق ۱۹ ماگھ ۱۹۴۵ بکرمی۔

راقم سید غلام علی شاہ اول مدرس احمد نگر چٹھہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ۔

شجرہ نسب:

حضور رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان صحیح النسب سید بخاری ہے، ذیل میں کا شجرہ نسب درج کیا جاتا ہے۔

حضرت سید نورالحسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بن سید غلام علی شاہ سید حیات شاہ بن سید عالم شاہ بن سید سکندر شاہ بن سید عتیق اللہ شاہ بن سید جعفر بن سید جمال بن سید محمد بن سید محسن بن سید عبدالرشید بن سید نصر اللہ بن سید محمد بن سید عبدالوہاب بن سید اللہ داد بن سید احمد بن سید جمال الدین بن سید سلیمان بن سید یونس بن سید صالح الصوت سہروردی سفید فیل مست بن سید صلاح الدین سہروردی دہلوی سفید فیل مست بن سید احمد شیر شکن بن سید محمد بن میر سید عین الملک بن میر زین العابدین ثانی بن سید مودود بن سید عبدالعزیز بن سید داؤد بن سید ابوطاہر بن سید جمال الدین بن سید عبدالحمید بن سید ابوالحسن بن حامد بن میر حمزہ بن سید محمد بن سید طاہر ربانی بن شہزادہ جعفر ثانی بن امام علی ہادی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن ابوجعفر امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدٍوَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

صغرسنی میں ایک کامل سے توجہ کی درخواست:

حضور رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا کے مرشد حضرت سید فضل شاہ صاحب احمد نگر میں تشریف لائے تو والدہ صاحبہ نے عرض کیا کہ شاہ صاحب یعنی سید غلام علی شاہ صاحب بوڑھے ہو گئے ہیں، اور سید حسین شاہ صاحب میٹرک کا امتحان دے آئے ہیں، دعا فرمائیں کہ وہ پاس ہو جائیں اور کوئی ملازمت مل جائے، ہم کوئی تین چار سال کی عمر میں قریب ہی کھیل رہے تھے، اچانک خیال آیا اور سائیں صاحب کے پاس آ کر کہا کہ ''سائیں جی! میرے دل بھی دھیان کریا جے'' سائیں صاحب یہ سن کر جذب میں آ گئے، ہم کو سینے سے لگا لیا اور فرمانے لگے ''تیرے دل سوہنیاں پہلوں، اوتیرے دل سوہنیاں پہلوں، اونور تو ہویوں جونور'' حضورؒ فرماتے تھے کہ اس کے بعد کچھ دن مجھے اچھی طرح ہوش وحواس نہ رہے اور دنیا کے حالات مجھے دکھائی دیتے تھے۔

حضرت اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حضور شرقپور شریف میں اولین شرف ملاقات:

حضور رحمۃ اللہ علیہ اپنے برادر اکبر سید حسین شاہ صاحب کی معیت میں تبادلہ اراضی کے لیے شرقپور شریف تشریف لے گئے۔ حضرت اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حضور کو سامنے کرتے سے پکڑ لیا اور سید حسین شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کہ ان کا نام کیا ہے؟ شاہ صاحب نے عرض کیا نور الحسن۔ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نور بنا دوں؟ حضور فرمایا کرتے کہ میں کبھی کسی افسر بالا سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ لیکن حضرت اعلیٰ کا اس قدر رعب چھایا کہ میں بول نہ سکا۔ حضرت اعلیٰ صاحب نے دل پر ٹھیس لگا کر فرمایا کہ مربعوں کے تبادلے کی اتنی بڑی ضرورت نہیں اگر چاہو تو ہم تمہاری قسمت کا تبادلہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضور رحمۃ اللہ علیہ اجازت لے کر واپس چک نمبر ۱۴ میں تشریف لے آئے۔

دوسری حاضری اور شرف بیعت:

کچھ دنوں کے بعد حضور رحمۃ اللہ علیہ سائیں اللہ داد ساکن برج تاشہ کی معیت میں حضرت اعلیٰ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ محمد شفیع والی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی آپ نے آپ کے دست مبارک کو اپنے دست مبارک میں لے کر سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تلاوت فرمائیں اور فرمایا تم کو بتانا کیا ہے، کبھی کبھی آ کر ہو جایا کرو۔ اس کے بعد حضور رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیکیداری کا کام چھوڑ دیا اور آنا جانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس قدر رابطہ بڑھا کہ جس وقت حضرت اعلیٰ کو خیال مبارک آیا اسی وقت دوڑے آئے۔ چار دفعہ کی حاضری کے بعد حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ طریقت کے مطابق کچھ بتانا ہی چاہیے۔ چنانچہ سورۂ اخلاص، درود شریف اور اسم ذات تلقین فرما دیئے۔ کچھ عرصہ حضور رحمۃ اللہ علیہ جمعہ شریف کے دن ہی تشریف لاتے اور نماز جمعہ کے بعد اجازت ہو جانے پر چک نمبر ۱۴ میں تشریف لاتے۔

حضرت اعلیٰ کی خدمت میں قیام:

جوں جوں دن گزرتے گئے، حضور رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت اعلیٰ سے بتدریج رابطہ بڑھتا چلا گیا اور شوق ومحبت الٰہی زیادہ سے زیادہ تر ہوتا گیا، جس کے نتیجہ کے طور پر دنیوی کاروبار سے طبیعت بالکل فارغ ہو گئی

،حتیٰ کہ حضرت اعلیٰ سے ایک لمحہ بھی جدائی گوارا نہ رہی اور آپ نے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر حضرت اعلیٰ صاحبؒ کی خدمت اقدس میں رہنا اختیار کرلیا۔

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی حضور رحمۃ اللہ علیہ کو توجہ:

حضور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک روز ہم حضرت اعلیٰ کی معیت میں باہر گئے ، ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت توجہ دیتے ہیں تو اکثر احباب کو بڑا جوش وخروش پیدا ہوتا ہے لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں ہوا، اگر آپ مجھے بھی ایسی توجہ دیں تو بہتر ہو، اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت نے تیز چلنا شروع کر دیا، ہمیں بھی محسوس ہوگیا کہ یہ تیز روی میرے اس خیال کا نتیجہ ہے ، خدا خیر کرے ، چنانچہ جب بیٹھک شریف میں پہنچے اور حضرت اعلیٰ اوپر تشریف لے گئے تو تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لوہے کی سلاخ تیز بھٹی میں سے انگارہ ہوکر میرے قلب میں داخل ہوگئی ہے، تھوڑی دیر بعد آپ نیچے تشریف لائے اور پھر اوپر چلے گئے ،آپ کی طبیعت مبارک میں جوش سا معلوم ہوتا تھا، پھر جب آپ نیچے تشریف لائے تو میری طرف دیکھا، گو میری طبیعت میں جوش تھا تاہم اظہار بالکل نہ تھا، یہ دیکھ کر آپ خوش ہوئے اور فرمایا ''تم بھی تو کوئی بلا ہو'' پھر مہربانی سے گفتگو شروع کر دی اور میری طبیعت میں سکون آ تا گیا۔

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی ہمارے حضور کو نکاح کی فہمائش:

حضور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب عصر کے بعد حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی آپ فرمایا کرتے کہ ''عزیز کی شادی بھی کرنی ہے۔'' تو ہم اکثر عذر ہی کرتے کہ ''جناب! میں اس قابل نہیں ہوں۔'' آپ خاموش ہو جاتے۔ ایک دن ہمیں خیال آیا کہ اب ڈاڑھی بھی رکھ لی ہے اور عمر بھی تیس سال سے زائد ہوگئی ہے۔ اب مجھے رشتہ کون دے گا؟ میں نے خواہ مخواہ حضرت صاحب کو ناراض کر رکھا ہے۔ اب جس وقت بات ہوئی رضامندی ظاہر کر دی جائے گی۔ چنانچہ پھر ایک روز جب آپ باہر تشریف لے گئے اور شادی کا تذکرہ فرمایا تو میں نے عرض کیا ''جس طرح حضور کی مرضی۔'' آپ سن کر بے حد خوش ہوئے اور حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی مرضی کے مطابق رشتہ ہوگیا۔''

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں حضور کے چند اشعار:

ایک دفعہ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے حضور کو فرمایا کہ شجرہ میں میرا نام درج کرو مگر ہوا ایک شعر میں۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیل ارشاد کا ارادہ کیا تو ایک شعر میں تسلی نہ ہوئی چنانچہ کئی ایک شعر موزوں کیے تاہم حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی تادیبآنہ لا سکے۔ لہٰذا آخر میں معذوری کا اعتراف اور معافی کی خواستگاری ہے۔

افضل واکمل، مکمل، رہنمائے کاملاں ملتجائے بے کساں ہم مژدہ افسردگاں
حامی دین متین و فخر و عزت خواجگاں صاحب درد و فغاں را سر عاشق صادقاں
بے کنارہ بحر عرفاں، پادشاہ عارفاں مظہر جلی سر خفی و سر از سرنہاں!
عاشق و محبوب رب العالمین را بے گماں ہست مخفی از عواماں راز داناں راعیاں!
نقطہ نور احمد از نور احمد مجتبیٰ نور نبی، نور خدا، نور محمد مصطفیٰ
بمعذوری گنہ گارو خطا وار وشرمسارم ہمہ زیں صفت موصوفم ولے بافضل تو نازاں
بدتر از بد نفس مارا تنگ آمد زیں بلا! ادب صدق وصفا بخشید با توفیق اعلیٰ را
اگر خواہم بتو خواہم، نخواہم ماسوائے تو نخواہم در دو عالم جز محبت درد و الفتہا
رحیما رحم کن برما، کریما کرم کن برما!
شہنشاہ سخا یک نظر کن از دید بخششہا

حضور رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ مبارک میں یہی آپ کے اپنے اشعار خود آپ کے مناسب حال ہونے کی بنا پر لکھ دیئے گئے ہیں۔

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حاضری مکان شریف:

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ مکان میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہمراہ قضائے حاجت کیلئے لوٹا پکڑ کر جنگل میں تشریف لے گئے۔ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فراغت کے بعد وضو فرما کر باہر ہی نماز اشراق ادا فرمائی۔ جب آپ نماز ادا کر چکے تو ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ ''حضرت! جب کسی سے محبت ہو تو کیا اس کے نام کا ورد کیا جاتا ہے؟'' حضور رحمۃ اللہ علیہ کا چونکہ

مراحل سلوک میں یہ ابتدائی زمانہ تھا۔اس لئے ایک مبتدی کی زبان مبارک سے یہ بلند پایہ کلمات سن کر حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو بڑا تعجب تو آپ نے دست مبارک سیدھے کر کے ایک لمبا سجدہ کیا۔جب بڑی دیر تک سجدہ سے سر نہ اٹھایا تو حضور رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے آج خلاف معمول اتنا طویل سجدہ کیوں ادا فرمایا ہے؟ تو حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سجدہ سے سر مبارک اٹھا کر فرمایا ''لالیا! میں تو تمہیں ہی دیکھ رہا تھا کہ کہاں تک انتہا ہے۔'' اللہ اکبر! کیا مرتبہ ہے کہ قطب زمان بھی متعجب ہو رہے ہیں۔

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں دوسری حاضری مکان شریف:

ایک دفعہ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ مکان شریف میں ختم شریف میں شمولیت کے لئے تشریف فرما تھے۔گرمی کا موسم تھا۔دوپہر کے وقت حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''کوئی بیلی ڈیرہ بابا نانک جا کر کسی سواری کا انتظام کر آئے۔'' کوئی بیلی نہ اٹھا۔ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ نے حکم کی تعمیل کی۔حضور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''گرمی کی شدت تھی۔ڈیرہ بابا نانک پہنچا تو اس قدر بے قراری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔'' اس وقت حضور رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے چند اشعار نکلے جو تبرکاً درج ذیل ہیں:

ہیں دور گردوں نے رنگ کیا کیا دکھائے مجھ کو رلا رلا کر
ید مقدر بھی تھک گیا ہے گلے کو میرے دبا دبا کر
ادھر کو کھینچا کبھی بلا کر، ادھر کو پھینکا کبھی ہٹا کر
اسی تغیر میں مرمٹے ہم، کلیجہ اپنا جلا جلا کر
جو روز محشر کھلے گا دفتر پڑھے گا ہر اک کتاب اپنی
حشر کرے گا یہ حال برپا عرش کا پایہ ہلا ہلا کر
عزم یہ تھا کہ نہ ہو شکایت، لبوں پہ شکوہ نہ ہوتا لیکن
ہے دودِ دل نے زباں کو میری، ہلایا آخر جلا جلا کر
جو ہجر فرقت میں مرمٹے ہم، امید پر ہیں یہ سانس باقی

ہے انتظاری تو بس حکم کی، یہ مرگِ بستر بچھا بچھا کر
تمنا تیری کیا ہے محزوںؔ کبھی نہ پوچھا یہ دل جلوں سے
جو نیم بسمل تڑپ رہے ہیں حجاب کیوں ہے دکھا دکھا کر

حضرت کیلیانوالہ شریف میں مراجعت:

حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے وصال مبارک سے پہلے ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ کو گاہے بگاہے حضرت کیلیانوالہ شریف روانہ فرماتے تھے لیکن آپ کو ایک لحہ بھی حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے جدائی گوارانہ تھی۔ دوسرے حضور رحمۃ اللہ علیہ اپنے حال میں اس حد تک محو و مسرور تھے کہ رجوع الی الخلق سے آپ کی طبیعت متنفر تھی۔ لیکن بالآخر حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی اطاعت پر مجبور ہو جاتے۔ حضرت اعلیٰ صرف تبلیغ حق کیلئے حضور رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت کیلیانوالہ شریف میں بھیجتے اور آپ اس صبر آزما جدائی کی تاب نہ لا کر پھر حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں پہنچ جاتے۔ جب تک حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال شریف نہ ہو گیا یہ سلسلہ بدستور قائم رہا۔

کرامات:

قبل اس کے عاجز کچھ تحریر کرے، یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بمصداق ''اولیاء را می شناسد اولیاء'' بندگان خدا کو جو نعمت مولیٰ کریم کی طرف سے تفویض ہوتی ہے اس کے متعلق عام آدمی کا اظہار کرنا حقیقت میں کوئی اصل نہیں رکھتا۔ تاہم واقعات اور حالات کے مطابق عوام کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے۔'' کے مطابق کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

بندگانِ خدا کو مولیٰ کریم کی طرف سے وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کے مطابق دو طرح کا انکشاف ہوتا ہے:

نوع اول:

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۹۳ میں بیان فرماتے ہیں کہ نوع اول وہ علوم و معارف الٰہی جل شانہ ہیں جو حق کی ذات و صفات و افعال کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن

کے ساتھ اپنے خاص بندوں کو ممتاز کرتا ہے۔

نوع دوم:

مخلوقات کی صورتوں کا کشف ہونا اور پوشیدہ چیزوں پر اطلاع پانا اوران کی خبر دینا جو اس عالم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔نوع اول اہل حق اور ارباب معرفت کے ساتھ مخصوص ہے اور نوع ثانی محق اور مبطل یعنی سچے اور جھوٹے دونوں کو شامل ہے۔ کیونکہ استدارج والوں کو بھی نوع ثانی حاصل ہے۔

ناظرین کی خدمت میں معروض ہوں کہ جس طرح ہر نبی یا رسول کو من اللہ اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق معجزات عطا فرمائے گئے۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام کے وقت میں جس جس فن کا کمال تھا اسی کے مطابق عوام کی رہنمائی اور مریضانِ قلوب کی شفا کیلئے مناسب نسخے تجویز فرما کر روحانی طور پر علاج فرمایا گیا، اسی طرح اولیاء اللہ جن کے متعلق حدیث نبوی شاہد ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے) اولیائے کرام بھی ہر موقع پر اپنے وقت کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تشریف لائے اور عوام کے قلوب کو جس مرض کا بیمار پایا، مولیٰ کریم نے اپنی رحمت خاص سے ویسے ہی کرامات سے نوازا۔

ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں بد اعتقادی کا زور وشور تھا۔مولیٰ کریم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان مبارک کے مطابق نوع اول (یعنی علوم و معارف الٰہی جل شانہ جو حق کی ذات وصفات اور افعال کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں) سے مستفیض فرما کر ضرورت وقت کو پورا فرمایا۔ باوجودیکہ آپ کو بظاہر تعلیم سے کوئی خاص حصہ نہ تھا۔ مدرسہ میں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اپنے وقت میں سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق کافی تبلیغ فرمائی اور ہزاروں بدعقیدہ آدمی درست ہوئے۔ جمعہ شریف میں بالعموم عقائد اور اپنی حالت کی اصلاح کے متعلق ہی وعظ فرمایا جاتا۔علمائے کرام کی خاصی جماعت بلکہ نامور علماء آپ کے مریدین میں سے اب تک موجود ہیں۔ مدرسہ بھکھی اور سید جلال شاہ صاحب ایسے نامور عالم کا بننا آپ کی توجہ پاک ہی کا نتیجہ ہے، اور یہاں سے تمام علماء خالص اہلسنت بن کر تبلیغ کیلئے ہر سال کافی تعداد میں عوام کو مستفیض فرما رہے ہیں۔ یہ قبلہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اظہر من

لشمس کرامت ہے۔آپ کے وقت میں آپ کے پاس بڑے بڑے علمائے کرام حاضر ہوتے تو آپ بڑی بشاشت سے مولیٰ کریم کی ذات وصفات کے متعلق مسائل پر ایسی مفصل تقریر فرماتے کہ بڑے بڑے علماء متحیر رہ جاتے۔

آپ کی یہ کتاب (الانسان فی القرآن) جس کے متعلق ایک دن حضور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کتاب جلدی تحریر کرانے کا حکم ہوا ہے، انہی مسائل پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اعتقادی مسائل جن میں فی الوقت گمراہ فرقے عوام کے ایمان پر حملہ کرنے کیلئے بے حد کوشاں ہیں۔ مثلاً روح مخلوق ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ، آپ کے علم، تصرف اور بشریت کے متعلق مفصل بحث، امکان کذب وخلف وعید کا رد، قرآن پاک مخلوق ہے یا غیر مخلوق، توحید فی الذات، توحید فی السر، توحید فی الخلق اور مسئلہ تقدیر وغیرہ سب عنوانات پر ایسے انوکھے انداز میں بیان فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ علم لدن کے سوا نہیں، جو محض اکرام من اللہ ہے۔ تمام مسائل کو قرآن پاک کے ٹھوس دلائل سے ثابت فرمایا ہے تاکہ عوام کے ایمان کو شیطانی دھوکوں اور گمراہ علماء کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھا جائے۔

کتاب کے مطالعہ سے صاحب ایمان کو سکون حاصل ہوگا اور انشراح صدر اور افزائش ایمان کا باعث ہوگا۔ گمراہ فرقوں کیلئے تو قرآن پاک کے فیصلہ کے مطابق "یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا" کلام الٰہی کے معانی بھی الٹے سمجھ کر گمراہی کا باعث ہی بنتے ہیں۔

اولیاء اللہ کا تصرف:

ا۔ ایک آدمی موضع سرلے تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (موجودہ منڈی بہاؤالدین) کا رہنے والا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نہایت سادہ لوح تھا۔ عرض کیا کہ حضرت! اللہ کا نام پوچھنے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ لیکن پانچ نمازیں نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اکیلا آدمی ہوں، کام کاج کرنا ہوتا ہے۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آسانی سے کتنی ادا کرسکتا ہے؟ عرض کیا کہ تین پڑھ سکوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا۔ جب دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو حضور رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا کہ کیوں بھئی! کتنی نمازیں پڑھتا ہے؟ عرض کیا کہ حضرت! اب تو پانچوں وقت نماز کے علاوہ اشراق اور اوابین کے نوافل بھی ادا کرتا ہوں۔

۲۔ مولوی غلام رسول سکنہ آدھی پر ایک عورت فریفتہ ہوگئی۔ایک دن مولوی صاحب اس کے دام میں پھنس گئے ۔معاً کیا دیکھتے ہیں کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے ہیں اور جس طرف دیکھتے ہیں اسی طرف آپ دکھائی دیتے ہیں۔اور آپ کے دست مبارک پر نورانی الفاظ میں یہ آیت مبارکہ تحریر ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (اور جو شخص خدا کے حضور میں حاضر ہونے سے ڈر گیا اس کیلئے دو باغ ہیں) چنانچہ وہ عورت اور مولوی صاحب اس تصرف کو دیکھ کر بچ گئے۔

یہ ہے شیخ طریقت کا تصرف، کہ اپنے تعلق والوں کو شیطانی دغدغوں سے بچانا اور صراط مستقیم پر چلانا۔جن حضرات میں یہ قابلیت نہ ہو، حقیقت میں وہ پیری مریدی کے قابل نہیں ہیں۔

کرامت بعداز وصال:

عاجز ایک دن لاہور گیا اور مرزا جعفر بیگ سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے اپنے بیٹے کا ایک خط مجھے دکھایا جو ولایت (لندن) سے آیا ہوا تھا۔اس میں تحریر تھا کہ:

''اباجی! مجھے ایک بیماری شروع ہوگئی کہ دورہ سا پڑتا ہے اور بے ہوش ہوجاتا ہوں۔بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس گیا۔انہوں نے ٹیسٹ کرنے کے بعد کہا کہ ہمیں تو اس کا سبب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔چنانچہ ایک دن ہوسٹل میں رات کو مجھے دورہ پڑا۔بے ہوشی کا عالم تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قبلہ حضرت صاحب تشریف لائے ہیں۔قبلہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''تیرے باپ کے ساتھ تو میں ناراض ہوں کیونکہ میرے وصال کے بعد مجھے ملنے کیلئے نہیں آئے۔لیکن تیری تکلیف دیکھ کر برداشت نہیں ہوسکا۔آئندہ انشاء اللہ العزیز تجھے یہ تکلیف نہیں ہوگی۔'' چنانچہ اس روز سے وہ تکلیف رفع ہوگئی ہے۔

نوٹ: اس وقت حضور رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوئے دو سال گزر چکے تھے اور مرزا صاحب اس عرصہ میں حضرت کیلیانوالہ شریف میں نہیں آئے تھے۔مرزا صاحب کا بیٹا ولایت میں تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ والد صاحب حضرت کیلیانوالہ شریف میں جاتے ہیں یا نہیں؟

حضور رحمۃ اللہ علیہ کی بے شمار کرامتیں ظہور میں آئیں جن میں سے اکثر آپ کی سوانح حیات

''انشراح الصدور بتذکرۃ النور'' میں درج کردی گئی ہیں۔ یہاں اوارق کی تنگ دامانی کے باعث اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

معمولات شبانہ روز:

حضور رحمۃ اللہ علیہ نصف شب کے بعد تہجد کیلئے تشریف فرما ہوتے۔ دو رکعت نفل تحیۃ الوضواور آٹھ رکعت نفل تہجد ادا فرما کر تین ہزار دفعہ درود خضری شریف (صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) پڑھ کر کچھ دیر مراقبہ کی بعد تھوڑی دیر آرام فرماتے۔ پھر نیا وضو کر کے نماز فجر ادا فرماتے۔ بعد میں شماروں (کھجوروں کی گٹھلیوں) پر تمام نمازیوں کے ہمراہ درود خضری شریف پڑھا جاتا۔ اس کے بعد ربع پارہ قرآن پاک بامعنی تلاوت فرما کر چھ رکعت نفل اشراق ادا فرماتے پھر گھر تشریف لے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد پھر تشریف لاتے اور جو بیلی باہر سے آئے ہوتے ایک ایک کو بلا کر ان سے بات چیت ہوتی۔ اس کے بعد دربار شریف حضرت شاہ جی صاحب ڈیڑھ دو گھنٹہ مراقبہ فرماتے۔ پھر بیٹھک شریف میں خطوط کا جواب لکھ کر دوپہر کا کھانا تناول فرماتے اور مطابق سنت قیلولہ کیلئے لیٹ جاتے۔ ظہر کے وقت اٹھ کر وضو فرماتے۔ ہر وضو فرماتے وقت سر کا مسح کرتے ہوئے ''سرم خاک رہ ہر چار سرور، ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وحیدرؓ۔'' پڑھتے اور کلمہ شہادت اور مروجہ دعائیں اور سورۃ القدر تلاوت فرماتے۔ ظہر کے بعد آدھ گھنٹہ کے قریب مراقبہ فرماتے۔ بعدہٗ بیٹھک شریف میں تشریف لے جاتے اگر کوئی بیلی ہوتا تو اس کے ساتھ مناسب بات چیت فرماتے۔ مولوی صاحبان کے ساتھ قال اللہ وقال الرسول کے مطابق عموماً گفتگو فرماتے۔ اس کے بعد عصر کی نماز کیلئے وضو کر کے چار رکعت سنت پڑھتے اور عصر کی نماز کی جماعت خود کراتے۔ بعدہٗ بحالت تندرستی چند بیلیوں کو ساتھ لے کر باہر سیر کیلئے تشریف لے جاتے۔ پھر مغرب کے بعد گھر تشریف فرما ہوتے۔ کھانا تناول فرماتے اتنے میں عشاء کی نماز کی اذان ہو جاتی۔ پھر عشاء کی نماز ادا فرماتے۔ نمازِ پنجگانہ باجماعت مسجد میں ہی ادا فرماتے۔

رفیق اعلیٰ سے وصال مبارک:

1950ء میں آپ کو وجع المفاصل کا درد شروع ہوا جو متواتر دو اڑھائی سال رہا۔ لیکن معمولات

میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔صرف مسجد میں تشریف نہ لے جاسکتے۔کچھ بیلی آ کے ساتھ بیٹھک شریف میں جماعت سے نماز ادا فرماتے۔اس طویل علالت میں آپ کہیں تشریف نہیں لے جاسکتے تھے۔ختم شریف شرقپور شریف کیلئے کچھ بیلیوں کے ساتھ دونوں صاحبزادگان کو بھیجتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم وبیش را

صاحبزادگان شرقپور شریف ہی میں تھے کہ تین ربیع الاول شریف کی رات کو عشاء کی نماز تیمّم سے ادا فرمائی اور گیارہ بج کر پچیس منٹ پر عین قبلہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال شریف کے وقت کے مطابق شب 3 ربیع الاول 1372 ہجری مطابق 21 نومبر 1952ء کو روح مبارک اس دارفانی سے پرواز کرتی ہوئی اعلیٰ علیین میں واصل بحق ہوئی۔اِنَّالِلّٰهِ وَاِنَّااِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ! اس وقت آپ کی عمر مبارک 63 سال 11 ماہ کی تھی۔

غلام حسین واصف کنجاہی نے تاریخ وصال لکھی:

غوث وقت خویش وشمس علم ودیں حجتے بر منصبش تصنیف او

قطب عالم سیدی نورالحسن بے عدیلش راست گر خواہی بگو

واصل حق گشت و تاریخش وصال

یک ہزار و سہ صد و ہفتاد و دو ۱۳۷۲ھ

حضور رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد پاک:

۱۔ سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ سید محمد جعفر علی شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ سیدہ ثریا خاتون رحمۃ اللہ علیہا

۴۔ سیدہ بلقیس فاطمہ

حضرت سید محمد باقر علی شاہ صاحب کی ولادت باسعادت ۱۵ جمادی الاول ۱۳۴۹ ہجری مطابق ۲۴ راسوج ۱۹۸۷ بکرمی، ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بروز جمعرات اپنے ننہال بدورتہ میں ہوئی۔آپ کے متعلق حضور

رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ بفضلہٖ تعالیٰ صاحب عباوقبااور صاحب طریقت ہوں گے۔مولیٰ کریم نے قبل از پیدائش ہی ان پر فضل فرمادیا ہے۔ چنانچہ حضور رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کا ظہور، اظہر من الشمس ہے اور لاتعداد انسان آپ کی ظاہری حیاتِ طیبہ میں ہر جمعہ شریف پر حاضر ہوکر طریقت میں داخل ہوکر فیوض و برکات حاصل کرتے۔آپ کے اخلاق اعلیٰ کا دوست و دشمن مقر ہے۔آپ نے اپنے قبلہ والدِ گرامی کے وصال مبارک کے بعد عظیم الشان روضہ مبارک تعمیر کروایا۔ مسجد کا برآمدہ بنوایا اور تمام مسجد کو پلستر کروا کر فرش لگوایا۔ مسجد کے شمال مشرق میں وضو کیلئے اعلیٰ ترین جگہ تعمیر کرائی۔دربار شریف حضرت شاہ جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمارت بوسیدہ ہوچکی تھی، اسے بھی از سرِ نو مرمت کروا کر پلستر اور فرش اندر اور باہر لگوایا۔رہائشی مکان از سرِ نو تعمیر کروائے۔ چھوٹے بھائی کی شادی نہایت کشادہ دلی سے حضرت صاحب مکان شریف کے سجادہ نشین حضرت سید محمد محفوظ حسین صاحب کے ہاں کروائی اور ہمشیرہ صاحبہ کی شادی حضرت سید محمد اسمٰعیل شاہ صاحب حضرت کرمانوالہ شریف کے چھوٹے صاحبزادے حضرت سید محمد عثمان علی شاہ صاحب کے ساتھ کی۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الانسان فی القرآن'' اور آپ کی سوانح حیات چھپوا کر شائع کی۔دس بارہ سال کی مدت میں اتنے کاموں کا کرنا اور طریقت کی رونق کو قائم رکھنا بلکہ بڑھانا عام آدمی کا کام نہیں تھا۔انسان کا درجہ اس کے اخلاق اور کردار ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔گو اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں کہ واقعات کا ذکر کیا جائے، تاہم ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ایک دفعہ حضرت سید محمد باقر علی شاہ صاحب کو ایک کام کا خیال تھا لیکن حضور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''لالیا! سائیاں ولوں منع اے۔'' یعنی صاحبان طریقت اس کام میں خوش نہیں۔اس وقت آپ کی عمر بہت تھوڑی تھی۔خیال ہوا کہ شاید اباجی ویسے ہی مجھے منع فرمارہے ہیں۔رات کو عالم رؤیا میں دیکھا کہ ''ایک آفت میری طرف ایذا پہنچانے کیلئے دوڑ رہی ہے اور میں آگے آگے دوڑ رہا ہوں۔سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ دو بزرگ کھڑے ہیں اور مجھے اپنی طرف بلارہے ہیں۔میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ بلا مجھے ایذا دینا چاہتی ہے۔آپ نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ نیست و نابود ہوگئی۔عرض کیا حضرت آپ کون صاحب ہیں؟ تو دوسرے صاحب نے فرمایا کہ یہ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا مظہر العجائب والغرائب کرم اللہ وجہہ ہیں۔میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے ذرا چھوڑیئے۔آپ نے چھوڑ دیا تو میں نے آپ کے قدمین مبارک پر بوسہ

دیا۔آپ نے مجھے اٹھا کر فرمایا کہ تمہیں اباجی نے فرمایا نہیں تھا کہ ''صاحبان طریقت اس کام میں ناخوش ہیں۔'' صبح سویرے اٹھتے ہی حضور رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام واقعہ الگ ہو کر عرض کیا تو آپ نے تین دفعہ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ پڑھا اور فرمایا کہ میرے کہنے پر تو تمہیں یقین نہیں آیا تھا۔عرض کیا کہ اباجی، اگر اس وقت ہی یقین ہو جاتا تو یہ نعمت تو نہ مل سکتی۔ چنانچہ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے پیار فرمایا۔

ایسے سینکڑوں واقعات ہیں لیکن اس واقعہ سے حضور رحمۃ اللہ علیہ کے مدارج اور آپ کے لختِ جگر و سجادہ نشین حضرت سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری صاحب کے تعلق کی جھلک آپ کو نظر آ کر اطمینان کا باعث ہو گی۔

آپ کے روحانی تصرفات اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی ترویج و ترقی کیلئے خدمات ناقابل شمار و بیان ہیں آپ نے محض اپنے روحانی تصرف سے اپنے خدام علماء سے رد شیعت و وہابیت میں پچاس سے زائد کتب تصنیف کروائیں جو رہتی دنیا تک آپ کی طرف سے امت مسلمہ پر عظیم احسان اور صدقہ جاریہ ہے۔ دین اسلام سے محبت آپ کی وصیت نامہ کے ایک ایک حرف سے نمایاں ہے۔اللہ کریم آپ کے متوسلین کو آپ کی نسبت کاملہ عطا فرمائے۔آپ کا وصال مبارک 20 جون 2014ء بمطابق ۲۱ رشعبان المعظم ۱۴۳۵ ہجری بروز جمعۃ المبارک دن ساڑھے گیارہ بجے ہوا۔انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر اور کثیر مخلوق خدا کو آپ کے تاریخی جنازہ مبارک میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔اپنے قبلہ عالم والدِ گرامی کے روضہ مبارک میں ہی مدفون ہوئے۔اللہ آپ کی پر نور تربت پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔آمین !

آپ کے حالات و کرامات کیلئے یہ کتب ملاحظہ کریں: ا۔حدیقۃ النور ۲۔سوہنے اباجی حضور کی کرامات۔

آپ کی اولاد:

مولا کریم نے جس طرح باطنی نعمات سے آپ کو پیدائشی طور پر سرفراز فرمایا اسی طور اولاد کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا:

ا۔پیر سید عظمت علی شاہ صاحب المعروف چن جی سرکار:

آپ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوئے، قبلہ عالم غوث زماں حضور رحمۃ اللہ علیہ نے فرط محبت میں کئی مرتبہ

انہیں اپنی زبان مبارک چوسائی اور یہ بھی فرمایا کہ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہیں اور ایام رضاعت میں ان کی والدہ صاحبہ کو یہ بھی حکم فرمایا کہ ان کی طرف پشت نہ فرمانا، اللہ اللہ یہ مقام ومرتبہ قبل از پیدائش سے ہی عطا ہوا، غوث زماں فرمایا کرتے تھے کہ یہ تو ہمارے بھی ''باپو جی'' ہیں، یہ آپ کے روحانی مقام کی طرف اشارہ تھا، علم دین مکمل درس نظامی پڑھا، اللہ کریم نے حسن ونور اور جمال کی دولت کے ساتھ خطابت کی بے مثل دولت بھی عطا فرمائی ہے، بین الاقوامی کانفرنسوں اور اندرون وبیرون ملک تبلیغی پروگراموں میں آپ کی شرکت اور نورانی خطابات سے لاکھوں مخلوق خدا فیض یاب ہوتی ہے، حضور قیوم العالم آپ کے والد گرامی نے آپ کو اپنی زندگی میں خلافت اور سجادگی عطا فرمادی، اور وصیت نامہ میں سلسلہ عالیہ اور دربار شریف ومسجد کا مکمل انتظام آپ کے سپرد کردیا، پورے ملک کے طول وعرض میں کئی مدارس اسلامیہ آپ کی سرپرستی میں چل رہے ہیں، آپ کی شادی آستانہ عالیہ مکان شریف کے نورعلیٰ نور خاندان میں ہوئی، آپ کی زوجہ محترمہ کی پیدائش عین اسی دن ۱۳ شوال کو ہوئی جب اعلیٰ حضرت سید امام علی شاہ صاحب مکان شریفی کا سالانہ عرس مبارک تھا، اللہ کریم نے آپ کو دو شہزادے اور ایک بیٹی عطا فرمائی ہے، آپ کے صاحبزادگان پابند صوم وصلوٰۃ وباشرع اور دونوں قیوم العالم حضرت سید محمد باقر علی شاہ صاحب بخاری قدس سرہٗ کے خلیفہ واجازت یافتہ ہیں، بڑے صاحبزادے حضرت سید محمد علی حسنین شاہ صاحب بخاری اور چھوٹے صاحبزادے حضرت سید سجاد حیدر شاہ صاحب بخاری ہیں۔

۲۔سید عصمت علی شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کے دوسرے صاحبزادے ہیں جو اپنے والدِ گرامی کے وصال مبارک کے چند ماہ بعد یکم دسمبر 2014ء کو وصال فرماگئے، آپ نہایت خوش اخلاق اور خوبصورت نوجوان تھے، حضور رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ شہنشاہ ہوں گے، چنانچہ آپ نہایت رقیق القلب تھے، کسی غریب، مسکین کی تکلیف گوارہ نہکرتے، جس قدر بھی روپیہ پیسہ آپ کے پاس ہوتا، کسی مستحق سائل کو اسی وقت نکال کردے دینا ان کا شیوہ تھا، قرآن مجید کی قرات نہایت خوش الحانی سے کرتے، مولیٰ کریم نے لحن داؤدی عطا فرمایا تھا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت شریف پڑھتے تو سامعین پر کیف ووجد طاری ہونے لگتا، آپ کی شادی

آستانہ عالیہ مکان شریف کے سجادہ نشین حضرت سید محفوظ حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لخت جگر سے ہوئی ،اللہ کریم نے آپ کو چار بیٹے عطا فرمائے ،آپ یکم دسمبر ۲۰۱۴ کو انتقال فرما گئے ، مزار شریف آپ کے والدگرامی قدس سرہ کے قدمین شریفین میں ہے۔

۳۔سید فراست علی شاہ صاحب:

آپ کے تیسرے صاحبزادے ہیں،نہایت سنجیدہ، راست گو، مستقل مزاج،قوی الارادہ اور غیور طبیعت کے مالک ہیں،مسلک حقہ اہلسنت و جماعت اور صحابہ کرام واسلاف کی عزت کی خاطر اپنی جان ومال تک قربان کرنا اپنا منشورحیات سمجھتے ہیں،مولا کریم نے سائیوں کا صدقہ وسیع وسائل رزق عطا فرمائے ہیں،آپ کی زوجہ محترمہ باقاعدہ سلسلہ طریقت میں داخل ہیں اورانہیں لنگر شریف کی خدمت کی سعادت حاصل رہی ،اللہ کریم نے آپ کو دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی ہے۔بیٹی وصال فرما چکی ہیں بیٹے دونوں شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

۴۔سید محمد عارف علی شاہ صاحب:

نہایت خوش اخلاق، باحوصلہ اور محنتی ہیں،ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی،ایک لائق،محنتی اور بارعب سرکاری آفیسر(ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے) کی شہرت رکھتے ہیں۔

۵۔سید آصف علی شاہ صاحب:

نہایت خوش شکل ،لطیف مزاج اورخوش مزاج تھے، چنیوٹ کے ایک سادات خاندان میں شادی ہوئی،اللہ کریم نے آپ کو چار بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا فرمایا۔آپ بھی حضور قبلہ کے بعد وصال فرما چکے ہیں۔

۶۔سید فیض الحسن شاہ صاحب

نہایت خوبصورت ،خوش اخلاق، ہونہار اورنہایت پیارے ہیں،قبلہ حضرت صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند دلبند ہیں،شادی شدہ ہیں،مولا کریم نے دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی ہے۔

حضرت قبلہ عالم الحاج پیر سید محمد باقر علی شاہ صاحب قدس سرہٗ کو اللہ کریم نے دو صاحبزادیاں بھی عطا فرمائی ہیں جو شادی شدہ ہیں،آستانہ عالیہ حضرت کرمانوالہ شریف کے چشم و چراغ حضرت صاحبزادہ

سید صمصام علی شاہ صاحب بخاری اور حضرت صاحبزادہ پیر سید میر طیب علی شاہ صاحب سجادہ نشین حضرت کرمانوالہ شریف آپ کے داماد ہیں اور ایک خلقت ان کے وجود مسعود سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

سید محمد جعفر علی شاہ صاحب:

آپ حضور رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے چھوٹے فرزند ہیں، جو وصال فرما چکے ہیں، نہایت خوش شکل اور خوش سیرت نوجوان تھے، اپنے برادر اکبر کے فرمانبردار اور عوام الناس اور متعلقین سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، آپ کی شادی سجادہ نشین مکان شریف سید محفوظ حسین شاہ صاحب کے ہاں ہوئی اور مولا کریم نے آپ کو تین فرزند اور ایک لڑکی عطا فرمائی، حضرت غوث زماں اعلیٰ حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے روضہ انور میں آپ کا مزار مبارک ہے۔

ا۔ سید رضوان الحسن صاحب:

نہایت خوبصورت، مضبوط اور تیز طبع ہیں، مولا کریم ان کی عمر دراز اور دین و دنیا کی سعادتوں سے مالا مال فرمائے، قبلہ حضرت صاحب کو اپنے والد کی جگہ پر سمجھتے ہیں، اپنے والد صاحب کی سیاست کی سیٹ سنبھالے ہوئے ہیں، اور صاحب اولاد ہیں۔

۲۔ سید صنعان الحسن صاحب:

یہ آپ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، نہایت خوش اخلاق، خوش خصال اور خوبصورت ہیں، تحقیق کا مادہ ان کے دماغ میں بہت زیادہ ہے، آپ بھی صاحب اولاد ہیں۔

۳۔ سید انبساط الحسن صاحب:

آپ ایمان دار اور شفقت فرمانے والے ہیں اور صاحب اولاد بھی ہیں۔

حضرت سید محمد جعفر علی شاہ صاحب کو مولا کریم نے ایک بیٹی بھی عطا فرمائی جس کی شادی اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی، وہ بھی صاحب اولاد ہیں۔

درگاہ رب العالمین میں دعا ہے کہ مولیٰ کریم اس باغ کے ہر پھول، ہر غنچے اور ہر کلی کو دنیا و آخرت کے ثمرات حسنہ سے بار آور فرمائے، آمین۔

شجرہ شریف

نقشبندیہ مجددیہ مکان شریفیہ

اے خدا بہر حبیب خویش حضرت مصطفیٰ مقتدائے اولیاء و افتخار انبیاء
از پے صدیق و سلماں قاسم و جعفر ولی وز برائے بایزید و بوالحسن ہم بو علی
وز برائے یوسف و عبدخالق عارف با خدا بہر محمود و علی و خواجہ بابا میرما
بہر خواجہ نقشبند و ہم علاؤالدین پیر خواجہ یعقوب ہم احرار و زاھد بے نظیر
بہر درویش محمد باقی باللہ الصمد شیخ احمد پیشوا معصوم وز عبدالاحد
وز سعید و حضرت خواجہ حنفی پارسا از پے شیخ محمد وز زکی باخدا
حضرت خواجہ محمد حاجی احمد شاہ حسین وز امام باعلی مشکل کشا را نور عین
وز برائے پیر ما پشتِ پناہِ اہلِ دین حضرت صادق علی مقبول رب العالمین
مظہر انوار حق حضرت امیرالدین را وز برائے حضرت شیر محمد باصفا
حضرت نورالحسن آن مقتداء و پیشوا باد یا رب در جہاں روشن چو خورشید سما
حضرت محمد باقر علی منبعِ جود و سخا نسبتش در دو جہاں وجہِ شفاعت مصطفیٰ

کن غریق بحر عرفانِ حقیقت اے خدا
غیر تو ہرگز نہ بینم ، بگزرم از ما سوا

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَo الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِo اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُo اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَo صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَo"

ترجمہ: "سب تعریف پروردگار عالمین کیلئے ہے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، دن انصاف کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تیری مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔"

تشریح:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾

(سب تعریف پروردگار عالمین ہی کیلئے ہے۔)

حقیقی تعریف تمام موجودات کی خلقت اور ربوبیت کی وجہ پر اس خالق موجودات اور پروردگار عالمین کیلئے ہی خاص ہے، خواہ وہ عالم موجودات سے ہو یا عالم محسوسات، معلومات اور معروفات سے بہر حال ربوبیت کی بساط پر ظہور اور نشان کا گلدستہ ہے، جو توحید کے مترادف ہے اور مطابق: یُسَبِّحُ لِلّٰهِ

مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۱ اور: وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ ۲ سراسر تسبیح خواں قالی وجہ پر اور سراسر تعریف حال کی رو سے اظہر من الشمس ہے۔ معنی شناسوں یعنی عارفوں کیلئے مشاہدہ اور: "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" ۳ کے ماتحت بے علموں کیلئے: وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ٤ کا فرمان روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ربوبیت کا تعلق ہر کہ ومہ اور ہر چیز سے پرورش کی وجہ سے یکساں ہے۔ خصوصاً انسان خواہ کافر ہو یا مسلم، منافق ہو یا مومن، فاسق ہو یا مشرک، ولی ہو یا پیغمبر سب کے سب اس میں شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مومن کو تو نور ایمانی سے، منافق کو نفاق سے، فاسق کو فسق سے، کافر کو کفر سے اور جاہل کو جہالت سے نسبت ہے: نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی ٥ کی زبردست سنت کے مطابق ربوبیت کا تصرف رب العالمین کی طرف سے جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ اور یہ دونوع پر منقسم ہے: [۱] جسمانی اور [۲] روحانی۔ اور دونوں وجہ پر مولیٰ کریم کی طرف سے برابر ہے۔ بلکہ دنیوی ترقی نافرمانوں اور کافروں کیلئے زیادہ ہوا کرتی ہے لیکن روحانیت کی بساط پر ایک نقطہ بھی ان کے نصیب میں نہیں ہوسکتا۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِہٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ"

[الشوریٰ: ۲۰]

"جو کوئی چاہتا ہے کھیتی آخرت کی، زیادہ دیتے ہیں ہم اس کو بیچ کھیتی اس کی کے اور جو کوئی چاہتا ہے کھیتی دنیا کی، دیتے ہیں ہم اس کو کچھ اس میں سے اور نہیں واسطے اس کے بیچ آخرت کے کچھ حصہ"

تاہم یہ تقسیم من اللہ دو وجہ پر ہے؛ ایک عوام کیلئے جس میں مومن، منافق، کافر، فاسق سب

۱۔ اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ بادشاہ کمال، پاکی والا، عزت والا، حکمت والا۔ ۲۔ اور کوئی چیز نہیں جو اسے سراہتی ہوئی اس کی پاکی نہ بولے۔

۳۔ جو بے دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ ٤۔ ہاں تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

٥۔ جدھر پھرنا چاہے ہم اسے پھیر دیں گے۔

برابر ہیں۔کمی بیشی عین حکمت اور انتظام کی بنا پر واقع ہے۔فرمایا ہے:

"وَلَوْبَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْافِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍمَّايَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌبَصِيْرٌ"
[الشوریٰ:۲۷]

''اور اگر کشادہ کرتا اللہ رزق واسطے سب بندوں اپنے کے البتہ سرکشی کرتے بیچ زمین کے،اور لیکن اتارتا ہے ساتھ اندازے کے جو کچھ چاہتا ہے۔تحقیق وہ ساتھ بندوں اپنے کے خبردار ہے،دیکھنے والا۔''

یہ تقسیم انتظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام مخلوق کیلئے ہے۔پھر بھی کئی قسم کے فساد،زبردستیاں اور ظلم ظہور میں آ ہی رہے ہیں جو کسی قدر اختیارات انسانیہ کا ثمر ہے۔مومن کیلئے یہ تقسیم روا نہیں ہے:

ما می کشیم دوست و ما پروریم دشمن!
کس را مجال نیست کہ چون و چرا کند[1]

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ:

"مَاكَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَالْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآاَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَالْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ"
[آل عمران:۱۷۹]

''نہیں ہے اللہ کہ چھوڑ دے ایمان والوں کو اوپر اس حالت کے کہ ہو تم اوپر اس کے۔یہاں تک کہ جدا کردے ناپاک کو پاک سے۔''

حدیث شریف میں ہے کہ دنیا خداوند کریم کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مردار سے تشبیہ دی ہے۔محققین نے اس کی اصلیت اور حقیقت کو گمراہ کنندہ اور ناپاکی وخباثت سے تعبیر کیا ہے:"اَلدُّنْيَامَلْعُوْنٌ وَّمَافِيْهَامَلْعُوْنٌ"[2] فرمایا ہے۔

فرمان ایزدمتعال:يَمِيْزَالْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ[3][آل عمران:۱۷۹]اسی کی خباثت سے عبارت ہے۔جب مومن بفضلہ تعالیٰ اس سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کا قلب اطہر بالکل منزہ ہو جاتا ہے تو پھر اس

۱۔ہم دوستوں کو تو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو بھی پالتے ہیں کسی کی مجال نہیں ہے کہ چوں و چرا کرے۔
۲۔دنیا خود بھی ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے۔۳۔ناپاک کو پاک سے الگ کردے۔

کواس قدر دیتے ہیں جس قدر وہ نہیں چاہتا۔ کیونکہ پھر نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض ناعاقبت اندیش مسلمان ہونے کے باوجود اس حکمت کاملہ پر معترض ہو بیٹھتے ہیں اور یہ شیطانی دغدغہ ہے۔ بعض اس کے جال میں ایسے پھنستے ہیں کہ دہریت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مومن بھی اس بلائے عظیم میں کچھ نہ کچھ غلطی کھا بیٹھتا ہے۔ اسی لئے اس موقع پر:

﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ (بڑا مہربان اور رحم کرنے والا)

کے اسم مبارک لائے گئے ہیں۔ یعنی بڑا مہربان ہے اپنی مخلوق پر اور رحیم۔ اس لئے کہ جو گناہ بھی کرتے ہیں اور توبہ بھی کرتے ہیں ان کیلئے رحیم کا اسم گرامی آیا ہے۔ مولیٰ کریم ایسوں پر بھی رحم فرماتا ہے۔ رحمٰن کا لفظ عام ہے اور رحیم کا خاص۔ رؤف و رحیم فرماتے ہیں کہ:

"وَلَوْيُؤَاخِذُاللّٰهُ النَّاسَ بِمَاكَسَبُوْا مَاتَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَامِنْ دَآبَّةٍ"
[الفاطر:۴۵]

''اگر پکڑے اللہ لوگوں کوساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا۔

لیکن رحمت کواس نے اپنی ذات پر لازم کررکھا ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۱ [الانعام: ۱۲] یہ رحمت خاص مومنین کیلئے ہے، مشرکین، منافقین اور کافرین کیلئے نہیں۔ گوایک لحاظ سے ان پر بھی رحمت ہے کہ دنیا میں ان کو فوراً پکڑا نہیں جاتا اور موت تک ان کیلئے مہلت ہے جو دراصل غضب کے مترادف ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

"وَلَايَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْااَنَّمَانُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌلِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَانُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْااِثْمًاوَّلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ"
[آل عمران:۱۷۸]

''اور نہ گمان کریں وہ لوگ کہ کافر ہوئے ہیں یہ کہ جو ڈھیل دیتے ہیں ہم ان کو بہتر ہے واسطے جانوں ان کی کے، سوائے اس کے نہیں کہ ڈھیل دیتے ہیں ہم ان کو تو کہ زیادہ ہو جائیں گناہوں میں اور واسطے ان کے عذاب ہے خوار کرنے والا۔''

۱۔ لازم فرمالیا اوپر ذات اپنی کے رحمت کو۔

دراصل مولیٰ کریم کا معاملہ انسان کے ساتھ ایسا خاص ہے جو کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سخت سے سخت گنہگار بھی جب مولیٰ کریم کے دربار میں غلطی کو تسلیم کر کے گڑگڑاتا اور تہہ دل سے توبہ کرتا ہے تو اسی وقت اس پر رحمت کی برسات برسنے لگتی ہے اور کوئی گناہ اس کا باقی نہیں رہتا۔ کراماً کاتبین سے پہلی کتابیں واپس لے لی جاتی ہیں اور ان کو نئی کتابیں دی جاتی ہیں۔ بلکہ مطابق فرمان ان کی بدیاں نیکیوں سے بدل دی جاتی ہیں:

"اِلَّامَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ" [الفرقان: ۷۰]

"مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور کیا کام اچھا پس بدل ڈالتا ہے اللہ ان کی برائیوں کو ساتھ بھلائیوں کے۔"

اوپر گزر چکا ہے کہ منکرین اور کافرین پر ایک رحم ہے جو غضب کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس جب مومن سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کی گرفت کی جاتی ہے تاکہ اس میل کچیل سے صاف ہو کر درست ہو جائے۔ مومنین کیلئے اس میں تین درجے ہیں۔ پہلا شخص گناہ کو تو جانتا ہے لیکن اس کے ارتکاب سے اس کی طبیعت کو احساس بہت کم ہوتا ہے۔ توبہ واستغفار سے معافی حاصل کر لیتا ہے اور سوائے ندامت کے اس کے بطن پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

دوسرے شخص سے اگر کوئی غلطی ہو تو وہ طبیعت میں ایک کمی محسوس کرتا ہے اور تیسرا اگر کسی خطا کا مرتکب ہو (لیکن یاد رہے کہ ان کی خطا عوام کی مثل نہیں ہوتی بلکہ عوام کا فعل اور ان کا خیال برابر ہوتا ہے) تو ذرا سی غلطی کی وجہ سے ان کی حالت سخت دگرگوں ہو جاتی ہے اور بیمار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو جب تک حالت درست نہ ہو جائے ہوش وحواس بھی قائم نہیں رہتے۔ ان پر غضب رحمت کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ مدارج احساس خداوند کریم کی توفیق اور مہربانی سے ہوتے ہیں۔ سب سے سخت اور بدتر گناہ وہ ہوتا ہے جس کا احساس نہ ہو بلکہ عین غضب الٰہی کا باعث ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں توبہ اور اصلاح ناممکن ہوتی ہے۔

کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْالَهٗ بَالْقَوْلِ کَجَھْرِبَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ"

[الحجرات:۲]

"اے لوگو! جوایمان لائے ہومت بلند کرواپنی آوازکواوپرآواز نبی کے اورمت آواز بلند کرواوپر اسکے بیچ بولی کے جیسابلندکرتے ہیں۔بعض تمہارے واسطے بعض کے۔ایسانہ ہوکہ کھوئے جائیں عمل تمہارے اورتم نہ سمجھتے ہو۔"

﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾

(مالک ہے روز جزا کا یعنی انصاف کا)

مراداس سے یَوْمُ الْقِیَامَةِ ہے۔جس دن حساب وکتاب، جزاوسزااورعدل وانصاف بادشاہ حقیقی کے حکم سے ہوگا:مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی عبارت محض ہماری تفہیم کے لئے ہے جس دن کہ بھاگے گا ہرایک آدمی اپنے بھائی سے اپنی ماں سے،اوراپنے باپ سے اوراپنی بیوی سے اوراپنے بیٹے سے۔چنانچہ فرمایاہے:یَوْمَ یَفِرُّالْمَرْأُمِنْ اَخِیْهِ ٥وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ ٥وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ[عبس:۳۴] اورنہیں پوچھے گا کوئی دوست،دوست کو۔لَایَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا [المعارج:۱۰] بلکہ سب دوستیاں دشمنی میں بدل جائیں گی مگرمتقیوں اوراللہ والوں کی دوستی،کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍبَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّاِلَّاالْمُتَّقِیْنَ [الزخرف:۶۷]اورجس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے،ہنستے،خوش وقت اورکتنے منہ غبارآلودہ اورسیاہی مائل ہوں گے۔وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ٥ ضَاحِکَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ٥ وَوُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍعَلَیْھَاغَبَرَةٌ ٥تَرْھَقُھَاقَتَرَةٌ[عبس:۳۸تا۴۱]بہت سے چہرے تواپنے رب کی طرف دیکھنے سے تروتازہ ہوں گے اوربہت سے متفکرہوں گے۔گمان کریں گے کہ ان کی کمر کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں ہیں:وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍنَّاضِرَةٌ ٥اِلٰی رَبِّھَانَاظِرَةٌوَّوُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ٥تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِھَا فَاقِرَةٌ [القیمة: ۲۲ تا ۲۵]

توچونکہ تمام تراقتدارمالک الملک کے ہاتھ میں ہوگا۔اس لئے کسی قسم کی رشوت نہیں چلے گی۔حتی کہ فرمایاہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِهٖ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَالَهُمْ مِنْ نّٰصِرِیْنَ"

[آل عمران: ۹۱]

''جن لوگوں نے دنیا میں کفر کیا اور کفر ہی پر مر گئے اگر کوئی ان میں سے اپنے بچاؤ کیلئے زمین بھر سونا بھی زرفدیہ کے طور پر ادا کرے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ان کیلئے نہایت دردناک عذاب تیار ہے اور کوئی ان کا مددگار نہیں۔''

یہ دن سوائے ان لوگوں کے جو محو دیدار ہوں گے سب کے لئے کم وبیش سخت ہوگا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔اسی لئے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔تاکہ اس کو تہہ دل سے یاد بھی رکھو اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنَ کے اسم مبارک سے پکارو۔ورنہ اس تخصیص کی ضرورت نہ تھی۔کیونکہ ابتداء سے انتہا تک کا مالک، حیوانات، نباتات، جمادات اور معدنیات بلکہ تمام موجودات، سب کا مالک۔نہ اس کیلئے ابتداء نہ انتہاء۔ جو ہمارے علم میں آچکا ہے اور جو نہیں آیا سب کا مالک ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ جب کوئی چیز نہ تھی اس وقت مالک الملک کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ قبل از ظہور ہر ایک چیز ذات پاک کے علم میں متحقق تھی، جواب بھی ہے۔جس کا ظہور ہو چکا ہے اور جس کا ظہور ابھی تک نہیں ہوا۔متحقق ہونے میں برابر ہے۔جیسے ذات پاک علیم بھی ہے اور عالم بھی۔علیم اپنی ذات کیلئے ہے جس میں غیر کا واسطہ نہیں۔ اور عالم غیر کیلئے۔(قبل از ظہور اور بعد از ظہور) فرق یہی ہے۔

﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ﴾

(ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں)

قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم عزوجل: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ [الذریت: ۵۶] ''اور میں نے جن اور آدمی اس لئے بنائے کہ میری بندگی کریں۔'' اظہر من الشمس ہے۔ ہماری تخلیق کا منشا ہی عبادت ہے تاکہ اس معبود حقیقی کا (عبد ہونے کی حیثیت سے عبادت کے ذریعہ اس کی خوشنودی حاصل کر کے) عرف حاصل کریں۔چنانچہ دوسری جگہ فرمان مبارک صادر ہو رہا ہے: وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ [الحجر: ۹۹] یعنی اس حد تک اپنے رب کی عبادت کر کہ علم الیقین عین

الیقین کو عبور کرتا ہوا حق الیقین کو حاصل کر لے جو اصل مقصود اور منشائے تخلیق ہے۔

مولیٰ کریم نے اپنے خاص فضل اور مہربانی سے انسان کے ہر عضو کو عبادت کے لئے مخصوص فرمایا ہے۔

زبان کی عبادت بموجب فرمان: رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلاً [مزمل: ۴] ''قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔'' قرآن پاک کا پڑھنا اور مطابق: يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ''نیک کاموں پر حکم کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا یعنی وعظ و نصیحت اور ذکر ہے۔

کان کی عبادت کلام مجید اور خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کی نصیحت کا سننا ہے۔ حقیقت میں ہدایت کی ابتداء سماعت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ہر وہ آواز جو کانوں تک پہنچتی ہے۔ دل میں جاگزیں ہو کر باعث رشد و ہدایت ہوتی ہے اس لئے ہدایت کا پہلا زینہ ہی کان ہے۔

آنکھ کی عبادت قرآن کریم کا دیکھنا، موجودات کی تخلیق میں غور و تفکر کر کے آیات الٰہی کا معلوم کرنا اور تجلیات کا پانا ہے۔ ہاتھ کی عبادت مولیٰ کریم کے دین کی حفاظت کیلئے اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا، سخاوت کرنا اور طاقت بازو کا کسی کمزور بندہ خدا کی مدد میں خرچ کرنا ہے۔

پاؤں کی عبادت قیام کرنا، نماز کیلئے مسجد میں جانا، حج بیت اللہ کے لئے سفر کرنا، مسجد نبوی اور مطابق فرمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''مَنْ زَارَ قَبْرِىْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِىْ'' ''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔'' آپ کے روضہ پاک کی زیارت کیلئے جانا اور اولیائے کرام وصلحائے عظام کی خدمت میں: يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ''خدا تعالیٰ کی رضامندی چاہتے ہیں۔'' کیلئے حاضر ہونا اور علیٰ ہذا القیاس زیارت القبور اور اولیاء اللہ کے مزارات پر پہنچ کر درس عبرت لینا اور مطابق: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ''پس زندگی بخشتے ہیں ہم اس کو زندگی پاکیزہ۔'' مولیٰ کریم کی عطا کردہ حیات طیبہ سے مستفیض ہونا، غرض ہر نیکی کے کام کیلئے چلنا ہے۔

دل کی عبادت مطابق فرمان: فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ [البقرة: ۱۵۲] ''تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔'' یاد الٰہی اور معرفت خداوندی ہے۔

اے عزیز! اسی طرح ہر ایک عضو کیلئے: كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ''سب اپنی شکل پر عمل کرتے ہیں۔'' کے موافق مختلف عبادتیں مقرر ہیں۔ اپنے مقصد حیات وتخلیق کو مت بھول۔ غفلت میں پڑ کر: كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ [الاعراف: ۱۷۹] ''چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔'' کا مصداق نہ بن اور یاد رکھ کہ کان، آنکھ اور دل سب ہی اعضاء سے یقیناً بازپرس ہونے والی ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا [الاسراء: ۳۶]

﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

(اور تجھ ہی سے ہم استعانت یعنی مدد طلب کرتے ہیں)

ہر قسم کی نصرت واعانت اس فاعل حقیقی ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ براہ راست کسی فعل کا صدور وظہور روا نہیں بلکہ ہر ایک عالم میں اسی کے مطابق اسباب کا التزام فرمایا ہے اور ہر ایک فعل کا ظہور اسباب سے متعلق رکھا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق نصرت واعانت میں بھی اسباب کو مؤثر اور ملازم کیا ہے جو حقیقت میں اس ذات پاک ہی کی طرف سے ہے۔ اسباب کا انکار مسبب کا انکار ہے۔ جیسا کہ:

۱۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب کے وقت میں جب ابرہہ نے کعبۃ اللہ کے گرانے کا ناپاک عزم کیا اور حضرت عبدالمطلب کے اونٹ ہنکا لے گیا تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ ابرہہ نے کہا اونٹوں کی فکر کرتے ہو اور کعبہ کی فکر نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اونٹ میری ذاتی ملکیت میں ہیں ان کی حفاظت میرے ذمہ ہے اور گھر (کعبہ) کی حفاظت اس کے مالک کے ذمے، وہ خود اس کو سنبھال لے گا۔ چنانچہ آپ اپنے اونٹ لے کر واپس چلے آئے۔

گو مولیٰ کریم کئی طرح سے بغیر اسباب کے ان کو تباہ کرنے پر قادر تھے۔ ویسے ہی ان کی روحیں قبض کر لی جاتیں۔ لیکن مطابق سنت، عالم اسباب میں ان کی تباہی کیلئے اسباب ہی کا التزام فرمایا اور مطابق فرمان:

"اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ o اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ o وَّاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ o تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ o فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ" [الفیل: ۱ تا ۵]

"کیا نہ دیکھا تو نے کیونکر کیا پروردگار تیرے نے ساتھ ہاتھیوں والوں کے۔ کیا نہ کر دیا مکران کا بیچ گمراہی کے اور بھیجے اوپران کے پرند جانور جماعت، جماعت، پھینکتے تھے ان پر پتھر کنکر سے۔ پس کر دیا ان کو مانند بھوسے، کھائے ہوئے کے۔"

چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو ارسال فرما کر فَعَلَ رَبُّکَ سے تعبیر فرمایا۔ یعنی ابابیل کے فعل کو حقیقت میں اپنا فعل فرما کران کو کَعَصْفٍ مَّاْکُوْل کر دیا۔ یہ ہے سنت اللہ۔ اب اگر کوئی اس ابابیل کے فعل کا انکار کرے تو اصل میں فَعَلَ رَبُّکَ کا انکار ہے، جو کفر سے کم نہیں ہے۔

۲۔ ہر ایک انسان (مسلم وغیر مسلم) نظام شمسی کا مقر ہے۔ عالم موجودات میں ہر ذی روح بلکہ نباتات اور معدنیات تک کی نشو ونما اور حیاتی کا دارو مدار مولیٰ کریم نے سورج ہی پر رکھا ہے۔ اگر سورج کا فیضان نہ ہوتو کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر نباتات کو اگنے اور پرورش پانے بلکہ باثمر ہونے تک شمس کی مدد کی ضرورت ہے جو من اللہ جاری ہے۔

ورنہ کوئی چیز اگ ہی نہیں سکتی اور نہ ہی بڑی ہو سکتی ہے۔ سردیوں میں بادل کی وجہ سے سورج کے چھپے رہنے اور بارش کے زیادہ ہونے کے سبب سے اگر نباتات پر سورج کی گرمی صحیح طور پر اثر انداز نہ ہو سکے تو بیج میں نقص واقع ہو جاتا ہے، اور دانہ زیرہ کی مانند ہو کر خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک چیز کا حال ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ سورج کی امداد کے سوا کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا تو بالکل حق ہے اور اس کا انکار فعل خداوندی کا انکار ہے۔

۳۔ سایہ کے بڑھنے اور کم ہونے تک (جو سورج کے سامنے کسی اوٹ یا حجاب کے بغیر کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتا) مطابق فرمان:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا o

"بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ٥"
[الفرقان:۴۵،۴۶]

چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر نشانی ٹھہرایا پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔"

اپنے فعل سے تعبیر فرمایا لیکن اس کا رہنما اور دلیل شمس کو ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اس کی علت بظاہر سوائے سورج کی گردش کے کچھ نظر نہیں آتی۔ اب اگر سورج کو اس کا رہنما مانتے ہوئے اس کے خواص سے انکار ہو تو مولیٰ کریم کے فعل کا انکار ہے۔

۴۔ اسی طرح گو تمام تر ہدایت من اللہ ہے تاہم عمل کے میدان میں جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لایا جائے۔ خواہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو، مطابق فرمان: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ [۱] کے مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ علیٰ ہذا القیاس:

"یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ٥ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ٥ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا"
[الاحزاب: ۴۵ تا ۴۷]

"اے نبی! بے شک بھیجا ہے ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا اور پکارنے والا طرف اللہ کی ساتھ حکم اس کے اور سورج روشن، اور خوشخبری دے ایمان والوں کو ساتھ اس کے کہ واسطے ان کے ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بڑا۔"

کے فرمان کے مطابق حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان پانچ صفات سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے اور ایمان کے بیج کو نشو ونما کیلئے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کو دلیل اور راہنما ٹھہرایا ہے۔ تو جب تک انسان آپ کے ان اوصاف کو دل سے مان کر ﴿سِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾ سے مستفیض نہ ہو اس وقت تک ﴿مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا﴾ کی بشارت سے خوشخبری حاصل نہیں کرسکتا اور وہ فیض جو من اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

(۱) جس نے فرمان برداری کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پس بے شک فرمانبرداری کی اللہ کی۔

وساطت سے مومنوں کیلئے جاری ہوا ہے اس سے محروم ہی رہتا ہے اور اس کا انکار اس فاعل حقیقی کے فعل کا انکار ہے۔ اور یہ فی سبیل اللہ استعانت ہے جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔ ہر استعانت من دون اللہ حرام ہے اور فی سبیل اللہ حلال۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ[1] اور حواریوں نے جواب دیا: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ[2]

گو اوپر قرآن مجید کی استدلال سے کچھ بیان ہو چکا ہے، تاہم ناظرین کی تسلی کے لئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سے تائیداً چند سطور درج ذیل ہیں۔

آپ لکھتے ہیں:

''غیر سے اس قسم کی مدد چاہنا کہ اسی پر بھروسہ ہو اور اس کو خداوند تعالیٰ کی مدد کا مظہر نہ جانا جائے، حرام ہے۔ اور اگر توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہے اور اس غیر کو مدد الٰہی کا مظہر جان کر اللہ تعالیٰ کے کارخانہ اور اسباب حکمت پر نظر کر کے غیر کے ساتھ استعانت کرے تو عرفان سے دور نہ ہوگا اور شرع میں جائز اور روا ہے، اور انبیاء اور اولیاء نے غیر سے اس طرح کی مدد طلب کی ہے۔ اور در حقیقت یہ استعانت غیر سے نہیں بلکہ حضرت حق سبحانہٗ ہی سے استعانت ہے۔''

﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾

(چلا ہم کو سیدھی راہ پر)

مطابق فرمان مولیٰ کریم:

"فَمَنْ یُّرِدِاللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ

''تو جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے، اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا

۱۔ کون میرے مددگار ہوتے ہیں اللہ کی طرف۔

۲۔ ہم دین خدا کے مددگار ہیں۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل وتوضیح ''توحید پر عمل'' کے عنوان میں کی گئی ہے، وہاں پر دیکھ لیں۔

ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا" [الانعام:۱۲۵،۱۲۶]

ہے کہ گمراہ کردے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے اور یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا رستہ ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ" [یونس: ۹]

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب سے ہدایت عنایت فرماتا ہے۔"

مولیٰ کریم نے اپنے فضل و کرم سے انسان کی فطرت میں توفیق سرشتی عطا فرما کر: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا [الشمس: ۸]١ کی سمجھ عطا فرمائی اور کچھ تھوڑا سا اختیار دے کر میدان دنیا میں مقرر میعاد کیلئے بھیجا۔ ہدایت کے اسباب یعنی نبوت و کتب اور اولیاء و صلحاء اس کی امداد کیلئے بھیجے اور گمراہی کیلئے شیطان لعین کو مقرر کیا۔ اب توفیق سرشتی کے موافق جس نے اسباب ہدایت پر ایمان لا کر رب کریم کی طرف رجوع کیا تو اس کیلئے فضل و کرم فرما کر يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ [الانعام: ۱۲۵] کی سنت کو جاری کر دیا اور هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا کے مطابق صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی اور اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ٢ [الزمر: ۲۲] کا مصداق ٹھہرایا۔ اور جس نے سنت اللہ کے اسباب ہدایت سے روگردانی کی اور يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ ٣ [الزخرف: ۳۲] کا مرتکب ہوا نُقَيِّضْ لَهٗ

۱۔ پھر اس کی بدکاری اور پرہیز گاری دل میں ڈالی۔

۲۔ تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کیلئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔

۳۔ جو کوئی شب کوری کرے یاد خدا کی سے۔

شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ [۱] کی سنت اللہ کا اجرا اس کیلئے حق ہو گیا اور مَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کا مستحق ہو کر گمراہ ہو گیا۔

﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾

(ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو نے انعام کئے ہیں)

مصداق فرمان مولیٰ کریم:

"فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ○ ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَکَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا"

[الانساء: ۵۹، ۶۰]

''پس وہ لوگ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے انعام کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک لوگ، اور ان لوگوں کی رفاقت بہت خوب ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والا ہے۔''

ان آیات سے ثابت ہوا کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے حق دار وہی لوگ ہیں جو ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ کے مستحق ہیں۔ دوسری جگہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات حسنہ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ○ وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا [۲] کا بیان فرما کر مومنوں کیلئے مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا کَبِیْرًا [۳] کا مژدہ سنایا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ حسب الحکم اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ [۴] [آل عمران: ۳۱] اتباع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کے نور سے منور ہو کر مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا کَبِیْرًا کے انعام کا مستحق اور اس رفاقت حسنہ کا حق دار ہو سکتا ہے۔

۱۔ مقرر کرتے ہیں ہم واسطے اس کے شیطان۔

۲۔ گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف سے اس کے حکم پر بلانے والا اور سورج منور ۳۔ اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل۔

۴۔ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾

(سوائے ان کے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے)

چنانچہ فرمایا ہے:

"وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ وَمَنْ یَحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی"

[طه: ۸۱]

"اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہوگیا۔"

تو مولیٰ کریم نے اپنے فضل سے بذریعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہماری نجات کیلئے شریعت غرا کے حدود مقرر فرما دیئے۔ اب ان سے تجاوز کرنا ہر قسم کی گمراہی کا باعث ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

"اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ"

[الجاثیه: ۲۳]

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے) تو خدا نے اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ تو خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے؟ بھلا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟"

چونکہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا [1] [الشمس: ۸] کے مطابق مولیٰ کریم نے ہر ایک انسان کو نیکی اور برائی کی سمجھ عطا فرمائی ہے اور اس کا ضمیر توفیق سرشتی کے طور پر اس کی طرف سے عطا ہے۔ اب باوجود علم کے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا، تو مولیٰ کریم نے از روئے غیرت اس کے کانوں اور دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ تو مطابق کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ

۱۔ الہام کر دیا اس کو گناہ اور ثواب۔

[۱][المطففین:۱۵] کے کَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ [۲][ایضاً:۱۶] کا مستحق ہوا جو حقیقت غضب ہے۔ اور توفیق اضافیہ کے تصرف سے مغضوب ہو کر ضَآلِّیۡنَ میں سے ہو گیا۔ اب جبکہ مولیٰ کریم نے ازروئے غیرت اس کو مغضوب قرار دے کر گمراہ کر دیا۔ تو اس کیلئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

تو اس رب العالمین اور رحمٰن و رحیم سے ہماری یہ دعا ہے کہ اے رب کریم! ہمیں اپنے غضب سے بچا کر اس گمراہی سے بچائے رکھیو۔ آمین!!

۱۔ ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان کی کمائیوں نے۔

۲۔ بے شک وہ اپنے رب سے اس دن حجاب میں ہوں گے۔

باب اول:

عالم ارواح

روح اور ماقبل روح

لغت کے لحاظ سے روح کسی چیز کے عطر یا لطیف جوہر کو کہا جاتا ہے۔لیکن یہاں انسان کے وجود کی حیاتی اور اصل سے عبارت ہے، جو تمام اثرات کا حامل، اپنی صفات میں کامل اور ابدی ہستی کا رکھنے والا ہے۔

اس کے بیان میں ازحد اختلاف ہے۔ایک گروہ کے نزدیک یہ قدیم ہے جس سے ان کی مراد ذات باری تعالیٰ ہے اور تغیر وتبدل، آمدورفت، حرکات وسکنات، موت وحیات اور فنا وبقا کو ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔یعنی ظہور کے میدان میں ہر طرح کی شکل اور صورت کے لباس میں ذات معلیٰ کو ملبوس سمجھتے ہیں۔حدث اور قدم کو نہیں پہچانتے اور قدم سے حدث کو نہیں جانتے۔جو شخص قدم سے حدث کو نہیں پہچانتا وہ اپنی گفتار میں جاہل ہوتا ہے۔اور یہ حلولیوں کا مذہب ہے جو سراسر باطل اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ہر طرح کا تصرف اس فاعل حقیقی کے سوا نہیں۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَایَشَآءُ"[الحج: ۱۸] "یقیناً اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

"اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ"[المائدہ: ۱] "اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔"

اور فرمایا:

"مَامِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا" ''کوئی چلنے پھرنے والی چیز ایسی نہیں ہے جس کی پیشانی کو اس نے پکڑ نہ رکھا ہو۔'' [ھود:٥٦]

فرق صرف یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے فعل سے ظہور تام ہے اور فعل تابع ارادہ، ماتحت صفت مرید، جو بالذات ہے۔ گویا فعل کو امر سے، اور امر کو صفت بالذات سے اور صفت بالذات کو ذات سے تعلق ہے۔ اور ذات پاک کیلئے تحریک حرام ہے۔ یعنی کسی قسم کا تغیر وتبدل روا نہیں ہے۔ عروج ونزول اور دخول وخروج سے مبرا ومنزا اور ہر قسم کے عوارضات سے پاک ہے: سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ١

ہر چند اس گروہ کی غلطی کے اسباب قوی ہیں اور وہ اس لئے کہ یہ خطا منقولی اور معقولی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ رویت کے میدان کا شجر ہے۔ بعض نے رویت کو پایا اور حال کے غلبہ سے عالم امر کی کیفیت کے مشاہد ہوئے اور ہر چیز خصوصاً متحرک ہستیوں کی حرکات وسکنات کا معائنہ کرنے سے ''ہمہ اوست'' کے میدان میں قدم زن ہو کر اپنے زعم میں حقیقت کو پہنچ گئے اور مدعی بن گئے۔ جاہلوں نے ان کی تقلید کی، حالانکہ حال کی تقلید حرام ہے۔

قاعدہ اور سنت اللہ ہے کہ جب انسان توفیق الٰہی سے سعی کرتا ہوا مطابق ارشاد: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا ٢ مجاہد ہوتا ہے تو از راہ فضل وکرم، ایزد متعال اس کو راستہ دکھاتے ہیں اور وہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ٣ کی سنت کے موافق حصول کی طرف قدم بڑھاتا ہے: فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ ٤ کے راستہ پر عالم موجودات، محسوسات اور معلومات سے گزرتا ہوا بساط معروفات کا مشاہد ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کی نظر میں عالم امر کا مشاہدہ بلا حجاب ہوتا ہے اور مذکورہ بالا باقی عالموں کے حجاب سے خلاصی پانے والا۔ اس کی نظر میں تمام حرکات وسکنات روح سے تعبیر ہوتی ہیں، بلکہ اس کے مشاہدہ میں غیر نہیں رہتا۔ تب وہ ''ہمہ اوست'' کا نعرہ بلند کرتا ہے اور یہی ان کی غلطی کا اصل ہے۔

١۔ پاک ہے اللہ اس چیز سے جو وہ اس کی صفتیں کرتے ہیں۔ ٢۔ جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی۔
٣۔ ان کو ہم ضرور اپنا راستہ دکھائیں گے۔ ٤۔ پس اللہ کی طرف دوڑو۔

بمصداق: ''گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی''۱ صحت حال کے رو سے تصرف اور ظہور ذات باری تعالیٰ یعنی توحید فی الخلق فاعل حقیقی کے فعل کے سوانہیں ہے۔اوپر گزر چکا ہے کہ فعل کو امر سے اور امر کو صفت بالذات سے اور صفت بالذات کو ذات سے تعلق ہے۔لیکن یادر ہے کہ یہ فعل مخلوق کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ صفت بالفعل کو صفت بالذات سے اور صفت بالذات کو ذات سے ایسا اتحاد ہے جس کی مثال ناممکن اور جس میں تمیز محال ہے،اوران مدارج ومعارج میں ایسی معیت خداوندی ہے جس کیلئے بعد وقرب کی عبارت لا حاصل ہے۔اسی وجہ سے حال کی رویت سے روح کو قدیم کہنے پر جرأت کی ہے اور یہ ان کا قول باطل ہے۔یہ سب کیفیات حال عالم امر یعنی معائنہ روح سے ہیں نہ کہ عین ذات سے۔اوروہ اس لئے کہ کسی قسم کی تحریک ذات کیلئے روانہیں ہے اور مشاہدہ ذات محویت تام سے عبارت ہے جس کیلئے میدان کلام میں زبان وبیان اور حروف والفاظ مفقود ہو جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ "اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ"یعنی روحیں جمع کئے گئے لشکر ہیں جو بحکم خدا آتے اور جاتے رہتے ہیں۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح کی نسبت سوال ہوا تو من اللہ وحی نازل ہوئی:

"قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِرَبِّیْ وَمَآاُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّاقَلِیْلًا"

''(اے میرے حبیب نبی کریم علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تم علم سے بہت کم حصہ دیئے گئے ہو۔''

[بنی اسرائیل:۸۵]

بحث وتنقید کے میدان میں اَمْرِرَبِّیْ کو غور وتعمق کے اوزان سے موازنہ کیا جائے تو کہنا ہی پڑے گا کہ مخلوق کا حکم اس کیلئے جائز نہیں ہوسکتا۔اوروہ اس لئے کہ مخلوق محدث ہے جو فَیَکُوْنَ کے ظہور کا نتیجہ ہے اور کُنْ امر جس سے فَیَکُوْنُ کا ظہور ہوا۔اور یہ صفت بالذات یعنی مرید سے وابستہ ہے۔اور صفات بالذات کو ذات سے ایسا اتحاد ہے جو نہ کبھی منفک ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔اس عبارت سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ نہ تو یہ قدیم ہے جس سے مراد ذات باری تعالیٰ ہوسکتی ہو،اور نہ ہی مخلوق،جس پر حدث کا وجود ملبوس

۱۔اگر تو نے حفظِ مراتب کا خیال نہ رکھا تو یہی زندیقی ہے۔

ہو۔لیکن اس جگہ روح کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا سوال ہے۔جس کا حل قرآن حکیم کی رو سے صاف عیاں ہے کہ خلق اور چیز ہے اور امر اور۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"اَلَالَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ"[الاعراف: ۵۴] ''خبردار! اسی کیلئے ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔''

میرا مذہب اس کتاب میں محض ''انسان فی القرآن'' ہے اسلئے اسی مسئلہ میں آیات بینات کی تطبیق اور موافقت کے بغیر چارہ نہیں اور نص قطعی کے مقابلہ میں سب دلائل ہیچ ہیں: لَارَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ اِلَّافِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۱ کی بساط پر: تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۲ کی وسعت اظہر من الشمس ہے: يَسَّرْنَاالْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۳ کے مطابق ادراک وفہم کی توفیق سے غور وفکر کے ترازو میں تحقیق کا طالب ہونا ضروری ہے۔انسان کی ابتداوانتہا، منازل ومدارج، عروج ونزول، ذات وصفات اور علم وعرف کے دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد کلام الٰہی کے ساحل پر استقامت حاصل کرنا چاہئے تاکہ تمام مشکلات کا حل آسانی سے ہوسکے اور انسانی شجر کی جڑ سے لے کر تنے، ٹہنیوں، برگوں اور پھول وپھل تک کا علم اور "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْعَرَفَ رَبَّهٗ" ۴ کی ایک جز سے عرف حاصل ہو۔

عزیز! جان کہ انسان قبل از ظہور جب کہ عالم شہود بلکہ عالم امر سے یعنی عالم ارواح سے بھی کوئی نشان نہ تھا، مطلق عدم تھا لیکن متحقق بالذات اور علم الٰہی کے بے کنارہ دریا میں مستغرق تھا۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِلَمْ يَكُنْ شَيْئًامَّذْكُوْرًا" [الدھر: ۱] ''بے شک انسان پر زمانے میں سے ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ یہ کوئی چیز ذکر کے قابل نہ تھا۔''

اس سے صاف عیاں ہے کہ انسان پر ایک وقت تھا جو قابل ذکر نہیں ہے۔لیکن اثبات انسان

۱۔ کوئی تر اور خشک نہیں مگر کتاب بیان کرنے والی میں ہے۔ ۲۔ ہر چیز کی تفصیل ہے۔

۳۔ اور بے شک ہم نے آسان کیا قرآن یاد کرنے کیلئے، تو ہے کوئی یاد کرنے والا۔

۴۔ جس نے پہچانا اپنے نفس کو بے شک پہچانا اپنے رب کو۔

میں کوئی کلام نہیں اور عَلٰی اس امر پر دال ہے کہ انسان تو تھا لیکن وہ حالت انسان تحریر وتقریر سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام عدم نہیں بلکہ مقام اثبات ہے۔ انسان تو درکنار ہر چیز متحقق بالذات ہونے کی صورت میں معدوم نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ جب مولیٰ کریم نے ہر چیز خصوصاً انسان کے ظہور کا ارادہ فرمایا اور کُــنْ سے فَيَكُوْنُ کا لباس پہنا دیا تو اس کیفیت کو یوں فرمایا:

"اِنَّمَـا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْـئًـا اَنْ يَّقُوْلَ لَـهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" [یٰسٓ: ۸۲]

''سوائے اس کے نہیں کہ حکم اس کا جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے کہا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔''

لَهٗ کی ضمیر اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر چیز علم خداوندی میں موجود تھی اور یہ امر کن اسی کی طرف ظہور کیلئے صادر ہوا تو عالم ارواح میں ہویدا ہو گئے۔ یہ دوسرا مقام انسان ہے۔ اب یہ ذکر کے قابل ہو گیا۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَمَـا لَـكُـمْ لَا تُـؤْمِـنُـوْنَ بِـاللّٰـهِ وَالـرَّسُوْلُ يَـدْعُـوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" [الحدید: ۸]

''اور کیا ہے تمہیں کہ نہ ایمان لاؤ ساتھ اللہ کے اور رسول پکارتا ہے تم کو تا کہ ایمان لاؤ تم ساتھ رب اپنے کے، اور یقیناً وہ عہد لے چکا ہے تم سے، اگر تم باور کرنے والے ہو۔''

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" [آل عمران: ۸۱]

''اور جب اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے عہد لیا۔

یہ میثاق عامۃ الناس اور انبیاء علیہم السلام دونوں کیلئے الگ الگ وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل اس جگہ مقصود نہیں۔

اس کے بعد شہود میں ظہور کا وقت آیا تو فرمان ہوا: اِنِّـىْ خَـالِـقٌ بَشَـرًا مِّنْ طِيْنٍ [1] [الزمر: ۷۱]

۱۔ میں مٹی سے ایک ڈھانچہ (مجسمہ) بنانے والا ہوں۔

پھراس کے بعد آدم اور بنی آدم (علیہ السلام) کے ناموں سے خطاب فرمایا۔ پھر روح سے اور کبھی ناس اور کبھی رجل وغیرہم اسماء سے موسوم کیا۔ غرض اس بات سے یہ ہے کہ قبل ازظہوراور بعدازظہور یہ لفظ ''انسان''، منقطع نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہنا ہی پڑے گا کہ انسان کا ذاتی نام ''انسان'' کے سوانہیں۔ باقی سب اسماء صفاتی ہیں۔ متحقق بالذات ہونے کی صورت میں بھی اور عالم ارواح میں بھی ''انسان'' کے اسم سے موسوم ہوا۔ اور بعض پاک ہستیوں کواپنے فضل وکرم سے منتخب کر کے انبیاء ومرسلین کی صفت سے مزین فرمادیا۔ تو یہ امراس پر دال ہے کہ پیغمبراور مرسل ازلی ہیں۔ آج جیسا کہ ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ مجاہدہ سے یہ درجہ حاصل ہوسکتا ہے، باطل ہے۔

امابعد! حضرت انسان عالم شہود یا میدان دنیا میں آکر کئی صفات سے موصوف ہوااور جس صفت میں مستغرق ہوااسی وصف میں نامزد ہوگیا۔ مثلاً مومن، مسلم، منافق، فاسق، کافر، مشرک، رجل، عبد، جاہل، عالم وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ سوائے انسان کے سب کے سب نام صفاتی ہیں اور تمام مدارج ومنازل میں ذاتی اسم (انسان) لازم ہے۔ صرف روح میں اختلاف ہے اور وہ اس لئے کہ جب بت یا بشر بے روح کے مقابلے میں معاملہ درپیش ہوا تو روح کے نام سے موسوم کردیا اور موزوں بھی یہی تھا۔ ورنہ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي [الزمر: ۷۲] کے سوا وجود انسانی خواہ نوری جامہ میں بیان کیا جاتا، عوام کو بے حد مشکل واقع ہوتی، اس عزیز الحکیم نے اسی سبب سے روح ہی کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ اس صورت میں عوام کے نزدیک خواہ مسلم ہو یا کافر، بت بے جان میں روح کے داخل ہونے اور بوقت انتقال خارج ہونے میں کوئی مشکل وارد نہیں ہوتی ہے۔

مقام غور وفکر ہے کہ قبل ازظہور یعنی عالم ارواح میں تو انسان ہی کے اسم سے موسوم ہے، لیکن بشریت یا بت مردہ کے مقابلہ میں روح، اور بعدہ پھر انسان، تو اس سے کون سے معانی دریافت کے میدان میں حاصل ہوسکتے ہیں کہ قبل از بت بے روح اور بعدازظہور تو انسان ہی کہلائے، اور اس موقع پر روح سے

۱۔ پھونکا میں نے اس میں اپنی روح کو۔

تبدیل ہو جائے؟ تو کہنا ہی پڑے گا کہ صفات اور حالات کے تغیر و تبدل کی رو سے یہ سب کے سب نام صفاتی ہیں۔

دیکھئے! جب حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کا (جو معبود حقیقی کے بندے ہیں) حضرت مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہونے کا موقع آیا، تو فرمایا نَفَخۡنَا فِیۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا [۱] گویا حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کو رُوۡحَنَا سے موسوم کیا۔ اور ان مدارج انسانیہ میں ابتداء سے انتہا تک انسان ہی ثابت ہو رہا ہے، اور انسان سراسر مخلوق ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ" [التین: ۴، ۵]	"بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو بہت اچھی ترکیب کے۔ پھر پھیر دیا ہم نے اس کو نیچے سب نیچوں کے۔"

تو بالکل عیاں ہے کہ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ اور اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ ہر دو حالت میں خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ یعنی خلقت کیا انسان کو ارشاد ہو رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ یعنی روح میرے رب کے امر "سے" ہے نہ کہ عین امر، تو ان مدارج و منازل میں اس کا آنا اور واپس جانا خداوند کریم کے امر یعنی حکم سے ہے۔ ان سندات کے لحاظ سے انسان مخلوق ہے۔ اور روح صرف ایک اسم گرامی ہے جو بت میں داخل ہونے کی موزونیت کے لحاظ سے نامزد ہوا ہے جس کی تصدیق و تطبیق کلام الٰہی سے ہو چکی ہے اور یہ اختلاف محض اسی عارضہ کی وجہ پر ہے۔

سوال:

اس میں کلام نہیں کہ انسان جس کی حد ظہور کے میدان تک ہے، مخلوق کا حکم رکھتا ہے، یعنی عالم شہود اور عالم ارواح میں نص قطعی سے ثابت ہے۔ لیکن قبل ازیں متحقق بالذات ہونے کی حالت میں جبکہ وجود خارجی تو درکنار، وجود روحی بلکہ وجود لفظی اور ذہنی سے بھی مبرا و منزہ تھا۔ محض علم خداوندی کے دریا میں

۱۔ پھونکا ہم نے اس میں اپنی روح کو۔

ارادہ ازلی کی لہروں کے سوا کوئی وجود نہ رکھتا تھا، بلکہ امر الٰہی بھی صفت بالذات ''مرید'' کے نہانی حجرہ میں پوشیدہ تھا اور ظہور کا میدان سراسر خالی تھا۔ گویا حقیقت انسانی صفت بالذات کے ارادہ اور امر کے ایما کی محتاج تھی، جس کیلئے ارشاد ذوالجلال والاکرام ہے کہ وہ ذکر کے قابل نہ تھا۔ صرف نام تھا جس کی حقیقت سوائے علیم وحکیم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ جو کچھ قدس کے پردوں میں پوشیدہ تھا۔ اب نور ایمانی کی قوت سے معلوم کرنا چاہئے کہ جب وجود لفظی اور ذہنی بھی نہ تھا۔ بلکہ امر الٰہی کا ظہور بھی مشیت ایزد متعال ذوالجلال والاکرام کا منتظر تھا۔ مطابق کلام الٰہی ذکر کس کا اور کہاں اور کس طرح؟ سوائے اس کے کہ یہ اسرار الٰہیہ سے ایک سر انسان محقق بالذات ہونے کی صورت میں پنہاں تھا، تحریر وتقریر سے باہر ہے۔ تو معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے وقت میں انسان کو کس نام سے یا کس وصف سے جاننا چاہئے؟

جواب:

اوپر گزر چکا ہے کہ روح اور بشر وغیرہ سب نام انسان کے صفاتی اسماء ہیں۔ کلام الٰہی شاہد ہے کہ کبھی تو انسان کو روح کے نام سے اور کبھی بشر اور کسی جگہ عبداللہ یا عبادی اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مناسبت کی رو سے بنی آدم کا خطاب صادر ہو رہا ہے جو خالی از حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ علیم وبصیر کے مشاہدہ سے نشان ہے۔ اسی وجہ سے نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ کا ارشاد ہوا یعنی پھونک دی اس میں اپنی روح۔ دوسری جگہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کا فرمان اظہر من الشمس ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولیٰ کریم نے اپنے امر سے روح کو بشر میں پھونک دیا۔ دراصل انسان جو اس صفت عظیمہ کا مرکز تھا، داخل کیا گیا۔ جس کی کسی قدر تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ جنہوں نے قدم کو حدث سے الگ دریافت نہ کیا انہوں نے روح سے مراد ذات باری تعالیٰ ہی لے لی اور امر وذات میں فرق نہ کرنے کے سبب جاہل ہو گئے۔ حلولیوں کی غلطی کے اسباب یہی ہیں جو سر تا پا بے اصل ہیں اور وہ اس لئے کہ امر کو صفت بالذات سے اور صفت بالذات کو ذات سے تعلق ہے۔ اور انہوں نے کئی وجہ سے عبارت کو بدلا ہے اور اپنی ضلالت کو کئی معنوں میں حلول ذات سے تعبیر کیا ہے جس میں بہت طول ہے جو اس جگہ مقصود نہیں ہے۔

جواب ان کا یہ ہے کہ اس ذات باری تعالیٰ نے اپنے بندے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

ضمیر مبارک میں اپنے اذن کا اجرار کھا ہے۔ گویا فاعل حقیقی نے اپنے فعل کو اعجاز کی بساط پر اپنے بندے کی طرف منسوب فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَیۡـئَةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ" [آل عمران: ۴۹]

"یہ کہ پیدا کرتا ہوں میں تمہارے لئے مٹی سے مانند صورت پرندے کے پھر پھونکتا ہوں میں اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے۔ اور چنگا کرتا ہوں میں مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو ساتھ اذن اللہ کے۔"

یعنی مردے کو زندہ کرنے، مادرزاد اندھے کو اچھا کرنے، کوڑھی کو تندرست بنا دینے اور مٹی کا جانور بنا کر اس میں روح کو پھونک دینے کی قدرت عنایت فرمائی۔ (ایک گروہ نے ان سب معجزات کی تاویل اپنی جہالت اور بیہودگی پر کی ہے لیکن مٹی کا پرندہ بنا کر اور اس میں پھونک مار کر سچ مچ کا پرندہ بنا دینے سے وہ بھی دم بخود اور مبہوت رہ گئے۔)

مقصود اس جگہ صرف یہ ہے کہ اگر بت میں روح پھونکنے سے حلول ہو سکتا تو چاہئے تھا کہ ایک جانور میں حضرت عیسیٰ روح اللہ حلول کر جاتے۔ اور یہ محال ہے۔ کیونکہ وہ اپنی جگہ قائم رہے اور جانوروں کو بدستور زندہ کرتے اور مردہ میں زندگی کو ودیعت فرماتے رہے۔ صحت حال کی رو سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہئے کہ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے اذن یعنی امر کو اپنے بندے حضرت عیسیٰ روح اللہ کے ضمیر مبارک میں اجرار کھ کر ہر فعل میں بتکرار بِاِذْنِ اللّٰهِ [۱] یا بِاِذْنِیْ [۲] کو لازم رکھا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ روح کا اجرا خواہ با مشیت ایزد متعال کسی بندے کے ضمیر سے ہو یا بلاتوسل، اس کے امر کے ماتحت ہی ہے۔ اور سوائے اس کے کوئی صورت کلام الٰہی سے ثابت نہیں ہو سکتی۔

حاصل اس کلام سے (مطابق کلام اللہ مدارج ومنازل انسان کے رو سے) یہ ہوا کہ یہ حضرت

۱۔ اللہ کی اجازت سے۔ ۲۔ میری اجازت سے۔

انسان جس جگہ یا جس مقام پر مقیم ہو، مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ خواہ وہ سری وجود میں مخفی ہو یا روحی لباس میں ملبوس، اور خواہ ظاہری وجود میں عالم شہود کا شجر ہو، بہر حال نص قطعی سے مخلوق ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور صحت حال کی وجہ سے تحقیق کی بساط پر سوائے اس کے کوئی عبارت درست نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہر حالت میں انسان کی نفی کہیں پائی نہیں جاتی جو سراسر حقیقت انسان پر دال ہے اور منازل و مراتب کی رو سے ہر وصف میں موصوف اور اسی کے مطابق ہر اسم سے موسوم ہے، جیسا اوپر گزر چکا ہے اور دوبارہ بیان لاحاصل ہے۔ صرف اتنا لازم ہے کہ اس علیم وحکیم نے اپنے کلام کی شان کے مطابق اصول نزول کو ہمارے حال پر شان نزول کو ہمارے افعال پر مبنی رکھا ہے۔ اسی لئے انسان کو کبھی اعلیٰ اور کبھی اسفل حالت سے بیان فرمایا ہے، مثلاً: نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي [1] اور نَفَخْنَا رُوْحَنَا [2] و مثلها انسان کے وجود روحی یا نوری سے عبارت ہے۔ اور دوسری صورت میں بَشَرًا سَوِيًّا [3]، بَشَرًا رَّسُوْلًا [4] اور اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ [5] وغیرہم زمین کے میدان کا شکر ہے، جو سراسر اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ [6] کے موافق ہے، اور اَحْسَنَ تَقْوِيْمٍ [7] پہلی حالت کے مطابق۔ پس اس عبارت سے یہ مقصود حاصل ہوا کہ یہ مدارج و منازل انسان کی حالت کے رو سے ہویدا ہیں اور ان دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روح جو ایک مقام کی حیثیت سے انسان کا نام ہے، سراسر مخلوق ہے۔ رہا امر، جو غیر مخلوق ہے وہ روح سے الگ ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ" [السجدہ: ۹]

''پھر تندرست کیا اس کو اور پھونکا بیچ اس کے روح اپنی سے اور کیا واسطے تمہارے سننا اور دیکھنا اور دل تھوڑے ہیں جو شکر کرتے ہیں۔''

صاف عیاں ہے کہ امر اور خلق دو چیزیں ہیں۔ امر ہر چند خلقت کیا گیا نہیں ہے۔ کیونکہ امر کی نسبت آمر سے وابستہ ہے اور تخلیق کے میدان میں مخلوق کی طرف ہے۔ یعنی جب آمر کا ارادہ ہوا تو امر صادر فرما

۱۔ پھونکا میں نے اس میں اپنی روح کو۔ ۲۔ پھونکی ہم نے روح اپنی۔ ۳۔ تندرست آدمی (انسان)۔
٤۔ آدمی رسول۔ ٥۔ بے شک میں مٹی سے ایک ڈھانچہ (مجسمہ) بنانے والا ہوں۔
٦۔ نیچی سے نیچی حالت۔ ۷۔ اچھی صورت۔

دیااور کُنْ سے فَیَکُوْنُ کا ظہور ہو گیا۔مخلوق کے لئے تغیر کامحل روا ہوسکتا ہے لیکن امر کیلئے کسی قسم کا تغیر جائز نہیں ہے۔اور ارواح کی نقل وحرکت، آمدورفت اور عروج ونزول شواہدات عقلی ونقلی سے مسلم ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔اور اس مضمون کے شروع ہی میں ایک حدیث شریف بطور استشہاد درج ہو چکی ہے، دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔اس لئے کہنا ہی پڑے گا کہ روح مخلوق اور امر سراسر غیر مخلوق ہے۔ دیکھئے! دوسری جگہ کیا ہی مفصل ارشاد ہو رہا ہے:

"آلَالَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ"[الاعراف:۵۴] ''خبردار! اسی کیلئے ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔''

جاننا چاہئے کہ ہر دو حالت انسان میں خلقت کا لفظ مستعمل ہے، اول از خاک آخر از نطفہ۔ پھر روح کے داخل ہونے کا ارشاد ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ مخلوق کا لفظ بشریت کیلئے صادر ہوا ہے اور روح کیلئے کہیں خلقت کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔جس سے مخلوق کا حکم روح کیلئے روا نہیں ہوسکتا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ انسان کا نام روح، بت میں داخل ہونے کے وقت رکھا گیا ہے۔ورنہ قبل ازیں انسان ہی کے اسم گرامی سے موسوم ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔میثاق عوام اور خواص یعنی انبیاء کرام اظہر من الشمس ہے جو اس مشکل کو حل کرنے کیلئے کافی ہے۔اور صاف عیاں ہے کہ قبل از بشریت یعنی ڈھانچہ بے روح قرآن شریف سے انسان مکمل ثابت ہے، اور بعدہ عالم شہود میں بھی انسان ہی ہے۔تو سمجھ نہیں آتی کہ بت میں داخل ہونے اور نوری وجود کو خاکی پتلا میں ودیعت فرمانے کے سوا کوئی عبارت ان معانی میں درست ہوسکے۔تو کہنا پڑے گا کہ یہ حضرت انسان کا نام بت کے مقابلہ میں روح سے موسوم کیا گیا ہے۔ورنہ روح اور انسان میں سوائے بشریت کے کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔یعنی باروح انسان اور بے روح مردہ۔

عزیز! سمجھ کہ نافہمی کی بنا پر روح میں اختلاف واقع ہے، ورنہ معاملہ بالکل صاف ہے، محققین کے نزدیک انسان کے چار وجود ہیں: [۱] بشری [۲] ملکی [۳] روحی اور [۴] سری۔بشری؛ موجودات یعنی عالم دنیا میں۔ملکی؛ محسوسات، عالم برزخ۔روحی؛ معلومات، عالم ارواح، جس کا عرف عالم امر سے مناسبت رکھتا ہے۔اور سری؛ معروفات سے ہے۔ملکی اور روحی دراصل ایک ہی دریا کے حباب ہیں۔لیکن سری میں

نہ تحریر ہے نہ تقریر، نہ زبان ہے نہ کلام۔ سوائے اس کے کہ سرستر سے عبارت ہے، جس کو خالق موجودات، مالک کائنات نے مخفی رکھا ہے اور فرمایا کہ یہ حالت انسانیہ ذکر کے قابل نہیں۔ بمصداق:

"هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا"[الدھر:۱]

''بے شک انسان پر ایک زمانہ وہ گزرا کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی۔

تاہم انسان کی نفی نہیں ہوئی۔ اور وہ اس لئے کہ عَلَی الْاِنْسَانِ یعنی ''انسان پر'' ہی فرمایا ہے۔ اب اس کو روح کہیں یا سر، سوائے اس کے علم کے میدان میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ محض خداوندی علم کے پردوں میں راز مخفی ہے۔ عارف باللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔ تاہم اس کا اظہار جرم ہے۔ مطابق حدیث شریف: "اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ وَاَنَا سِرُّهٗ" [۱] اور فرمایا: وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا [۲]

☆☆☆

۱۔ انسان میرا بھید ہے اور میں اس کا بھید ہوں۔

۲۔ اور نہیں دیئے گئے تم علم سے مگر بہت تھوڑا۔

باب دوم:

ابتدائے آفرینش

حمد:

"یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ
الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ الْعَزِیْزُالْحَکِیْمُ"[1]

حمد کس سے ہو سکے تیری خدا!
جبکہ تیری حمد ہے سب برملا

پھر حمد کس سے اور کون محمود، عبادت کس اور کون معبود، عرف کس کا اور کون عارف، وصف کس سے اور کون موصوف، نہ اس کا حصر نہ اس کی حد اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ[2] ایک خالق ایک مخلوق۔ حدث سے قدم کی تعریف محال، لم یزل ولا یزال۔ قلم، سیاہی، کاغذ، کاتب، کلام وزبان، سب حدث۔ نہ اس کی تعریف کیلئے حرف نہ وجود، لامحدود، نہ جوہر نہ عرض: اَللّٰہُ نُوْرُالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[3]

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہو گا تو خدا ہوگا

۱۔ اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے بادشاہ کمال پاکی والا، عزت والا، حکمت والا۔ ۲۔ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ ۳۔ اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

تخلیق انسان:

اس ذات بے چون نے اپنی صفات ذاتیہ سے اپنے ظہور کا ارادہ کیا تو اپنے نور معلیٰ سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور عالم ارواح میں ظاہر فرمایا۔ گویا امر کُنْ سے فَیَکُوْنُ کے فعل کو صادر کیا اور اپنی صفت ربوبیت سے سید المرسلین، خاتم النبیین، آخر آمد بود فخر الاولین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمۃ اللعالمین کی صفت پر مبعوث کر کے خاص کیا اور اس نعمت بے بہا کا خاک کے پردہ میں ظہور فرمایا۔ جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ o ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ o ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"

[المؤمنون: ۱۲ تا ۱۴]

"اور بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے۔ پھر پیدا کیا ہم نے اس کو ایک قطرہ منی کا بیچ جگہ مضبوط کے۔ پھر پیدا کیا ہم نے منی کو لہو جما ہوا۔ پس پیدا کیا ہم نے لہو جمے ہوئے کو بوٹی گوشت کی۔ پس پیدا کیا ہم نے بوٹی کو ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہم نے ہڈیوں کو گوشت، پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش دوسری پس بہت برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے"

اس خالق یکتا نے انسان کی تخلیق کو اول از خاک اور آخر از نطفہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ تو جب خلقت اول کا ارادہ ہوا تو ارشاد کیا:

"اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ o فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ o فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ o اِلَّا اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ"

"جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ بے شک میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پس جس وقت میں اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کیلئے سجدے میں گر پڑو۔ تو سب فرشتوں نے سجدہ

[الزمر: ۷۱تا۷۴] کیا۔ مگر ابلیس نے تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔"

لغت میں بشر کا ترجمہ ردی الخلائق چمڑا یا ڈھانچہ ہے۔ تو جب سڑی ہوئی مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کا بت تیار کیا گیا اور صحیح صورت بنا کر اس میں اپنی روح پھونک دی تو حسب الحکم سب ملائکہ سجدے میں گر گئے مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا اور جوں کا توں اکڑا بیٹھا رہا۔

"قَالَ يَآاِبْلِيْسُ مَامَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ"
[الزمر: ۷۵]

"فرمایا اے ابلیس تجھے چیز نے روکا کہ تو اس کیلئے سجدہ نہ کرے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا کیا تجھے غرور آ گیا یا تو تھا ہی مغروروں میں سے۔"

افسوس! معلم الملکوت نے جب اپنی طرف رعونت اور تکبر کی نظر سے دیکھا تو ایک ہی قدم میں لعنت کے گڑھے میں گر گیا اور اس کی محدود نظر نے اسے عجیب دھوکا دیا۔ یعنی اس کی دانش جو ہر کو چھوڑ کر محض عرض پر رہ گئی۔ ورنہ یہ اختلاف کیوں ہوتا؟

یہ لفظ انسان کسی حال میں اور کسی تغیر سے منقطع نہیں رہا۔ اس لئے انسان کے بیان اور عرف میں بے حد اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک صفات حیوانیہ (جو انسان میں پائی جاتی ہیں) کا نام انسان ہے، تو یہ سب حیوانات میں موجود ہیں۔ رہا عقل و دانش کا فرق، تو بے وقوف اور اندھا، گونگا، بہرا ہونے سے بھی انسان کی نفی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ لفظ مردہ انسان سے بھی نہیں اٹھ سکتا۔

ایک گروہ کے نزدیک یہ وجود انسان ایک جامہ انسان ہے، اور انسان ایک سر الٰہی ہے۔ گو کسی حد تک یہ قابل اعتنا ہے۔ لیکن فاسق کافر، منافق اور جاہل بھی انسان ہیں، جن میں سر سے کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ انسان ہونے میں سب مشترک ہیں۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ ابتدا سے انتہا تک تمام علوم کے حصول کا مرکز یہی وجود ہے۔ اور اس وجود میں انسان کے نزدیک فرمانے کا مقصود و مدعا یہی ہے کہ اول سے آخر تک کے علم سے عالم اور عارف ہو کر اپنے

آپ کو پہچانے، تاکہ اپنے پروردگار کا عرف حاصل ہو اور معلوم کرے کہ اس رب العالمین نے مجھے پیدا کیا ہے اور کس لئے پیدا کیا ہے۔

انسان کا وجود تمام صفات حیوانیہ اور روحانیہ کا جامع ہے۔ صفات حیوانیہ اس کی نسل کو قائم رکھنے کیلئے اور صفات روحانیہ اس کے کامل ہونے کیلئے۔ جو انسان صرف صفات حیوانیہ پر رہ جاتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی قوتوں (سماعت و بصارت اور دل) سے کام نہیں لیتے ان کو حیوان بلکہ ان سے بھی گمراہ تر فرمایا ہے:

"اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" [الاعراف: ۱۷۹]

''وہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔''

کیونکہ وہ اصل مقصود سے دور اور اپنے علم سے جاہل ہوتے ہیں۔ پس جو اپنے آپ سے جاہل ہو وہ اپنے غیر سے اجہل (جاہل تر) ہوتا ہے۔

معیت روح:

باب اول میں روح کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم اس کے جگر میں ہنوز تشنگی باقی ہے جس کو سیراب کرنا ازبس ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ انسان کی تمام حالتوں کا اصل روح ہی ہے۔ سب حیاتی اسی سے ہے اور تمام حالتوں کا مرجع اسی کی طرف ہے۔ یہ خارجی وجود موجودات سے ہے اور ذہنی وجود محسوسات سے۔ اس کا تعلق روح سے اور یہ معلومات سے ہے۔ جیسے کسی پھل مثلاً بادام کو لیجئے۔ اس کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے۔ جب پختہ ہونے کے بعد درخت سے جھڑتا ہے یعنی مدت شجری ختم ہونے کے بعد اس سے الگ ہوتا ہے تو وہ چھلکا اتر جاتا ہے، جس کے اتر جانے سے سفید دو کاشیں ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کاشوں کے درمیان ایک سرے پر لطیف اور صغیر الوجود مغز بادام کی پیدائش کا سامان ہوتا ہے اور اس میں روح بادام ہوا کرتا ہے جو اصل اور حیاتی بادام ہے اور یہ ایک امر الٰہی اور شان ایزدی ہے جو معیت خداوندی سے متعلق ہے۔ اور ہر چیز کی پیدائش اس کے حکم سے ہے اور اس کا ثبات اور فنا خداوند کریم کا فعل ہے۔ لیکن ہمارے امر و فعل کی طرح نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

"وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا"[النساء:۴۷] ''اور خدا نے جو حکم فرمایا سو ہو چکا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" ''اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ [یٰس:۸۲]

مولیٰ کریم کا ارادہ تو حقیقت میں کُــنْ کا بھی محتاج نہیں۔ محض ہماری تفہیم کیلئے الفاظ کی قید رکھی گئی ہے۔ خداوند کریم مرید ہیں۔ امر وفعل تابع ارادہ ہیں۔ تو جب ارادہ ہوا ہو گیا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد اب اصل مضمون یعنی روح کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے: وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ!!

کیونکہ یہ ہستی اور حیاتی کا اصل ہے اور ہر طرح کے جسدی وعنصری وجود کا قیام وثبات اسی کے ساتھ ہے۔ اس کا علم سوائے حال کے درست نہیں ہو سکتا اور حال کو قال میں لانا دشوار ہے مگر بہت کم۔ اس لئے اگر روح کو مخلوق کہا جائے تو کس طرح؟ اور قدیم کہا جائے تو کیسے؟ کیونکہ قدیم تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔

جس طرح قرآن مجید کے، مخلوق اور غیر مخلوق ہونے میں اختلاف واقع ہوا اور عاقبت نا اندیش عالموں نے اس کو مخلوق کہہ کر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے مباحثے کئے اور حکام وقت سے کوڑے لگوائے گئے، ایسا ہی یہ اشکال ہے۔ کیونکہ جیسے کلام ایک صفت بالذات مولیٰ کریم ہے اسی طرح امر بھی ہے اور مخلوق کا جامہ اس پر درست نہیں آ سکتا ہے۔ کیونکہ مخلوق وہ ہے جو کُنْ سے فَيَكُوْن کا لباس پہنے اور حدث کا وجود اس پر ثابت ہو جائے اور یہ بالفعل صفت مولیٰ کریم ہے جو حکم خداوندی سے مفعول ہے۔

حضرت علی ہجویری لاہوری قدس سرہٗ کا فرمان مبارک کہ: ''روح مخلوق ہے اور یہ فعل خداوندی ہے۔''[۱] بجا و درست ہے۔ اور وہ اس طرح پر ہے کہ مخلوق میں روح کا تصرف فعل خداوندی کے سوا نہیں ہے۔ اس امر یعنی کُنْ (ہو جا) کا ظہور فَيَكُوْن (پس ہو گیا) کے مترادف ہے۔ اس لئے مخلوق میں

۱۔ بحوالہ ''کشف المحجوب''

روح کا تصرف بحکم خدا اپنے محل و مقام کی رو سے مخلوق کا حکم رکھتا ہے، اور متحقق بالذات ہونے کی رو سے غیر مخلوق۔ یعنی کُنْ صفت بالذات اور فَیَکُوْنُ صفت بالفعل۔ اور امر ایک صفت ہے جو قدیم ہے کیونکہ امر خواہ صادر ہو یا نہ ہو، امر کی نفی نہیں ہو سکتی۔ جیسے: حی، کلیم، سمیع، بصیر، علیم، مرید، قدیر۔

اور جو حضرت شیخ المشائخ علی ہجویری قدس سرہٗ نے روحیوں اور حلولیوں کے قول کو باطل کہا ہے، بہت درست فرمایا ہے۔ کیونکہ انہوں نے روح کو قدیم کہا ہے جس سے ان کی مراد خود ذات مولیٰ کریم ہے اور حکم ان کا اسی پر ہے کہ یہ حرکات و سکنات سب کی ہیں۔ اگر کہا جائے کہ: ''اسی کے حکم یعنی امر سے ہیں۔'' تو اختلاف اٹھ جاتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ہر انسان کی چوٹی ید قدرت میں ہے: مَامِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِهَا [۱] اور جانور پر پھیلائے ہوئے کو، ذات باری تعالیٰ ہی تھامے ہوئے ہے:

''اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ'' [الملک:۱۹]	''اور کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندے نہ دیکھے؟ پر پھیلاتے اور سمیٹتے۔ انہیں کوئی نہیں روکتا سوائے رحمٰن کے۔ بے شک وہ ہر ایک چیز کو دیکھتا ہے۔''

علمائے ظاہر اس بات پر ہیں کہ: ''احاطہ اور فعل اور حفاظت یہ سب کچھ علم سے ہے۔'' اور یہ خطا ہے۔ کیونکہ علم سے احاطہ بالذات روا ہو سکتا ہے۔ لیکن علم کا احاطہ بدوں ذات محال ہے اور یہ معیت خداوندی ہے جس کے علم اور معرفت کی مثال اندھوں کے ہاتھی کی سی ہے۔ اس لئے ہر ایک نے اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق بیان کیا ہے اور وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے حق پر ہے۔ لیکن محققین کا کلام اصح اور جامع ہے جن کو فضل ایزدی نے علم لدن سے نوازا ہے۔ یہاں عقل و دانش عام کا تو کچھ کام ہی نہیں۔

عاجز قیاس ہے یہاں وہم و خیال سے
نسبت کیا ہے ہمسری پتھر کو لال سے

۱۔ کوئی چلنے والا نہیں جس کی چوٹی اس کے قبضہ قدرت میں نہ ہو۔

خداوندتعالیٰ نے انسان کواپنی سرشت پر یعنی اپنی صفت پر پیدا کیا ہے اوراس محدث وجودکواپنی صفت کامحل بنایا ہے۔گو یہ محال ہے کہ محدث قدیم کامحل ہو،لیکن یہ اس امر کامنافی نہیں ہے کہ اس کی تعریف اورصفت نہ ہو۔ بلکہ کل مخلوق، خالق کی صفت اورتعریف ہے اورسب کی ہستی مولیٰ کریم ہی سے ہے۔اور انسان کواس صفت سے خاص کیا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ذات قدیم کیلئے نہ کوئی محل ہے نہ مکان،اس لئے محال ہے کہ محدث اس کامحل ہو۔لیکن خالقیت کی تعریف کے ضمن میں کل مخلوق صفتِ خالق کاظہور ہے جو صفت بالفعل کے مترادت کے میدان میں نصِ قطعی سے کُنْ یعنی امرہونے کی صورت میں نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ ۱؎ کا اطلاق غیرمخلوق پر دال ہے۔مشیت ایزدمتعال نے اپنی سرشت پر روح کوبشریت کے پردے میں ودیعت فرمایا ہے اورانسان کواس صفت میں خاص کیا ہے۔جیسا کہ فرمایا:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَالنَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ o مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْامِنَ الْمُشْرِكِيْنَ"

[الروم: ۳۰، ۳۱]

''اللہ کی فطرت وہی ہے جس پراس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔خدا کی بنائی ہوئی میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔یہی سیدھادین ہے لیکن اکثرلوگ نہیں جانتے۔اسی کی طرف رجوع کئے رہواور اس سے ڈرتے رہواورنماز پڑھتے رہواور مشرکوں میں سے مت ہوجیو۔''

انسان کومولیٰ کریم نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے،نہ تبدیل ہوگی کبھی یہ سرشت۔(مفسرین اس بات پر ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تواسلام پر یعنی ہر بنی آدم کی فطرت انسانیہ اسلام پر ہوئی،خواہ بعدمیں ماں باپ اسے یہودی بنالیں یانصاریٰ یا مجوسی۔لیکن اس صورت میں لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ کامفہوم غلط ثابت ہوتا ہے۔حدیث شریف کاثبوت دیا ہے جواپنے محل پر صحیح اوردرست ہے اورحدیث شریف میں بھی فطرت ہی کالفظ آیا ہے۔مفہوی غلطی کی وجہ سے فطرت کاترجمہ اسلام کردیا ہے)

۱۔پھونکا میں نے اس میں اپنی روح سے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ" ''اللہ تعالٰی نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔''

رب قدوس صورتوں اور شکلوں سے پاک ہے اس لئے اس سے مراد محض صفت اور سرشت ہی ہے اور مولٰی کریم کی صفات ذاتیہ سات ہیں:

(۱) قدیر (۲) حی (۳) مرید (۴) سمیع (۵) بصیر (۶) علیم (۷) کلیم۔

تو ان ہی صفات سے انسان کو مزین فرمایا ہے اور اسی کو دین قیم اور سیدھا راستہ بتلایا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر سیدھا راستہ نہیں پا سکتے۔ چنانچہ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ''اگر تو چاہے کہ مولٰی کریم کا رستہ پائے تو زمین و آسمان میں نہ ملے گا اپنے دل کے گرد پھر، پالے گا۔'' اگر منظور خدا ہوا تو اپنے موقع پر مفصل بیان ہوگا۔ اب اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں، تاکہ طوالت باعث ملالت نہ ہو۔ حدیث شریف یہ ہے:

"كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَتِ وَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ اَوْيُمَجِّسَانِهٖ" ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اسے یہودی اور نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔''

تو اب دیکھنا ہے کہ امر صفت مولٰی کریم ہے جس کا مبداء ارادہ ہے، اور مرید ہونا رب العالمین کی ایک صفت صفات ذاتیہ میں سے ہے۔ اور ہر صفت مولٰی کریم اپنی صفت کی مقید بھی نہیں بلکہ ہر وصف ذاتیہ واصف کل لامحدود ہے۔ تو پھر امر مخلوق امر خالق کی مانند کیسے ہوں؟ امر الٰہی تو ایک شان و نشان ایزدی ہے۔ دیکھئے! قرآن شریف میں کیا ارشاد ہو رہا ہے:

"وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝" ''اور زمین میں یقین کرنے والوں کیلئے نشانات ہیں اور تمہاری جانوں میں بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔''

[الذّٰریت: ۲۰، ۲۱]

اور خود انسان کی صفات ذاتیہ کا اصل روح ہی ہے۔ جو جسم سے روح الگ ہو جاتا ہے تو یہ سب

صفات معدوم ہو جاتی ہیں۔ وجودی افعال فوت ہو جاتے ہیں، تمام آلات حسی رہ جاتے ہیں۔ اب سمجھنا چاہئے کہ وہی روح جو بصارت کا کام دے رہی تھی۔ وہی طاقت جو سماعت کا کام کر رہی تھی، وہی ہستی جو کلیم تھی، اور جس کی قدرت سے مانند ملائکہ اپنے اپنے محل ومقام پر کُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ [1] کا فعل سرزد تھا، سب فوت ہو گئے۔ تو اب اگر کہا جائے کہ یہ سماعت و بصارت اور نطق سب ایک روح یعنی امر الٰہی کا فعل تھا، یا ہے، تو درست ہوگا۔ اوران صفات ذاتیہ کا روح کل ثابت ہوا۔ اولیائے کرام بغیر آنکھ کے دیکھ سکتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے آگے دیکھتے تھے ویسے ہی پیچھے دیکھتے تھے۔

اے بھائی! اب جان کہ مولیٰ کریم کی صفات کا کیا حد وحصر، جب اس نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (یعنی میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے ارادہ سے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ [2] کا محل انسان کو بنایا تو اس میں کیا تعجب کا مقام کہ اس کی حرکات وسکنات اسی کی قدرت اور ارادہ سے ہیں۔ گو مثالیں یہاں بیگانگی ہیں اور بے مثال کی مثال کیلئے کوئی وجود درست نہیں آسکتا، تاہم تفہیم وفہمید کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں۔

آفتاب اور ضیاء (یعنی سورج اور اس کی روشنی) جن کا اصل ایک ہی ہے، امتیاز کے لحاظ سے دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن آفتاب کو ضیاء سے اور ضیاء کو آفتاب سے ایسا اتحادی تعلق ہے جس کی تمیز محال ہے۔ اسی طرح روح (صفات ذاتیہ مولیٰ کریم) جو معیت خداوندی کا توسل اور مرکز ہے۔ اور تمام صفات ذاتیہ انسان کا مبداء ہے۔ یعنی سمع کو سمع سے اور بصارت کو بصارت سے اور کلام کو کلام سے اور علم کو علم سے، اور ارادہ کو ارادہ سے، اور حیاتی کو حیات سے، اور قدرت کو قدرت سے جو اتحاد معنوی ہے اس میں امتیاز اور کلام محال ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ مکتوبات دفتر سوئم میں فرماتے ہیں:

''ظل سوائے اصل کے نہیں ہے اور ظل اصل نہیں ہے۔'' انسان مثل آئینہ ہے۔

۱۔ سب اپنی اپنی شکلوں پر عمل کرتے ہیں۔

۲۔ پھونکا میں نے اس میں اپنی روح سے۔

معرفت الٰہی:

معرفت یا معیت خداوندی کے علم وعرف تک کسی دلیل سے پہنچنا محال ہے۔ بلکہ معرفت الٰہی اس کے علم وعرف کی دلیل ہے۔ اس لئے اس میں اس قدر اختلاف ہے کہ اصل معانی کے بالکل خلاف ہوگیا ہے۔ اہل اسلام کے ایک گروہ کے نزدیک تو باری تعالیٰ سب آسمانوں کے اوپر عرش پر بیٹھا ہے۔ دوسرے کے نزدیک وحدت الوجود میں واجب الوجود کے تصرف ذاتی کے سوا سب لغویات ہیں۔ تیسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر جگہ موجود ہے، نہ اس کیلئے کوئی جہت نہ مکان، نہ اس کی گنجائش کیلئے زمین نہ آسمان، نہ اس کے بیان کیلئے قلم نہ زبان، نہ اس کے ادارک کیلئے وہم نہ گمان، نہ اس کے عرف کیلئے ظواہر نہ بطون؛ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ[1]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ: "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ" یعنی پہچانا میں نے اپنے رب کو رب سے۔ یعنی رب کے نور سے، اور یہ نہایت ہی لطیف قول ہے جو امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے، کیونکہ رب کو رب کے غیر سے پہچانا محال ہے اور یہ حال کے سوا نہیں ہے۔

ارشاد مولیٰ کریم ہے:

"وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"

[الذّٰریٰت: ۲۰، ۲۱]

"یقین کرنے والوں کیلئے زمین میں نشانیاں ہیں اور تمہارے اپنے نفسوں میں بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟

اور حدیث شریف میں وارد ہے:

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ"

"جس نے پہچانا اپنے نفس کو بے شک اس نے پہچانا اپنے رب کو۔"

۱۔ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ صفتیں بیان کرتے ہیں۔

انسان پر عرف الٰہی میں جس قدر مشکل پیدا ہوئی ہے کسی اور مسئلہ کے لئے واقع نہیں ہوئی۔ بدیں وجہ جو کسی کی سمجھ میں آیا وہی ٹھان لیا۔ چشم بصیرت سے اندھے، حقیقت سے بے خبر، اپنے ظن کے ٹٹو پر سوار، میدان توحید میں اپنے زعم سے عرف کی گیند کو انتہائے مقصود پر لے گئے ہیں اور اپنے جہل کو کمال معراج سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ عقل و قیاس کا راستہ نہیں۔ بقول بزرگے: ''عقل بڑی چیز ہے، لیکن جس ترازو سے سونے چاندی کو وزن کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ اس سے پہاڑ کو بھی تول سکیں۔'' عقل کا احاطہ موجودات اور محسوسات تک ہے، اور یہ میدان اس سے وراء الورا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ علم یعنی خبر صادق قرآن حکیم سے سنا یا پڑھا، اس کے مفہوم کو اپنے ہی قیاس وخیال کے سانچہ میں ڈھال لیا۔ مثلاً: ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ [الاعراف: ۵۴] کی تفسیر میں کہا کہ: ''خداوند تعالیٰ برتر سب آسمانوں کے اوپر عرش پر بیٹھا ہے اور جب کرسی پر بیٹھتا ہے تو وہ چیختی ہے۔'' (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِک)

اور وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ [ق: ۱۶] (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [الحجر: ۹] (ہم نے اس ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) ومثلہا آیات کے متعلق کہا کہ: ''یہ فعل فرشتوں کا ہے، چونکہ وہ ذات معلّٰی آمر ہے اس لئے اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔''

"وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" [البقرة: ۱۱۵] ''اور مشرق ومغرب سب اللہ کیلئے ہیں، تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ متوجہ ہے۔''

میں وَجْهُ اللّٰهِ کو صاف جہت قرار دیا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ:

"لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" [الشوریٰ: ۱۱] ''نہیں ہے مانند ومثل اس کے کوئی چیز اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

کو اپنی ہی مانند خیال کیا ہے۔ فرمان مولیٰ کریم ہے:

"يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ" [الفتح: ۱۰] ''بیعت رضوان والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

اور ایک دوسرے مقام پر ہے:

"یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ" [القلم: ۳۲]

''جس دن کہ کھولا جائے گا پنڈلی سے اور سجدے کیلئے بلائے جائیں گے تو نہ کرسکیں گے۔''

اب اگر ہاتھ اور پنڈلی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی مخلوق کے ہاتھ اور پنڈلی کی مانند خیال کیا جائے تو سخت فتور لاحق ہوگا۔ اور پھر بت پرستی اور خدا پرستی میں کچھ فرق نہ رہے گا۔

عزیز! یہ عقل کی ردوکد کا مقام نہیں، عقلِ کل اس جگہ درکار ہے، جو محض فضل ایز دمتعال ذوالجلال والاکرام ہے۔ اور یہ عقل تو موجودات کے سمجھنے میں بھی عاجز ہے۔ مولیٰ کریم تجھے اپنے علم کی سمجھ عطا فرمائے۔ غور کر! کہ ہوا ایک لطیف وجود عناصر موجودات میں سے ہے۔ سوائے فعل ہوا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ جس کے بعد جب حکم خدا سے متحرک ہوتی ہے تو سب بے ساختہ بول اٹھتے ہیں کہ آہا! آگئی۔ حالانکہ کرہ ہوا میں خلا ممکن ہی نہیں۔ سوائے حرکت وسکون کے فعل کے آنا اور جانا روا نہیں ہوسکتا۔ تو مولیٰ کریم کے نزول وعروج سے کیا علم ہوسکتا ہے؟

ہوا جب تیز چلتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ'' ہوا بڑی تیز چل رہی ہے۔'' حالانکہ چلنا یا دوڑنا پاؤں کے عمل سے ہوا کرتا ہے۔ اور کسی چیز کو اکھاڑ کر پھینکنا ہاتھ کی نسبت سے ہوا کرتا ہے اور یہ ہوا کا فعل ہے کہ بڑے سے بڑے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اب ہوا کے ہاتھ اور پاؤں میں عقل سے تمیز ہونی چاہئے جو محال ہے۔ تو خالق کو موجودات میں اس قسم کا نشان دینا یا سمجھنا سوائے جہالت کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ جو عالم موجودات تو کیا تمام عالموں سے بالاتر ہوا اور لطیف تر ہے۔

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی قدس سرہٗ العزیز نے اپنے مکتوبات شریف میں تحریر فرمایا ہے کہ عالم موجودات یعنی عالم ناسوت سے عالم جبروت لطیف، اور عالم جبروت سے عالم ملکوت لطیف تر ہے۔ اور عالم ملکوت سے عالم لاہوت لطیف در لطیف ہے۔ اور عالم لاہوت سے عالم ہاہوت لطیف در لطیف تر ہے۔ اور ذات معلیٰ خالق کل ان سب عالموں سے بالاتر لطیف در لطیف در لطیف ہے:

"لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُوَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَوَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" [الانعام:۱۰۴]

''نہیں پاسکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پاتا ہے سب آنکھوں کو اور وہی ہے باریک بیں اور خبردار''

اس لئے اس آنکھ سے دیدار الٰہی کا ہونا محال اور ناممکن ہے۔لیکن یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ بس دیدار الٰہی نہ کسی کو ہوا اور نہ ہوگا۔ بلکہ دیکھو فرمان ایزدی کس کروفر سے وعید سنا رہا ہے کہ:

"وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَفِي الْاٰخِرَةِاَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا" [بنی اسرائیل:۷۲]

''اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راہ راست سے بہت ہی بھٹکا ہوا ہے۔''

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ! یہ کلام پاک اپنی آپ ہی تفصیل اور تفسیر ہے۔کیسا ہی عمدہ اور برتر فیصلہ کیا ہے۔فرمایا ہے:

"فَاِنَّهَالَاتَعْمَى الْاَبْصَارُوَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ" [الحج:۴۶]

''ہاں تو وہ اعمیت یہ ہے کہ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ولیکن دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔''

گو بصارت قلبی کا راستہ بھی یہی آنکھیں ہیں لیکن اس آلہ کی محتاج نہیں۔خواہ یہ بگڑ گیا ہو بظاہر بند بھی ہوگیا ہو۔بموجب ارشاد ذات معلّٰی بظاہر جوارح اس کی معرفت سے عاجز ہیں۔تاہم ذکر میں یہی آنکھیں فرمائی ہیں۔جیسے ارشاد ہوتا ہے:

"وَعَرَضْنَاجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍلِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا۝ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْالَايَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا" [الکہف:۱۰۰،۱۰۱]

''اور اس دن ہم جہنم کو ایسے کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔''

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر ایک عضو کا فعل ہی اس کی عبادت یا ذکر ہوا کرتا ہے۔مثال کے طور پر زبان کا

ذکر قرآن مجید کی تلاوت، یا اسمائے الٰہی کا ذکر، یا درود شریف کا ورد اور وعظ و پند، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دین کی تعلیم ہے۔ اسی طرح کان کا ذکر ان چیزوں کا سننا، اور ہاتھ کا ذکر، طاقت کا دین کے کاموں میں خرچ کرنا ہے۔ علیٰ ھذ القیاس پاؤں کا ذکر چلنا ہوا کرتا ہے، خواہ مسجد میں نماز ادا کرنے کو جائے یا جہاد فی سبیل اللہ کیلئے یا حج ادا کرنے کے واسطے۔ اسی طرح آنکھ کا ذکر سوائے دیکھنے کے نہیں ہوسکتا ہے جو محض دیدار الٰہی ہے۔ کیونکہ سوائے اس کے آنکھوں کا کوئی ذکر درست نہیں ہوسکتا ہے۔ قرآن شریف کے حروف کو پڑھنے کیلئے دیکھنا گو آنکھوں کی عبادت تو ہے لیکن امی شخص جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو، کافر نہیں ہوسکتا۔ بشرطیکہ مومن نیک کردار اور صالح ہو۔ اور یہاں پر جن کی آنکھیں یاد الٰہی سے پردے میں تھیں انہیں کافر کہا گیا ہے۔

اگر معرفت الٰہی کو تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو ایک الگ کتاب چاہئے۔ اس لئے اختصار کے پیش نظر اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

معیتِ خداوندی:

عرف یا معیت خداوندی کا علم و عرف جس کا اصل ایک ہی ہے، ظاہر سے مطلقاً نسبت نہیں رکھتا۔ جیسے اوپر گزر چکا ہے کہ عالم ناسوت سے عالم جبروت لطیف ہے اور عالم جبروت سے عالم ملکوت لطیف تر ہے اور عالم ملکوت سے عالم لاہوت لطیف درلطیف ہے اور عالم لاہوت سے عالم ہاہوت لطیف درلطیف درلطیف ہے۔ گو اس ہر عالم کثیف کو عالم لطیف سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے منفک اور ایک دوسرے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ ہر ایک لطیف عالم کو اپنے قریب کے عالم کثیف سے تعلق ہے۔ مثلاً ہاہوت کو لاہوت سے، اور لاہوت کو ملکوت سے، اور ملکوت کو جبروت سے، اور جبروت کو ناسوت سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا روشنی کو روغن سے، اور روغن کو اپنے مغز سے، اور مغز کو وجود سے، اور وجود کو اپنے شجر سے، اور شجر کو اپنی جڑ سے اور جڑ کو عناصر ارضی سے۔

"اَللّٰـهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ	"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں

زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ"

[النور:۳۵]

چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے۔ وہ درخت زیتون ہے کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف۔اس کا تیل جلنے کو تیار ہے خواہ اسے آگ نہ بھی چھوئے۔روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے اور لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔"

ارشاد ایزد متعال ذوالجلال والاکرام اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔جس نور کی مثال کَمِشْكٰوة بیان فرمائی ہے۔اب اگر اس مثال کو کسی خاص شخص پر منسوب کیا جائے۔جیسا کہ بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے تو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا فائدہ نہیں رہتا۔اس لئے کہنا ہی پڑے گا کہ کل موجودات فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مثل روشن دان کے ہے اور زجاج عالم محسوسات سے،اور چراغ مانند معلومات کے ہے۔اور روشنی مانند معروفات کے ہے۔فرمان حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ" (یعنی پہچانا میں نے اپنے کو رب کے نور سے) مطابق فرمان مولیٰ کریم يَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کے ہے۔یعنی اللہ جل شانہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے،ہدایت دیتا ہے۔

عزیز! مولیٰ کریم تیرے لئے آسان کرے، سمجھ! عالم موجودات سے عالم محسوسات کا احاطہ وسیع ہے،اور عالم محسوسات سے عالم معلومات کا احاطہ وسیع تر ہے۔اور عالم معلومات سے عالم معروفات کا احاطہ بہت ہی وسیع ہے۔اس سے وراء عالم امر ہے، جو ان سب سے بالاتر ہے۔اور ذات باری تعالیٰ ان سب عالموں سے بدرجہا بالاتر ہے۔

عالم موجودات وہ ہے جو موجود ہے۔جس کیلئے آنکھ سے دیکھنا یا ہاتھ سے ٹٹولنا روا ہے۔اور یہ لطیف

ہو یا کثیف، مادیات سے ہے۔اور عالم محسوسات اثرات سے متعلق ہے جس کا ماخذ حواس خمسہ ہی ہیں، خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔مثلاً گرمی سردی کا لگنا، درد کا ہونا، بخار کا چڑھنا اترنا اور رنج وراحت سے متاثر ہونا یعنی کسی اثر سے رنجیدہ، غمناک اور خوش ہونا ہوتا ہے۔اور عالم معلومات علم سے علاقہ رکھتا ہے جو کسی چیز کے عرف سے جاننا اور پہچاننا ہوتا ہے، جو قوت حافظہ کے سپرد ہو کر دماغ میں قرار پکڑتا ہے اور یہ ظن اور گمان کے سوانہیں ہے۔عالم معروفات علم عرف سے متحقق ہوتا ہے، اور یہ بصیرت قلبی سے ہے۔

علم، اصول کے لحاظ سے ظن اور گمان سے نسبت ہے اور عرف حکم، مثال اس کی اس طرح پر ہے کہ ایک گھڑا پانی سے بھرا ہوا سامنے پڑا ہے۔جس کی تراوت کو دیکھنے سے یہ گمان اور ظن غالب ہے کہ اس میں پانی ہے، اور یہ علم الیقین ہے پھر جب چپنی اٹھا کر پانی کو آنکھ سے دیکھ لیا تو عین الیقین حاصل ہو گیا۔اور اگر اس کو چکھ کر یا پی کر اس کی کیفیت سے شناسا ہوا تو حق الیقین حاصل ہو گیا۔تب ظن یا گمان باقی نہ رہا، تو حسب الحکم:

"اِنَّ الظَّنَّ لَایُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا" [یونس:۳٦]　"یقیناً ظن حقیقت سے کچھ بھی کفایت نہیں کرتا۔"

عرف حاصل ہو گیا۔کیونکہ جب رویت حاصل ہوتی ہے تو ظن باقی نہیں رہتا۔اس سے بالاتر عالم امر ہے جو شان ایزدی اور صفات ذاتیہ مولیٰ کریم سے ہے۔اور وہ عالم ارواح سے متعلق ہے۔جس کیلئے ارشاد ہوتا ہے: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۱

عالم امر یا حکم سے بدرجہا بالاتر وہ احکم الحاکمین کی ذات معلیٰ ہے جس کے عرف یا معیت کا علم محض فضل ایزدی سے وابستہ ہے۔ان سب عوالم کو ایک دوسرے سے لطافت اور مدارج کے لحاظ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔لیکن تعلق یا واسطہ کے لحاظ سے ہر ایک عالم اپنے قریب کے عالم سے رشتہ دار ہے۔یعنی احکم الحاکمین کو اپنے حکم سے یا آمر کو اپنے امر سے، اور امر کو میدان عرف سے، اور عرف کو علم سے اور علم کو حواس خمسہ سے اور حواس کو جسمانیت یعنی عالم موجودات سے رشتہ ہے۔لیکن احکم الحاکمین یا اس کے امر سے (جو

۱۔فرمایئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔

سب علم اور عرف کا اصل ہے) علم بغیر عرف کے ہونا محال ہے۔ اور عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔

توجب ایزد متعال ذوالجلال والاکرام نے اپنی قدرت کاملہ سے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ [الحجر: ۲۹] ۱ کی نعمت بے بہا کو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاکی پتلا میں ودیعت فرمایا یعنی حیاتی کو وجود کا، روح کو بت کا، انسان کو بشریت کا، اصل کو فرع کا، مجمل کو مفصل کا، سر کو ظہور کا لباس پہنا دیا تو اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۲ کے ارادہ پر کلام کرنے والے ملائکہ کو اپنی شان لازوال کے تصرف اور علم لدن کے القا اور ظہور سے متنبہ کرتے ہوئے اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۳ کا حضرت آدم علیہ السلام کو ارشاد ہوا۔ تب خلیفۃ اللہ عالم امر کی مقدس حقیقت کو قلب اطہر کے ظرف سے لیتے ہوئے میدان عرف کی طرف قدم زن ہوئے اور علم کل سے عالم ہو کر احاطہ احساس کی راہ سے موجودات کے نام بتادیئے۔ تب ملائکہ کی طرف مخاطب ہو کر خالق موجودات نے فرمایا: اِنِّيْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۴

نفس

لغت کے لحاظ سے نفس کسی شے کی ذات کا نام ہے۔ اس میں بھی بہت اقوال ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک نفس کے معنی جسم ہیں۔ بعض نفس سے سانس اور بعض خون مراد لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام نے اس کے معنی خصائلِ ردیہ، اخلاق کمینہ، عادات سفلیہ اور خواہشات رذیلہ کے لئے ہیں اور وہ کسی حد تک درست ہیں۔ بارشاد حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ یہ سب صفات نفسیہ ہیں۔ ضرور ہے کہ صفات کیلئے عین ہو جس میں یہ صفات پائے جائیں اور اس کے تین درجے ہیں:

ایک بموجب ارشاد اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ [یوسف: ۵۳] ۵ نفس برائی کی طرف حکم کرنے والا ہے۔ دوسرا درجہ نفس لوامہ ہے جس کے متعلق لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ٥ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ

۱۔ پھونکا میں نے اس میں اپنی روح سے۔ ۲۔ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

۳۔ خبردو ان کو ان کے ناموں سے۔ ۴۔ بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

۵۔ بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے۔

اللَّوَّامَةِ[1] میں اشارہ ہے۔ اور اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ کبھی ہدایت کی طرف اور کبھی غفلت کی جانب۔

تیسرا نفس مطمئنہ، ذات معلیٰ سے استقامت رکھنے والا۔ قرآن حکیم میں ہے:

"یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً" ''اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف واپس ہو۔ یوں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔'' [الفجر: ۲۷، ۲۸]

تو معلوم ہوا کہ نفس کے صفات بدلتے رہتے ہیں اور مجاہدہ سے یہ پاک اور نیک بلکہ خداوند تعالیٰ کا مقرب اور مطمئن ہوسکتا ہے، الا ماشاء اللہ۔ تو نفس عین ہوا نہ کہ صفت اور جسم یا خون اور سانس کے معنی درست نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ جب جسم بے روح ہوجاتا ہے تو یہ سب معنی فوت ہوجاتے ہیں۔

ہر چند نفس اور انسان میں سندات کے لحاظ سے یعنی قرآن شریف کی آیات سے کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے، اور اصل یہی ہے کیونکہ روح اور وجود کے سوا تیسری چیز اگر کوئی ممکن ہو تو بغیر روح کے اس کا اثبات ہونا چاہئے اور یہ محال ہے۔

چونکہ میرا اسلوب بیان اس کتاب میں ''الانسان فی القرآن'' ہے اس لئے مجبور ہوں اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ روح اور وجود کے اختلاط سے نفس پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ابھی ظہور انسان نہ تھا یعنی خاکی جسم سے مبرا تھا اور ذکر کے قابل نہ تھا۔ ذکر انسان کی ابتداء (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) اس خاکی پتلا میں روح پھونکنے سے پہلے نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کیلئے ارشاد ہوتا ہے: هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا [دھر: ۱] یعنی کہ انسان پر ایک وقت وہ بھی تھا کہ وہ ذکر کے قابل نہ تھا۔ گویا وہ ایسی چیز تھی جو ذکر میں نہ آسکتی تھی۔ گو عالم ارواح یا عالم امر کا ذکر فی القرآن ہے لیکن اس کے علم اور حال سے واقف ہونا سوائے اس وجود کے نہیں ہے۔ ہاں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کیلئے یہ قید نہیں جس کا ذکر انشاء اللہ اپنے موقع و محل پر ہوگا۔

۱۔ روز قیامت کی قسم یاد فرماتا ہوں اور اس جان کی قسم جو اپنے اوپر بہت ملامت کرے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''یہ وجود ذہنی اور لفظی کی نفی ہے، اتحادی وجود کی نفی نہیں۔'' پھر نفس کا تو ذکر ہی کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر اگر قبل از پیدائش خارجی طور پر ہوا تو وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً [البقرة: ۳۰] (یعنی میں زمین ایک نائب بنانے والا ہوں) کے الفاظ کے سوا نہیں ہے جو محض ارادہ الٰہی کا اظہار ہے۔ بعد میں فرمایا: فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ [الحجر: ۲۹] یعنی جب میں اسے درست کر کے اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اے گروہ ملائکہ! تم اس کیلئے سجدے میں گر جانا، پھر جنت میں بسایا اور لغزش کی وجہ سے اِهْبِطُوْا (اتر جاؤ) کا حکم صادر فرما کر فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ (ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے) کی قید لگا کر میدان دنیا میں ٹھہرانا وغیرہ واقعات ظہور میں آئے۔ لیکن یہاں بھی روح اور مٹی کے بت کے سوا تیسری چیز کا نام نہیں۔ کئی مقامات پر قرآن کریم میں ''نفس'' کا لفظ ہی انسان پر بولا گیا ہے۔ اب ناممکن ہے کہ نفس، بغیر روح کے خواہشات اور صفات سیئہ سے متصف، وجود میں کوئی تیسری چیز ہو، جس کو عین کہیں۔ سو یہ سب صفات حضرت انسان ہی میں پائے جاتے ہیں، جو کہ مظہر کل ہیں۔

حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ نے (کشف المحجوب میں) تحریر کیا ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ اَیْ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ وَیُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالذِّلِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْعِزَّةِ وَیُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْعُبُوْدِیَّةِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالرُّبُوْبِیَّةِ''

''جس نے اپنے نفس کو پہچانا پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا یعنی جس نے اپنے نفس کو فانی سمجھا اس نے اپنے رب کو باقی سمجھ لیا اور کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو ذلت سے پہچانا اس نے اپنے رب کو عزت سے پہچانا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو عبودیت سے پہچانا''

اس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچانا۔ پس جو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ سب معرفت سے محجوب رہتا ہے۔ اور اس سب سے مراد اس جگہ انسان کی معرفت ہے۔ اور لوگوں کا اختلاف اس میں آپس

میں معارضہ کے سبب سے ہے۔''

کیا ہی خوب اور درست فرمایا ہے، مولیٰ کریم ان کا بھید زیادہ سے زیادہ پاک کرے الحمدللہ رب العالمین۔ آخرانسان یا انسان کی بہیمیت ہی کو نفس کہنا پڑے گا۔ کیونکہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تب ہی اس کی ہرطرح کی خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ماں سے انس اور خوراک کیلئے دودھ کی ضرورت، رفتہ رفتہ خوراک ولباس، دوست ودشمن کا احساس بڑا ہوکر حرص وشہوات کا بندہ اور تفاخروعزت کا شیدا ہو جاتا ہے جوسراسر مایہ نفس ہے۔روحانیت کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔تعلیم اور علم کے بغیر نہ خدا کا پتہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرف۔خورش وپوشش اور خواہشات حیوانیہ کے سوا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا ہے۔انہی صفات کی بناء پر مولیٰ کریم نے ارشاد فرمایا ہے:

"اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ"[اعراف: ۱۷۹]

''ایسے لوگ چار پایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور یہی غافل لوگ ہیں۔''

اپنی صفت اور حال میں تو حیوانوں کی مانند ہیں، اوراشرف المخلوقات انسان ہوکر حیوانی صفت میں رہنا اوران سے زیادہ گمراہ ہونا ہے۔کیونکہ اس کی صفات حیوانیہ اورصفات روحانیہ یعنی طاقت اور ہمت، فکراور عقل، سعی اور ارادے جوسب روح سے وابستہ ہیں، دنیوی زندگی کے فوائد اور جسمانی تعیش کے حصول کیلئے محنت اور تکلیف اٹھاتے ہوئے خرچ ہوتے جاتے ہیں۔سوائے موت کے کوئی چیز نہیں جوان کو حیران، پریشان اور مرنے کے بعد کی فکر کیلئے مجبور کرے اور وہ بھی شاذ۔ ہرایک انسان ایسی غفلت میں مستغرق ہورہا ہے کہ لحہ بھر کیلئے بھی ادھر متوجہ ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔اور بعض کے نزدیک تو یہ ایک عادت زمانہ سمجھی جاتی ہے کہ''ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا جائے گا۔اگرایسا نہ تو نظام دنیوی کیسے رہ سکتا ہے؟ بوڑھے زیادہ عمر میں خوار ہو جائیں۔''وغیرہ وغیرہ۔نہ یہ علم ہے کہ انسان کیا چیز ہے کہاں سے آیا اور کہاں گیا۔اور اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ بعض اسی سبب سے دہریہ بن گئے اور کافر ہوگئے۔آخرت پر ایمان لانا ان کیلئے ایک خام خیالی اور من گھڑت باتیں متصور ہوئیں جیسا کہ قرآن شریف میں تصریح کے ساتھ فرمان ایزدی با آواز بلند پکار کر غفلت کی نیند سے جگا رہا ہے۔

"وَقَالُوْامَاھِیَ اِلَّاحَیَاتُنَاالدُّنْیَانَمُوْتُ وَنَحْیَاوَمَایُھْلِکُنَااِلَّاالدَّھْرَ"
[الجاثیہ:۲۴]

''اورانہوں نے کہاکہ بس یہ ہماری دنیا کی زندگانی ہی ہے کہ ہم مرتے جیتے ہیں اورہم کوزمانہ ہی ہلاک کردیتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

"وَقَالُوْآاِنْ ھِیَ اِلَّاحَیَاتُنَاالدُّنْیَاوَمَانَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ٥وَلَوْتَرٰی اِذْوُقِفُوْاعَلٰی رَبِّھِمْ قَالَ اَلَیْسَ ھٰذَابِالْحَقِّ قَالُوْابَلٰی وَرَبِّنَاقَالَ فَذُوْقُواالْعَذَابَ بِمَاکُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ"
[الانعام:۲۹،۳۰]

''اورانہوں نے کہاکہ بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہی ہے اورہم (مرنے کے بعد) پھرزندہ نہیں کیۓ جائیں گے۔تم تعجب کروگے جب ان کودیکھوگے کہ پروردگار کے سامنے کھڑے کیۓ جائیں گے اوروہ کہے گا کیا یہ(دوبارہ زندہ ہونا) برحق نہیں؟توجواب دیں گے کیوں نہیں! پروردگار کی قسم(بالکل برحق ہے) اللہ کریم فرمائے گاتوجوکفرکرتے رہے ہواس کے بدلے عذاب کے مزے چکھو۔''

کاش! کہ آج وقت کوجانتے جب کافرافسوس کے ہاتھ مل کر کہے گا:

"یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا"[النباء:۴۰] ''اے کاش کہ میں مٹی ہوجاتا۔''

یعنی انسان(جس کی حیات ابدی ہے) نہ ہوتا،تاکہ عذاب سے بچ جاتا۔آخرت کی زندگی کے انکارکی وجہ سے ایمان اورعمل سے بے بہرہ رہتارہا۔وہ یقین جومرکرنہ اٹھنے پرتھا،جاتارہااورآخرت کی حیاتی جوہمیشہ کی حیاتی ہے،اس پریقین آگیا۔تب یٰلَیْتَنِیْ کی صدابلندہوئی اوراپنے کیۓ پرنادم اورگناہ کااقرار بے نہایت وغایت نقصان سے علم ہوگیا۔اب اگرخواہش ہوئی تویہ کہ ایک دفعہ دنیامیں جانا نصیب ہو۔بفرمان الٰہی:

"اَوۡ تَقُوۡلُ حِیۡنَ تَرَی الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ" [الزمر:۵۸]

''یہ جب عذاب دیکھ لے گا تو کہنے لگے گا کہ مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہو تو میں نیکو کاروں میں ہو جاؤں۔''

مگر بے سود، کہاں کا لوٹنا اور کیسا واپس جانا؟

اب یہ جو کچھ بھی ہوا، ہر چند اسباب مختلف ہیں لیکن اصل سبب اور عام صورتوں میں بہیمیت یعنی نفس کا حجاب ہی سدراہ ہو گیا۔ ورنہ نجات کا خیال ہر بشر کو لگا ہوا ہے۔ موت کے بعد جی اٹھنے کیلئے عمل صالح، خشوع وخضوع، عجز و نیاز، خوف و رجا، فکر و قلق، سعی ومحنت وغیرہ جن کی ضرورت تھی، نفس پر شاق اور گراں گزرے اور بظاہر حیاتی اور حظوظ ولذائذ نفسانی پر فریفتہ ہو کر انکار کرنا آسان معلوم ہوا۔ سچ ہے کہ ''جاہل کیلئے دو رکعت نماز باخلاص پڑھنا دوزخ میں داخل ہونے سے زیادہ دشوار ہے۔''

چونکہ دنیا میدان آزمائش ہے اور یہ وجو آزمائش کا اصل ہے اس لئے اس کے اسباب نہایت قوی ہیں۔ کیونکہ روح کے توسل سے عناصر اربعہ کی گھڑت میں جو قوتیں پیدا ہوئیں جن کو حواس خمسہ کہنا بجا ہے، ان سے ہر طرح کا احساس پیدا ہوا۔ آنکھ نے دیکھا، کانوں نے سنا، زبان چکھنے سے آشنا ہوئی اور باقی جوارح کو مس سے تاثیر ہوئی۔ ان سب کی تاثیر کا اثر دماغ میں پہنچا اور قوت حافظہ کے سپرد ہو کر قلب پر ہویدا ہو گیا۔ اس تاثیر کے جذب سے ہزار ہا کیفیات کا پیدا ہونا روزمرہ سے ثابت ہے۔ مثلاً آنکھ جب کسی خوبصورت چیز کو اخذ کرتی ہے تو دل فوراً اس کی مزید طلب کیلئے بے تحاشا للچانے لگتا ہے۔ گویا یہ دوزہر آلود تیر بلا ارادہ دل کو ڈس لیتے ہیں۔ طرفہ ماجرا یہ کہ نیک یا بد، جو اثر بھی دل پر ہوتا ہے وہ اسی اثر کو زیادہ چاہنے لگتا ہے، حتیٰ کہ رات دن اسی تصور کی تصویر حیرت بن جاتا ہے۔ آخر اس کی محبت دل میں گھر کر لیتی ہے اور عشق تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ جان بھی قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل کام نہیں کرتی، تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ نفع ونقصان کی سمجھ دماغ سے اٹھ جاتی ہے اور ایک دھن میں سیدھا قوت ارادی سے بلا کر گڑھے میں گرا جاتا ہے۔

دراصل اس ساری کارگاہ حیات میں نفس یا انسان کی ان تینوں صفات یعنی (۱) نفس امارہ

بالسوء، (۲) نفس لوامہ اور (۳) نفس مطمئنہ ہی کا ظہور ہے جن کی تفصیل آئندہ اوراق میں پھیلی ہوئی ہے۔

امانت الٰہی کا حامل

کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ جذباتِ نفس (امارۃ بالسوء) جن کا مختصر بیان اوپر کیا گیا ہے۔مولیٰ کریم کی طرف بڑھتے اور جس مقصود کیلئے اس کو پیدا کیا گیا ہے، حاصل کرتا۔خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا [الملك: ۲] ۱؎ کی تمیز سے اس کا دماغ درست ہو جاتا اور یہ اپنے صِرَاطُ الْمُسْتَقِيم ۲؎ کو پہچان لیتا۔اِذَادَعَاكُمْ لِمَايُحْيِيْكُم[انفال: ۲۴] ۳؎ سے عالم ہو کر حیات ابدی سے عارف ہو جاتا۔مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْعَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔) کی حقیقت اس پر روشن ہو جاتی، تب اس امانت کا حق ادا ہوتا جس کو زمین وآسمان اٹھانے کی تاب نہ لا سکے، پہاڑ اس کی بارآوری سے دم بخود ہو کر رہ گئے اور مشیت ایزدی نے اپنی خاص حکمت سے اس کو اٹھانے کی جرأت دی اور وہ بے بہا نعمت اس کے قلب میں ودیعت فرما کر اس کو امین کے اسم سے موسوم فرما دیا:

"اِنَّاعَرَضْنَاالْاَمَانَةَعَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَاوَحَمَلَهَاالْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا o لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًارَّحِيْماً"

[الاحزاب: ۷۲، ۷۳]

''ہم نے بار امانت کو زمین وآسمان اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں اور منافقہ عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو۔ اور مہربانی کرے اللہ مومن مردوں اور مومنہ عورتوں پر اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

ہر چند امانت پر مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔بعض کے نزدیک امر ونہی اور عبادت الٰہی ہے، اور

۱۔ اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگانی کو تاکہ تمہیں آزمالے کہ کون تم میں سے اچھے عمل والا ہے۔ ۲۔ راہ سیدھی۔
۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تمہیں بلائیں اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشے۔

اکثریت اسی پر ہے۔ اور بعض نے اس کو محبت کہا ہے لیکن سوائے محبت کے امانت کے وجود پر کوئی دوسرا لباس درست نہیں بیٹھتا۔ کیونکہ امانت اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بطور ودیعت کسی کے سپرد کی جائے۔ اور امرو نہی کا جمع کرنا انسانی فعل کا مقتضی ہے۔ اگر یہ ہی کہا جائے کہ امرونہی اور اطاعت وعبادت بارامانت ہے اور یہ اس کا اٹھانے والا ہے تو زمین وآسمان کی کوئی چیز اس سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد کلام پاک ہے

"یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ" [الجمعة: ۱]

''جو چیز آسمانوں میں ہے اور کچھ زمین میں، سب خدا کی تسبیح کرتی ہے، جو بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست، حکمت والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

"وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ" [الرحمن: ٦]

''اور تمام سبزے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔''

اور فرمایا:

"اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ" [النور: ۴۱]

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور جانور پر پھیلائے ہوئے بھی۔ سب اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں۔

اس مضمون کی بہت سی آیات کلام مجید میں وارد ہیں اور ہر چیز امر کی خوشی سے فرمانبردار ہے تو پھر اَبَیْنَ اور اَشْفَقْنَ کا فائدہ نہیں رہتا۔ بار امانت کی علت تو آزمائش ہے۔ تاکہ آزمائیں ہم منافق مردوں اور منافقہ عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو امانت میں خیانت کی رو سے، اور مومن مرد عورتوں پر مہربانی کریں۔

حامل امانت ہونے میں مومن مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب انسان شامل ہیں۔ لیکن مومن کو اس خیانت کے ظلم اور شرک میں ملبوس ہونے سے مستثنیٰ فرمایا ہے اور مشرک اور منافق کو بوجہ شرک اور نفاق کے، عذاب

کی وعید سنا کر ڈرایا ہے۔ ہر چند انسان میں دونوں جہان سے نشان ہیں لیکن محبت کا جامہ سوائے انسانی وجود کے کسی دوسرے پر درست نہیں آ سکتا یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں) کی دولت اس خاکسار ہی کے نصیب میں آئی ہے۔ لیکن فرمان ایزدی کے مطابق یہ محبت کے عرف سے بھی جاہل ہے اور اس کے غیر محل پر صرف کرنے کی بنا پر ظالم اور مشرک۔

یاد رہے کہ محبت اور چیز ہے اور ضرورت اور رغبت اور چیز۔ ہر ایک انسان اور حیوان کو خوراک کی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لئے جب خواہش کی گئی چیز اس کو نہیں ملتی تو اس کی طلب میں بے قرار ہوتا ہے، مل جانے پر بڑا خوش ہوتا ہے، لیکن سیر ہو کر کھا لینے کے بعد جب ضرورت نہیں رہتی تو اسی چیز کو جس کی طلب میں پہلے بے قرار تھا، دوبارہ کھانے سے کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ تو محبت اور کراہت میں کیا نسبت؟

دوسری رغبت، سو ہر جنس کو اپنی جنس سے رغبت ہے، گو یہ محبت کے قریب ہے مگر اس میں بھی کچھ نہ کچھ غرض پائی جاتی ہے جو محبت کی ضد ہے۔ خالص محبت میں غرض کا پایا جانا عیب ہے۔ محبت محض محبوب کیلئے ہی خاص ہوا کرتی ہے۔ غرض وجود کی کسی حاجت روائی کا نام ہے اور محبت میں وجود بلکہ جان بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس لئے اگر من دون اللہ سے محبت ضرورت اور رغبت کی راہ سے ہو تو اس کو محبت کہنا روا نہ ہوگا۔ اور اگر ایسی محبت ہو جیسی مولیٰ کریم سے ہونی چاہئے جو حقیقت ایمان ہے تو وہ شرک ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُمِنَ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًايُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّالِلّٰهِ"

[البقرة:١٦٥]

''اور بعض آدمیوں میں سے شریک پکڑتے ہیں سوائے اللہ کے کہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ جل شانہ سے کرنی چاہئے اور جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ اشد یعنی سخت محبت اللہ ہی سے کرتے ہیں۔''

مومن خاص کو بھی قوت لایموت (اتنی خوراک کھانا کہ جو مرنے نہ دے) سے چارہ نہیں ہے۔

کیونکہ اس کی ضرورت ہر بشر (مومن، ولی، پیغمبر، سب) کو لازم ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس سامان کے ہونے سے ان کو محبت اور نہ ہونے سے طلب نہیں ہوتی ہے۔ ان کا جینا، مرنا، تمام افعال وحرکات مولیٰ کریم ہی کیلئے ہوتے ہیں اور ہر حال میں وہ اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہوتے ہیں۔ محبت کے میدان میں رضا کی بساط پرورود کے سایہ میں پرورش پا رہے ہیں، اور طلب کے راستہ پر اسی کی توفیق سے چل رہے ہیں۔

اور فرمان ایزدی:

"مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ" [آل عمران: ۱۷۹]

''جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے گا، مومنوں کو اس حال پر جس پر تم ہو، ہرگز نہیں رہنے دے گا۔''

کے تصرف سے تغیر وتبدل کی کروٹیں بدل رہے ہیں۔ گو بشریت ایسی بلا ہے کہ علائق متعلقہ کو فکر مند کر ہی دیتے ہیں لیکن ایسے شخصوں کو نسیان من دون اللہ لازم ہوتا ہے اور اپنے حال میں سے فرصت ہی نہیں پاتے، جس کو حفاظت من اللہ کہنا روا[۱] ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کی آنکھ میں کانٹا لگ گیا۔ کئی دن کے بعد کسی نے عرض کیا کہ حضور! کانٹا تو نکال لیا ہوتا؟ فرمایا: ''فرصت ہی نہیں ملی۔'' حالانکہ بظاہر کوئی کام تھا ہی نہیں جس میں مشغول ہوتے۔ اسی لئے مردانِ خدا کا قول ہے کہ ''جس نے ہمارے ظاہر کو دیکھا وہ گمراہ ہو گیا اور جس نے ہمارے باطن کو پایا برسر راہ ہوا۔''

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
ہچوں باشد در نوشتن شیر و شیر[۲]

۱۔ روا ہے یعنی زیادہ درست ہے، ٹھیک ہے۔ ۲۔ پاک ہستیوں کے کام کو اپنے اوپر قیاس نہ کر کہ لکھنے میں تو ''شیر'' اور ''شیر'' (دودھ) ایک جیسے ہی ہوتے ہیں

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت میں سکونت

"وَقُلْنَا يٰآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ"
[البقرة:۳۵،۳۶]

''اورہم نے کہااے آدم! تواور تیری بی بی دونوں جنت میں رہواوراس میں سے بافراغت جہاں سے چاہوکھاؤ۔لیکن اس درخت کے نزدیک مت جانا، ورنہ ظالموں میں سے ہوجاؤ گے۔پس شیطان نے ان کواس سے پھسلا دیا اور جس مقام میں وہ تھے وہاں سے نکال دیا۔ہم نے کہااتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔''

مفسرین کے اس میں مختلف اقوال ہیں، ہرایک نے اپنی معلومات اوراستعداد کے مطابق ارشادات فرمائے ہیں جو تحقیق کے میدان میں کسی حد تک صحیح ہیں۔ایک گروہ کے نزدیک یہ جنت اپنے اصل مقام یعنی ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے جہاں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوا علیہا السلام داخل کئے گئے اورابلیس لعین کے دھوکا دینے اور شجر ممنوعہ سے کھالینے کی وجہ سے جنت سے اتارے گئے اور سراندیپ وغیرہ میں آ گئے اور نادم ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے گروہ کے نزدیک یہ عقل کے برعکس اورقرآن شریف کے خلاف ہے اوروہ اس دلیل پر ہیں کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیدا کرنے سے پہلے ارشاد باری تعالیٰ بالکل عیاں ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یعنی میں ''زمین'' اپنا ایک نائب (خلیفہ) بنانے والا ہوں۔جس کا ظہور اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (میں ''مٹی'' سے ایک ڈھانچہ بنانے والا ہوں) کے موافق دنیا ہی میں ثابت ہورہا ہے۔رہا جنت، سووہ ایک خوشگوار مقام (عدن) میں ایک باغ ہے اور ''جنت'' عربی زبان میں باغ کو کہا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید میں وارد ہے:

"وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ"[الکھف: ۳۲] ''اور بیان کران کیلئے مثال دو مردوں کی کہ کئے ہم نے واسطے ایک کے ان میں سے دو باغ۔''

اور اِهْبِطُوْا سے مراد''باغ سے نکال دینا ہے۔'' نہ یہ کہ جنت آسمانوں پر تھا اور نہ ہی قبل از موت حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنت میں داخل کرنے کیلئے آسمانوں پر اٹھالے گئے۔

یہ سب کم فہمیدگی کی وجہ سے تاویلات ہیں جو قرین قیاس نہیں ہیں۔ کیونکہ جنت اور اس میں داخلہ آسمانوں پر مان لیا جائے تو اس میں کئی اشکال پیدا ہوتے ہیں جن کا حل ناممکن ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کا فائدہ نہیں رہتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ:''یہ مشیت ایزدمتعال ذوالجلال والاکرام کے اسرار میں سے ہے جو عام فہم نہیں ہے۔ جنت میں داخل کرنے اور بوجہ لغزش زمین پر اتار دینے میں حکمت کاملہ ہے۔'' اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کو دعائے مغفرت رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا...... الایۃ لایعنی (بے مقصد) ثابت ہوتی ہے اور سراسر الزام باری تعالیٰ پر عائد ہوتا ہے، جو قطعاً حرام ہے اور اس کا امکان محال۔ اس لئے ماننا ہی پڑے گا کہ یہ جنت نہایت آرام کی جگہ اور تمام نعمات کا سرمایہ دنیا میں کا ایک باغ تھا جس میں بلا طلب ومحنت داخل کئے گئے اور لغزش کی وجہ سے نکال دیئے گئے۔

اصول کی رو سے مفسرین میں اس قدر ہی اختلاف ہے۔ فروعی صورت میں کئی ایک وجوہات پر جو اختلافات ہیں ان کا یہاں درج کرنا لاحاصل ہے۔ اب مَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ صحت حال کی رو سے حسب استعداد کچھ تحریر کیا جاتا ہے جو ماشاء اللہ تحقیق کے میدان میں غور و تعمق کے اوزان سے موازنہ کرنے سے بعید از تصدیق نہ ہوگا پہلے گروہ کی تحقیق معانی کی بساط پر کسی حد تک بجا و درست ہے اور سراسر حقیقت کے میدان کا شجر کہا جا سکتا ہے مگر عام فہم نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ لقمہ عوام کے معدہ کے لائق نہیں ہے۔ ہر چند عالم موجودات میں یہ مشکل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے گزر کر عالم محسوسات، معلومات اور معروفات میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ دوسرا گروہ جو سراسر خطا پر ہے اس کی غلطی کا سبب بھی یہی ہے۔ عالم شہود یعنی موجودات ہی کے بساط پر رہ جانے کی وجہ سے ایسا تحریر کیا ہے، جو اصل معانی کے خلاف واقع ہوا ہے۔

کیونکہ اگر جنت کوایک باغ دنیا ہی تصور کیا جائے تو پھر مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

"فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ" [الاعراف: ۲۲]

"پھر جب ان دونوں نے اس درخت سے چکھ لیا تو ان کے ستر ان پر ظاہر ہو گئے اور دونوں نے جنت کے پتوں سے ان کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔"

کپڑوں کا اترنا اور بہشت کے پتوں سے ستر کا ڈھانکنا کس وجہ پر درست ہوسکتا ہے؟ اور معاً یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اگر جنت دنیا ہی کا باغ تھا، تو آج کافروں اور مشرکوں، دہریوں اور نافرمانوں کے نہایت عمدہ اور خوشگوار باغات موجود ہیں، تو پھر نعماتِ عظمیٰ اور باغ دنیا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ تو کہنا ہی پڑے گا کہ یہ سراسر نادانی اور ایسی تاویل ہے جس کے سوا کچھ چارہ نہ ہوسکا۔ ورنہ اس تفسیر کی معنوی بساط پر کچھ وقعت نہیں ہے۔

عزیزا! جان، کہ یہ برزخِ انسانیہ ہے، جس کے بغیر کوئی حقیقت وانکشاف درست نہیں ہوسکتا، اور اس کی حدوحصر کا اندازہ بے انتہا ہے۔

منقول ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ایک دفعہ اپنے لختِ جگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گود میں لئے پیار کررہے تھے اور جذبات پدری از حد موجزن تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ابا جان! آپ کو مجھ سے بہت محبت ہے؟" فرمایا: "ہاں" فرمایا "تو بھائی حسین رضی اللہ عنہ سے؟" ارشاد ہوا "ان سے بھی۔" فرمایا: "تو میری والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے؟" ارشاد ہوا "ان سے بھی۔" پھر فرمایا کہ "نانا جان سے؟" فرمایا "ان سے بھی۔" پھر سوال کیا "ابا جان! اللہ تعالیٰ سے؟" ارشاد ہوا "سب سے بڑھ کر۔" بولے کہ "ابا جان! آپ کا دل ہے یا سرائے؟" سبحان اللہ! خوردسالی میں یہ سمجھ۔ قصہ مختصر حضرت علی المرتضیٰ شاہِ ولایت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جوش محبت الٰہی اس قدر غالب ہوا کہ فرزند ارجمند کو صدرِ مبارک سے لگالیا اور نسبتِ حق سے برزخ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو سیراب کر دیا۔

اور فرمایا:

"یَاوَلَدِیْ فِکْرُکَ فِیْکَ یَکْفِیْکَ دَاءُکَ وَدَوَاءُکَ فِیْکَ لَیْسَ شَیْءٌ خَارِجًامِّنْکَ اَنْتَ اُمُّ الْکِتٰبِ یَاوَلَدِیْ اَنْتَ جِسْمٌ صَغِیْرٌوَّفِیْکَ عَالَمٌ کَبِیْرٌ"

"اے میرے بیٹے! اپنی جان میں تیرا غور وفکر تجھے کفایت کرے گا۔ تیری بیماری اور تیری دوا تیرے اپنے ہی وجود میں ہے، کوئی چیز بھی تجھ سے باہر نہیں ہے، تو اصل کتاب ہے، اے میرے بیٹے! تو ایک چھوٹا سا جسم ہے مگر تیرے اندر بہت بڑا جہان ہے۔"

تو اپنے جسم کو چھوٹا سا خیال نہ کر، دونوں جہان تیرے ضمیر کی وسعت میں ایسے ہیں جیسے طشت میں دانہ۔

یہ ہے حقیقت انسان جس کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہوا۔ لیکن عوام کے معدے اس لقمے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ کے سمجھانے کیلئے، اس مشکل کو حل کرنے اور اس حقیقت کے انکشاف کیلئے اس علیم وحکیم نے انسان کے برزخ کی رویت کا انحصار خواب پر رکھا ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَاوَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَافَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَاالْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ" [الزمر: ۴۲]

"اللہ تعالیٰ جانوں کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کو نیند میں۔ پھر جن کی موت مقرر ہو چکی ہے ان کو روک لیتا ہے اور اوروں کو ایک وقت مقرر تک بھیج دیتا ہے اس میں تفکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔"

معلوم کیا چاہئے کہ برزخ دو وجہ پر ہے۔ ایک قبل از پیدائش اور دوسرا بعد از انتقال اور یہ سب کیلئے یکساں ہے خواہ انسان کس درجہ میں ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ عوام الناس کو اس کا علم سوائے خبر کے نہیں۔ لیکن انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے لئے یہ برزخ ہماری مانند نہیں ہے۔ یا دوسرے معنوں میں ان کیلئے ہر دو برزخ ہوتے ہی نہیں۔ بمصداق فرمان محققین کہ "عام مومن جو کچھ دیکھتا ہے خواب میں دیکھتا ہے، اور ولی نوم یعنی اونگھ میں دیکھتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے اولیاء اللہ بالکل خفیف نوم میں جو قریب بہ بیداری ہوا کرتی

ہے۔ لیکن پیغمبر اور مرسل کیلئے یہ نوم نہیں ہوا کرتی بلکہ بالکل بظاہر ہوا کرتا ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے عصا اور ید بیضا ظاہر میں پایا اور عوام کے روبرو پیش کر دیا۔

مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ ہر کیفیت برزخ مملکتِ انسانیہ کا آئینہ ہے خواہ محجوب ہو یا مکشوف۔ فرق صرف یہ ہے کہ مومن اس وجود عنصری سے جو سب حجابات کا آلہ ہے نیند میں خلاصی پانے والا ہوتا ہے اور ولی تھوڑی سی نوم میں اس بلا سے نجات حاصل کرنے والا، اور مرسل اس بلا سے بحکم خدا منزہ ہوا کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کافر حَیٰوۃ الدُّنیَا میں مَعِیْشَۃً ضَنْکًا [1] کے مطابق نَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی [2] کا مرتکب ہو جاتا ہے اور مومن یَشْرَحْ صَدْرَہٗ [3] کے مطابق حیات ابدی اور طاقت و تصرف کا مختار کر دیا جاتا ہے:

"اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْکٰفِرِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ"

[الانعام:۱۲۲]

"بھلا ایک شخص کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور اس کو نور دیا کہ اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا یہ اس شخص کے برابر ہے جو اندھیروں میں پڑا ہے اور وہاں سے نکل نہیں سکتا؟ اسی طرح بھلا دکھایا گیا ہے کافروں کو جو وہ کر رہے ہیں۔"

اور مرسلین کا حال جس سے کماحقہ واقف ہونا ہمارے حصہ میں نہیں ہے، عجیب و غریب ہوا کرتا ہے۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ولی بھید میں رویت کو پاتا ہے، جیسے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عروج ہوا ہے فقیر کو بحکم خدا رویت نصیب ہوئی۔ مدینۃ الاولیاء کا نشان اپنے حال سے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے بھی دیا ہے۔ لیکن نبی

۱۔ دنیا میں روزی تنگ۔

۲۔ اٹھائیں گے ہم اس کو، دن قیامت کے، اندھا۔

۳۔ اللہ کھول دیتا ہے سینہ اس کا۔

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالکل بظاہر نماز خسوف میں کھڑے محراب کی طرف ید مبارک کو بڑھایا مگر مصلحت اور سر کو مستور رکھنے کی بنا پر ہٹالیا۔ اور صحابہ کرام کے استفسار پر فرمایا: ''میں نے جنت کو دیکھا اور اس میں انگور کا ایک خوشہ توڑنا چاہا، اور اگر میں توڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اس میں سے کھاتے رہتے۔

یہ ایک لمبی حدیث شریف بخاری و مسلم شریف دونوں میں مذکور ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اسے صلوٰۃ الخسوف کے باب میں نقل فرمایا ہے۔ مفصل وہاں پر ملاحظہ فرمائیں اس حصہ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِيْ مَقَامِكَ هٰذَا ثُمَّ رَاَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّيْ رَاَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَخَذْتُهُ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَابَقِيَتِ الدُّنْيَا......

''صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ یہاں کھڑے کوئی چیز لینے کا قصد فرما رہے تھے۔ پھر ہم نے آپ کو پیچھے ہٹتے دیکھا۔ آپ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور اس میں سے ایک خوشہ انگور کا لینا چاہا اور اگر میں لے لیتا تو تم دنیا کے باقی رہنے تک کھاتے رہتے۔''

تو اب کہنا ہی پڑے گا کہ یہ جنت میدان دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے عیاں تھی۔ جس کو برزخ سے تعبیر کرنا ہمارے حال کے موافق بجا اور درست ہوگا۔ ورنہ اوپر گزر چکا ہے کہ مرسلین کیلئے برزخ مطلق روا نہیں ہے۔ یا ان کا برزخ اور ہے اور ہمارا اور۔ ان پاک ہستیوں کا برزخ اسرار الٰہیہ میں سے ہے جس کے علم سے ہم کو حصہ نہیں ہے اور مطابق فرمان الٰہی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً [1] یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ یہ جنت حیات دنیا ہی میں میدان دنیا سے بالاتر اور مملکت انسانیہ کی بساط پر موافق ارشاد لم یزل مُلْكًا كَبِيْرًا [2] ہے جو بلا محنت و مشقت بلکہ بلا طلب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عنایت فرمایا گیا۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا" [الدھر: ۲۰]

''اور جب دیکھے گا تو اس جگہ دیکھے گا تو بہت نعمت اور مملکت بہت بڑی۔''

۱۔ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ ۲۔ بہت بڑا ملک۔

لیکن ساتھ ہی آزمائش کا شجر کھڑا کر دیا اور فرمایا:

"لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" [البقرۃ:۳۵]

''اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

آخر کار ابلیس لعین نے سمجھا کہ آدمی اور بنی آدم علیہ السلام کیلئے یہ نعمت عظمٰی و دیعت فرمائی گئی ہے۔ ہر چند کوشش کی اور اپنے قاعدے کے مطابق جس چیز کا طمع حضرت آدم علیہ السلام کے ضمیر میں پایا رغبت دلائی اور جھوٹی قسم کھا کر دھوکا دیا۔ لغزش کھانے کی وجہ سے جنت سے اتار دیئے گئے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ○ وَقَاسَمَهُمَا اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ"[الاعراف:۲۰،۲۱]

''اور شیطان نے کہا تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ، یا یہاں پر ہمیشہ رہنے والے نہ ہو جاؤ اور ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں

اب غور و فکر سے معلوم کرنا چاہئے کہ پروردگار نے حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے اور لباس کے اتارے جانے کا قصہ تنبیہاً ارشاد فرمایا ہے کہ اے بنی آدم دیکھنا کہیں تم کو اسی طرح جس طرح تمہارے باپ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوا دیا تھا، تم کو بھی دھوکا نہ دے۔ فرمایا ہے:

"يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ"

''اے آدم کے بیٹو! نہ بہکائے تمہیں شیطان جیسے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو جنت سے، اتار لیا تھا ان سے لباس ان کا تاکہ دکھلائے ان کو شرمگاہیں ان کی۔ بے شک وہ دیکھتا ہے تم کو، وہ اور اس کا کنبہ اس طرح سے کہ نہیں دیکھتے تم

[الاعراف:۲۷] ان کو، تحقیق کیا ہم نے، شیطان کو دوست، واسطے ان لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے۔''

اب معلوم ہونا چاہئے کہ بنی آدم کونسی جنت میں داخل ہیں جس سے نکلنے کا احتمال اور شیطان رجیم کے فریب دینے کا خطرہ ہو، جس کیلئے تنبیہ خاص من اللہ نازل ہوئی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ تنبیہ کسی اور نعمت کیلئے ہو جس کی مثال حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جنت یعنی نعمت عظمیٰ سے فرمائی ہو۔ لیکن اس سے پہلی آیت:

"يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ" [الاعراف:۲۶]

''اے آدم کے بیٹو! بے شک اتارا ہے ہم نے تمہارے لئے لباس کہ ڈھانکتا ہے شرمگاہیں تمہاری اور باعث زینت ہے۔ اور ایک لباس التقویٰ ہے، یہ بہتر ہے اور یہ اللہ کی آیات (نشانات) میں سے ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔''

میں دونوں لباس کی تصریح ہے اور اس میں تمام بنی آدم شامل ہیں لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ تو سب پر روشن ہے، مگر لِبَاسُ التَّقْوٰى عالم مثال کا شجر ہے جس کا علم خواص کے سوا عوام الناس کو نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ وہ اپنے برزخ فی الوجود یعنی خواب میں کبھی اپنے آپ کو برہنہ اور کبھی لباس سے مزین دیکھتا ہے۔ علم اور جہل کو نظر انداز کرتے ہوئے صحت حال کے رو سے حضرت آدم اور بنی آدم علیہ السلام ہر دو لباس (ظاہری اور باطنی) کے حصول میں یکساں ہیں اور یہ مسلم امر ہے کہ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ جنتی لباس ہے جو جنت سے خارج ہونے کی صورت میں اتر گیا۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لباس جنت کے سوا نہیں ہے، اور جنت اس لباس کے سوا نہیں ہے، ہر دو لازم و ملزوم ہیں۔ یہ لباس (ریشا) کسی لغزش یا گناہ سے اترتے والا نہیں۔ تو جب حضرت آدم علیہ السلام اور بنی آدم اس لباس میں مشترک ہیں اور کسی گناہ عظیم سے بھی یہ لباس نہیں اترتا، اور لِبَاسُ التَّقْوٰى سے ایک چیتھڑا بھی باقی نہیں رہتا، تو نور ایمانی کے ترازو میں غور و فکر سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ جس طرح یہ لباس عوام کیلئے مخفی ہے اسی طرح جنت بھی

پوشیدہ ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ جنت یا دوزخ موت کے بعد ہی ظاہر ہوگی۔ جنت، ایمان اور اعمال صالحہ کا اور دوزخ، کفر اور بد اعمالیوں کا نتیجہ ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ یہ میدان دنیا کا ایک شجر ہے جس کی جگہ انسانی ضمیر کے سوا نہیں ہے۔ اصل اور فرع کا سا حال ہے۔ نور ایمانی کے تحت میں اعمال اصل کی مانند ہیں، اور فرع ان کی تفصیل اور نمود فی الآخرۃ ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ:

"مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَفِي الْاٰخِرَةِاَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا"

[بنی اسرائیل: ۷۲]

"جو کوئی یہاں (اس دنیا میں) اندھا ہے، وہی آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے بہت ہی بھٹکا ہوا ہے۔"

اور اس کی تفسیر یوں ارشاد فرمائی ہے:

"فَاِنَّهَالَاتَعْمَى الْاَبْصَارُوَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ" [الحج: ۴۶]

"اور وہ (اندھا پن) یہ آنکھیں اندھی نہیں ہیں، بلکہ دل اندھے ہیں جو کہ سینوں کے اندر ہیں۔"

دوسری جگہ سورہ یٰسین میں فرمایا:

"وَجَعَلْنَامِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّاوَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّافَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَايُبْصِرُوْنَ"

[یٰس: ۹]

"اور ہم نے ان کے آگے ایک دیوار کر دی اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار کر دی اور (اوپر سے) ان کو (اس طریقہ سے) ڈھانک دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

اور تیسری جگہ مومن اور کافر کے ضمیر اور وسعت کے مطابق فرمایا:

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًافَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَالَهٗ نُوْرًايَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَاكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَاكَانُوْايَعْمَلُوْنَ"

"بھلا جو شخص کہ مردہ تھا پس ہم نے اس کو زندہ کیا اور اسے نور عنایت کیا کہ اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا یہ اس شخص کی مانند ہے جو ایسے اندھیروں میں ہے جن سے وہ نکل

[الانعام: ۱۲۲] نہیں سکتا؟ اسی طرح سے زینت دیا گیا ہے واسطے کافروں کے جو وہ کرتے تھے۔''

انسان کی یہ دونوں حالتیں فِی الدُّنیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ اظہر من الشمس ہیں جو اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں، ورنہ خداوند کریم والاکرام نے انسان کو عین دین پر پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ فرمان مولیٰ کریم ہے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ" [الروم: ۳۰]

''فطرت خدا کی کہ بنایا اوپر اس کے آدمیوں کو، نہیں بدلنا واسطے پیدائش خدا کی کے، یہ ہے دین درست اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔''

محض حجاب جو دوزخ کا اصل اور موجب عذاب ہے، انسان کی ضلالت کی وجہ سے ہے۔ ورنہ دین لقیم جو خلقت انسانیہ سے وابستہ ہے سب نعمات اس کے غلام ہیں: لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اس امر پر شاہد ہے کہ کوئی عارف ہو یا مجوب، مقبول ہو یا مردود، اس کی فطرت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ محض بعد و قرب، اعمیٰ وبصیر سے عبارت ہے۔ مطابق:

"وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ○ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ○ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ○ وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ" [الفاطر: ۱۹ تا ۲۲]

''اور نہیں ہیں برابر اندھا اور دیکھنے والا، اور نہ ہی اندھیرا اور روشنی، اور نہ ہی سایہ اور دھوپ، اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں۔''

اور یہ سب ہمارے ہی عارضہ کی وجہ سے ہے جو حال کے مترادت ہے، ورنہ اس رحیم الودود کی طرف سے وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ [1] [البقرۃ: ۱۵۰] اس امر پر دال ہے کہ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے ہم پر تمام نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ اور یہ تمام نعمتیں مطابق لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ [2] اصل کے موافق ہیں اور فرع ہمارے کسب کے لحاظ سے ہے لیکن اصل میں تغیر روا نہیں ہے۔ محض میدان آزمائش میں آ کر ہوا و ہوس کا شکار ہو گئے۔ صرف اس سے زکیٰ حاصل کرنا ہی اتم کامیابی ہے، اور اس میں رہ

۱۔ اور تا کہ تم پر میں اپنی نعمت کو پورا کر دوں، اور تا کہ تم راہ پاؤ۔ ۲۔ شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔

جانا خاک میں ذلیل وخوار یعنی اَسۡفَلَ سَافِلِیۡن کا مقیم ہونا ہے، جو تمام مصیبتوں کا گھر اور نامرادی کی جڑ ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"قَدۡاَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَاo وَقَدۡخَابَ مَنۡ دَسّٰهَا" "بے شک مراد کو پہنچا جس نے پاک کیا اس کو، اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔" [الشمس: ۹، ۱۰]

اب نور ایمانی سے معلوم کرنا چاہئے کہ مطابق ارشاد ذوالجلال والاکرام زکیٰ حاصل کرنا فَقَدۡفَازَ فَوۡزًاعَظِیۡمًا ۱ کے مترادف ہے، اور یہی مقصود اور حصول ہے۔ اور خاک میں ملنا یعنی اس مقام سے ملبوس ہونا سراسر محرومی اور نامرادی ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ "فطرت اللہ" میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مالک حقیقی نے اس کے تغیر وتبدل کو روا نہیں رکھا ہے، یہ اس سے مبرا ومنزہ ہے۔ بلکہ منازل ومدارج، عروج ونزول، بعد وقرب، کفر واسلام، شرک وایمان، سب اس کے نشیب وفراز کا نتیجہ ہے۔ انسان کے لئے یہی صراط المستقیم ہے اِنَّـالِلّٰهِ وَاِنَّااِلَیۡهِ رَاجِعُوۡنَ ۲ اسی کی آمد ورفت سے عبارت ہے۔ فطرت کی رو سے انسان احسن تقویم اور آخری منازل یعنی عالم شہود مطابق مُسۡتَقَرٌّوَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ کی وجہ سے اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ، ہوائے نفس کا گرفتار۔ ہاں جس نے فَفِرُّوۡااِلَی اللّٰهِ ۳ میں سعی کی اور توفیق الٰہی اس کے شامل حال ہوئی، اس مقام سے بفضلہٖ تعالیٰ خلاصی پانے والا ہوا۔ زکیٰ کے معنوں کو پائے ہوئے، طلب غیر کو دل سے ہٹائے ہوئے، قلب سلیم کو پہلو میں سجائے لقاومشاہدہ الٰہی لامتناہی کی رویت سے منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کیلئے جنت راستہ کا ایک مقام ہوتا ہے۔ مومن اپنے ضمیر میں مطابق عَرَّفَهَالَهُمۡ ۴ اس کے عرف سے عارف ہوجاتا ہے۔ لیکن مرسلین کو بالکل بظاہر رویت حاصل ہوتی ہے، عوام کی دانش اس سے عاجز ہے۔ ولی کو سر یعنی بھید میں یہ معنی حاصل ہوتے ہیں، لیکن پیغمبران عوارضات سے مبرا ومنزہ ہوتا ہے۔

۱۔ پس بے شک مراد کو پہنچا بہت بڑی مراد کو۔
۲۔ ہم اللہ کیلئے ہیں اور ہم اسی کی طرف پلٹنے والے ہیں۔
۳۔ پس دوڑو اللہ کی طرف۔ ۴۔ انہیں اس کی پہچان کرادی ہے۔

مدعا اس عبارت سے یہ ہے کہ برزخ کسی آڑ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی ان مقامات یا حالات کو جو پوشیدہ ہیں، عالم موجودات، محسوسات، معلومات اور معروفات۔ عالم موجودات کی رویت تو بالکل ہر کہ ومہ پر روشن ہے۔ عالم محسوسات ہر قسم کے احساس کم وبیش سے متاثر ہونا ہے، اور احساس کی راہ سے ظاہری وباطنی علم کا حصول عالم معلومات سے ہے۔ لیکن عالم معروفات سوائے رویت کے درست نہیں ہوسکتا۔ اس عزیز الحکیم نے یہ سب انسان کے ضمیر میں ودیعت فرمائے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ان کا حامل بنایا ہے۔ سرشتی توفیق سے اس کی خلقت کو مکمل بنا کر اپنی فطرت پر آفرینش کیا ہے۔ جو میدان آزمائش میں کسی قدر اختیار دے کر اس طرح ارشاد فرمایا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ"

[حم السجدة: ۴۰]

"بے شک جو لوگ کہ کج راہی کرتے ہیں ہماری نشانیوں میں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کیا پس جو کوئی کہ آگ میں ڈالا جائے وہ اچھا ہے یا وہ کہ قیامت کے دن امن سے آئے؟ پس تم جو چاہو کرلو، یقیناً وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے"

عمل کے میدان میں انسان چار حالت سے خالی نہیں ہے: کافر، فاسق، مومن اور ولی۔ کافر اپنی فطرت کو محجوب کرنے والا، فاسق باوجود یقین رکھنے کے عمل میں قاصر ہونے کی وجہ سے محروم، مومن خدا کے فضل سے امیدوار اور کوشاں، اور ولی خدا تعالیٰ کی توفیق سے زکیٰ حاصل کرنے اور اپنی فطرت تک پہنچنے والا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ فطرت کی کسی حالت میں نفی نہیں ہے جس کی تفصیل میں بہت طول ہے۔ مراد صرف یہ ہے کہ فطرت اور مملکت انسانیہ دو چیزیں نہیں۔ یہ وسعت فطرت انسانیہ کی ہے۔ جب اسفل سے نجات حاصل کرتا ہے تو اس کیلئے عوالم بالاتر سے معارویت ہو جاتی ہے۔ اس جگہ الگ مثال کی ضرورت نہیں۔ صرف حالات حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام کافی ہیں کہ لغزش کی وجہ سے ان مدارج عروج سے ہبوط ہوا تو فوراً لباس بھی اترا اور حال کے رو سے گر گئے، تمام کیفیات اور اپنے مقام اور اسکی رویئت سے برطرف ہو گئے۔ چونکہ اس معاملہ میں آدم اور بنی آدم علیہ السلام یکساں ہیں، لہٰذا آج بھی حجاب کے دور

ہوتے ہی ان مدارج پر عروج ہونا سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری وساری رہے گی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ میدان دنیا یا انسانی ضمیر میں یہ مدارج ومعارج مثل اصل کے ہیں، جو تحت ایمان ہے۔اور عمل کے میدان میں مانند فرع، اور کما حقہ نمود بعد از انتقال فی الآخرۃ ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس عزیز الحکیم نے فطرت انسان کو اپنی فطرت پر اور عین حکمت پر مبنی رکھا ہے جس کے منازل ومدارج میں عجیب کیفیات کی وسعت ہے۔یعنی عالم موجودات میں اسباب ظاہری خورش وپوشش اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اس مقام میں جسے ذات پاک نے اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ فرمایا ہے، گویا اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ بنا کر اس مقام کا مطابق مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ [1] مقیم بنایا ہے، یہ عاجز انسان محل ومقام کے رو سے اسی کا حکم رکھتا ہے۔اس میں کلام نہیں کہ اس میدان میں اس کو آزمائش اور علم ودانش کے حصول اور ظہور تام کیلئے بھیجا گیا ہے۔لیکن یہ قید انسان عین حجاب اور سراسر غفلت اور گمراہی کا سرمایہ ہے، سرتاپا اس بلا میں مبتلا، اپنی کشتی کا ناخدا اور اپنی خواہشات کا شیدا ہوتا ہے۔تاہم فطرت انسانیہ اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اپنے اصلی مقام پر پہنچے۔خواہ اثرات اجسادی جو عوارضات ارضیہ کے مترادف ہیں، مانع بھی ہوں اور ہمیشہ کیلئے محجوب، موجب عذاب اور جہنم کا ایندھن ہی کیوں نہ ہوں، مولیٰ کریم کی رضا کے خلاف ہے۔اور وہ اس لئے کہ مشیت ایزد متعال اس کے برعکس ہے اور فطرت انسانیہ کا ارادہ ازلی کے خلاف ہونا محال ہے۔محض سرشتی توفیق کے اختیارات جو سراسر آزمائش کے میدان کا شجر ہے، یہ اس کا ثمر ہے۔جو نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی [2] کی زبردست سنت کا نتیجہ ہے۔کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَالَّذِیْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَافَانْسَلَخَ مِنْهَافَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْشِئْنَالَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَاِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْتَتْرُكْهُ يَلْهَثْ

"اور پڑھ اوپر ان کے قصہ، اس شخص کا کہ دیں ہم نے اس کو نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس پیچھے لگایا اس کو شیطان نے پس ہو گیا گمراہوں سے اور اگر چاہتے ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان کے (یعنی ان نشانیوں کے)

---

[1] ۔ ٹھہرنے کی جگہ اور ایک وقت تک کیلئے پونجی ہے۔

[2] ۔ پھیرتے ہیں ہم اس کو جدھر وہ پھرتا ہے۔

ذَالِکَ مَثَلُ الْقَوْمُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ"
[الاعراف:۱۷۵، ۱۷۶]

ولیکن وہ لگ گیا طرف زمین کی اور پیروی کی خواہش اپنی کی پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے، تو او پر اس کے، زبان لٹکائے، یہ ہے مثال اس قوم کی کہ جھٹلایا نشانیوں ہماری کو، پس بیان کر قصے تو، کہ وہ فکر کریں۔"

مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ وہ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْض کا مرتکب ہوا یعنی مقامات اسفل پر ہمیشگی چاہی اور اسی کو پسند کیا، اس لئے اس حجاب میں قَوْمًا عَمِیْن ۱ کی طرح غٰوِیْنَ ۲ میں سے ہو گیا۔ اپنی اصلی فطرت کو ہمیشہ کیلئے دوزخ کا مقیم بنا دیا۔ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْن ۳ کے ابدی حجاب میں گرفتار ہو گیا، کل نعمات سے محروم ہو گیا۔ گو فطرت میں کسی قسم کا تغیر واقع نہ ہوا لیکن حجاب در حجاب میں ابدی محجوب ہو گیا: هَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ ٤ کے مطابق مُلْکًا کَبِیْرًا ۵ سے بے نصیب ہو گیا۔ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ ٦ کے رو سے کتوں کے زنجیر میں جکڑا گیا، یہ ہے مقامات انسانیہ کا آخری مقام یعنی اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کی حقیقت اور حصول۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انسان کا پہلا مقام سری ہے، یعنی:

"هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" [الدھر: ۱]

"انسان پر زمانے میں سے ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ یہ کوئی ذکر کی گئی چیز نہ تھا۔"

جس کا ذکر کرنا منع اور مخفی ہے۔ دوسرا مقام عالم ارواح جس کا ذکر عوام اور خواص کے لئے اظہر من الشمس ہے۔ تیسرا مقام عالم شہود یعنی میدان دنیا جو جسدی وجود کے موافق اور مترادف ہے، ذکر ہو چکا ہے۔ اب دوسرے مقام کی نسبت بیان کرنا لازمی ہے جو عالم معروفات سے ہے۔ عالم ارواح سے عالم اجساد یعنی موجودات تک نزول انسان ہے۔ لیکن واپسی پر مطابق کلام الٰہی ایک اور معیار بھی منفرد ہو چکی

۱۔ قوم اندھی۔ ۲۔ گمراہ۔ ۳۔ اس دن حجاب میں ہوں گے۔
٤۔ ہلاک ہو گئی مجھ سے دلیل میری بادشاہی میری۔ ۵۔ بہت بڑا ملک۔
٦۔ اور پیروی کی اپنی خواہش کی۔

ہے، جس کو عالم برزخ سے تعبیر کرنا درست ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًاوَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ" [الانعام:۲]

''وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے، پھر مقرر کی اجل اور ایک اور اجل مقرر کی ہوئی ہے نزدیک اس کے، پھر تم شک کرتے ہو؟

اس کا زیادہ تر تعلق عالم دنیا سے ہوا کرتا ہے، گویا یہ بھی میدان دنیا ہی سے ہے۔ ہاں حدیث شریف سے ثابت ہے کہ قبر میں یا تو ایک کھڑکی جنت سے یا دوزخ کی طرف سے کھل جاتی ہے۔ یا تو قبر باغ رضوان ہو جاتی ہے یا دوزخ یعنی نار کا حُفْرَۃٌ:

"اِنَّمَاالْقَبْرُرَوْضَۃٌمِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْحُفْرَۃٌ مِّنَ النَّارِ" [ترمذی]

''سوائے اس کے نہیں کہ قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کا ایک گڑھا۔''

ہر ایک انسان کیلئے اس کا حال منکشف ہو جاتا ہے۔ عالم دنیا جس سے مراد ضمیر فی الوجود ہے، اصل میں ویسا ہی تھا جیسا انکشاف ہوا۔ نص قطعی سے ثابت ہے۔ چنانچہ اوپر گزر چکا ہے کہ جو دنیا میں مردہ ہے آخرت میں بھی مردہ ہے، جو دنیا میں اندھا ہے آخرت میں بھی اندھا ہوگا، اور یہ اندھا پن اور مردہ ہونا فی الضمیر ہے نہ کہ بظاہر، یعنی اس کا مردہ ہونا اور اندھا رہنا روحانیت کی بساط سے ہے نہ کہ بظاہر بشریت سے، بلکہ جامہ بشریت میں پوشیدہ ہے۔ تو ثابت ہوا کہ کافر نافرمان کیلئے فطرت موجب عذاب اور مومن کیلئے راحت اور تمام نعمتوں کی حامل اور صراط المستقیم ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہر مقام ومحل کے رو سے اسباب بھی اسی کے موافق ہوا کرتے ہیں۔ بشری یا جسدی وجود کے لئے دنیا و مافیہا کے اسباب خورش و پوشش اور مکان وغیرہ۔ اور عالم روحانیت میں یہ سب کچھ اسی کے مطابق نوری وجود سے جس کو جنت کہنا روا ہے۔ اسی لئے کافر کو سوائے حجاب کے برزخ یا فی الاخرۃ میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن مومن کیلئے وجود یا وجود کے موافق روحانی باغ اور مَاتَشْتَھِیْہِ الْاَنْفُسُ (جس چیز کی نفس خواہش کریں گے۔) کے مطابق ہر قسم کی نعمت جس کو جنت کہنا روا ہے، حاصل ہوگی۔ دنیا میں مومن خاص یعنی ولی اللہ کو یہ حجاب نہیں رہتا تو وہ سر میں جنت کو پالیتا ہے۔ اور گاہے اس میں مقیم بھی

ہوتا رہتا ہے۔ جس کو مدینۃ الاولیاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کیلئے من اللہ یہ حجاب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بالکل بظاہر جنت کو پاتے ہیں۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داخل ہونے اور نکلنے کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ سر سے کوئی نشان نہیں ہے۔ بالکل ظاہر پر آیات مبارکہ ہیں جو حقیقت کو واضح کرنے کیلئے کافی ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ کافرین حجاب ابدی میں گرفتار ہیں۔ باوجود مملکت رکھنے کے ظلمات کے گڑھے کے مقید، خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (دنیا اور آخرت میں خسارہ لئے ہوئے) اور مومن اپنی مملکت پر حاوی، اپنی سلطنت کا شہنشاہ، جنت و مافیہا کو آغوش میں لئے ہوئے، اس کی نعمات کو عمل کے نور سے سجائے ہوئے، گاہے عالم خواب میں اپنے مقام کو دیکھتا ہے۔ اور ولی سنتہ (اونگھ) میں ان سب کیفیات سے عارف ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر علیہ السلام کیلئے بالکل عیاں صورت ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس جسدی بلا سے ازلی خلاصی پائے ہوئے ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی فطرت یعنی سرشت پر مکمل بنا کر بلا طلب جنت میں داخل کر دیا اور شَجَرَةُ النَّفْس سے جس کو مادہ ارضیت یا بشریت کہنا روا ہے، منع فرما دیا ہر چند لغزش کی وجہ سے اِهْبِطُوْا[1] کے مرتکب ہوئے لیکن سوائے حجاب کے فطرت اللہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی، توبہ کے بعد پھر جگہ ملی۔

آج بنی آدم کیلئے بھی فطرت انسانیہ میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ[2] کے مطابق کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اسی سنت کے موافق بنی آدم کیلئے اس اپنے مقام پر پہنچنے کی علت اس جامع بشریت سے خلاصی پانے اور حجاب من اللہ دور ہونے کے سوا اپنی مملکت یعنی جنت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اور یہ امر مسلم اور متفق علیہ ہے کہ مرنے سے پہلے جنت میں داخل ہونا روا نہیں لیکن قرآن حکیم سے ثابت ہو چکا ہے کہ جنتی اور دوزخی اسی عالم شہود ہی میں بن کر جائے گا۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

۱۔ اتر جاؤ۔

۲۔ نہیں تبدیل ہونا واسطے پیدائش خدا کے۔

نسبتِ انسان

نسبت ایسے تعلق کو کہا جاتا ہے جس میں اتحاد تام ہو، اور اس کے کئی اقسام ہیں۔ مثلاً ذاتی، صفاتی اور کسبی۔

ذاتی نسبت، تو انسان کو انسان کے ساتھ ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں ہیں۔

صفاتی نسبت، نوعیت وجنسیت کے لحاظ سے صفت بالذات کے مترادف ہے۔ جس میں کمی بیشی عوارضات کی وجہ سے ہے۔ یعنی ایک کمزور ہے دوسرا توانا۔ ایک لنگڑا ہے، دوسرا صحیح وتندرست۔ ایک اندھا ہے اور دوسرا البصیر، علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن اس نسبت کا تعلق جو ذات کے ساتھ ہے اس میں مطلق فرق نہیں ہوا کرتا۔ خواہ بظاہر جوارح کسی عارضہ کی وجہ سے بگڑ ہی گئے ہوں۔ کیونکہ بظاہر جسمانیت کے تغیر و تبدل سے روح یا اصل انسان کی فطرت میں کسی قسم کا تغیر وتبدل ہونا روا نہیں، مطابق فرمان مولیٰ کریم:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" "بناوٹ اللہ کی ہے کہ بنایا اوپر اس کے انسانوں کو نہیں بدلنا واسطے پیدائش خدا کی کے۔" [الروم: ۳۰]

رہا کسبی، سو یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک صنعتی اور دوسرا عملی، صنعت وحرفت کا تعلق تو فی الدنیا ہے جس کا اثر ضمیر پر بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن عملی کا نتیجہ ہر چند فی الآخرۃ ہے جس پر مدارج ومنازل، عروج ونزول، عذاب وثواب، گرفت ونجات اور قبض وبسط کا انحصار ہے۔ گو فطرت میں کسی قسم کا فرق لاحق نہیں ہوتا لیکن

راستہ کا حجاب جوسراسر موجب عذاب اور دوزخ کا اصل ہے، اور مقصود وحصول جوسراسر حجاب کے دور ہونے سے عبارت ہے، افعال واعمال کے اثرات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

عزیزا! جان کہ انسان کی نسبت اس ذات پاک سے سر کے میدان میں متحقق بالذات ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ نسبت انسان اس ذوالجلال والاکرام کے ساتھ واقع ہے۔ اور جوار وقرب باری تعالیٰ کے سوا یہ کسی مقام ومحل کی مقید نہیں۔ عروج ونزول سے منزہ، مدارج ومنازل سے مبرا۔ اس کے بیان کیلئے زبان، نہ وہم نہ گمان، سب عوارضات سے ورا، باخدا۔

جب اس خالق موجودات نے ارادہ ظہور فرمایا تو عالم ارواح کی فطرت کُــنۡ [1] کا ارشاد فرمایا اور فَیَــکُــوۡنُ [2] کی بساط پر تمام ارواح کا ظہور ہو گیا۔ تب عالم ارواح سے نسان کو مناسبت پیدا ہو گئی۔ گفت وشنید، سوال وجواب، ذکر وفکر، علم وعرف کا حامل بنا دیا گیا۔ اَلَسۡـتُ بِـرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی [3] میثاق عوام انبیاء اس پر شاہد ہیں۔ اب وقت آ گیا کہ انسان کو عالم شہود کی طرف مبذول فرمایا جائے، تو ملائکہ کی طرف یوں خطاب فرمایا:

"اِنِّیۡ خَـالِقٌۢ بَشَـرًا مِّنۡ طِیۡنٍ o فَـاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ"
[صٓ: ۷۱، ۷۲]

''میں مٹی سے ایک بشر بنانیوالا ہوں، جب میں اسے درست کر کے اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کیلئے سجدے میں گر جانا۔''

سب ملائکہ نے سر تسلیم جھکا دیا۔ لیکن ابلیس اکڑ بیٹھا، فرمان ایزد متعال ہوا کہ:

"مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُکَ"
[الاعراف: ۱۲]

''تجھے کس چیز نے روکا ہے کہ میرے حکم پر سجدہ نہیں کیا۔''

تو جواب دیا اَنَـا خَیۡـرٌ مِّنۡـهُ (میں اس سے اچھا ہوں) اور ساتھ ہی یہ دلیل پیش کی کہ: خَـلَـقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ (مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔)

۱۔ ہو جاؤ۔　　۲۔ پس ہو گیا۔

۳۔ کیا نہیں ہوں میں رب تمہارا؟ کہا ہاں (بے شک تو ہمارا رب ہے)

دراصل معلم الملکوت نے جو دھوکا کھایا وہ اظہر من الشمس ہے یعنی یہ کہ اس کی نظر جوہر کے سواعرض پر رہ گئی، ورنہ یہ اختلاف نہ ہوتا۔

حاصل کلام، بحکم خداوند کریم عزوجل انسان کو بشر کے اسم سے نامزد کیا گیا اور اس کو اس بشریت سے مناسبت اور اس خاکی وجود سے مطابقت پیدا ہوگئی۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان جس مقام ومحل میں جاگزیں ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے اس لئے اب انسان بشری جامہ میں ملبوس ہوکر اسی کا حکم رکھنے والا ہوا اور مولیٰ کریم نے از راہ عنایت تمام دینی ودنیوی نعمتوں سے سرفراز کردیا۔ جیسے کہ فرمایا:

"وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِىْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"
[البقرة: ۱۵۰]

''اور تا کہ پوری کردی میں نعمت اپنی تم پر اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

اور ابلیس لعین کو حکم دیا کہ:

"قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا"
[الاعراف: ۱۸]

''فرمایا کہ یہاں سے ذلیل وخوار ہوکر نکل جا۔''

شیطان نے سوال کیا:

"قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ"
[الحجر: ۳۶تا۳۹]

''کہا اے پروردگار میرے پس ڈھیل دے مجھ کو اس دن تک کہ زندہ کیے جائیں گے۔ کہا پس تحقیق تو ڈھیل دیئے گئے میں سے ہے، دن وقت معلوم تک، کہا اے رب میرے بسبب اس کے کہ گمراہ کیا تو نے مجھ کو البتہ زینت دوں گا میں ان کیلئے زمین میں اور البتہ گمراہ کروں گا میں ان سب کو۔''

یہ میدان مجادلہ ابتدا ہی سے پیدا ہوگیا۔ بعض کے نزدیک یہ مشیت ایزدمتعال ہی سے رنگ آمیزی ہوئی ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے۔ یہ رضائے الٰہی ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ غضبی صورت

ہے، نہ کہ رحمی ۔نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی (پھرتے ہیں ہم اس کو جدھر وہ پھرتا ہے) کی زبردست سنت اللہ جل شانہ کے مطابق یہ صورت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ فرمایا:

"قَالَ اذْھَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ فَاِنَّ جَھَنَّمَ جَزَآءُ کُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْھُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْھِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْھُمْ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ وَّ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا"

[بنی اسرائیل:۶۳]

''فرمایا جا، پس جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے تو یقیناً جہنم تمہاری جزا، پورا بدلہ ہے اور جس کو تو بہکا سکتا ہے بہکا لے، اپنے آواز سے اور کھینچ بلا ان پر اپنے سواروں کو اور اپنے پیادوں کو اور شریک ہو ان کا ان کے مالوں میں اور ان کی اولاد میں اور وعدہ دے ان کو، اور نہیں وعدہ دیتا ان کو شیطان مگر فریب کا۔ یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تجھے غلبہ نہیں ہے اور کافی ہے تیرا رب کارساز۔''

پس ان ہر دو نسبتوں کے ماتحت دو فریق ایک دوسرے کے مخالف پیدا ہوگئے، یکے رحمانی اور یکے شیطانی۔ ایک کے سردار انبیائے کرام اور سید المرسلین، آخر آمد بود، فخر الاولین، رحمۃ اللعالمین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطابق:

"ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ"

[الفتح:۲۸]

''وہی (اللہ ہے) جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کرے۔''

اور دوسرے گروہ کا سردار ابلیس لعین، مطابق:

"اِنَّہٗ یَرٰکُمْ ھُوَوَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَاتَرَوْنَھُمْ اِنَّاجَعَلْنَاالشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ"

[الاعراف:۲۷]

''وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو، ہم شیطان کو انہی لوگوں کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان لاتے نہیں۔''

ان ہر دو نسبتوں کا جہاں میں شور برپا ہے، ہر ایک اپنے حال کے رو سے كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۱ کے سایہ میں خوش ہو رہا ہے۔ اور یہ ایسا اندھیرا ہے جس کے لئے کوئی چراغ نہیں، اور ایسی غرقابی ہے جس کیلئے کوئی ساحل ہی نہیں۔ کیونکہ ہر ایک شخص جس حال یا نسبت میں سرشار ہوتا ہے اسی کو راستہ سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اعمال کی وجہ سے كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَه ۲ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک کے راستہ کی مشعل نور سے ہے، اور دوسرے کی نار سے۔ ایک آہستہ آہستہ خدا اور رسول کے قریب ہوتا جاتا ہے، اور دوسرا رفتہ رفتہ دور ہوا جاتا ہے۔ ایک کی نسبت اعلیٰ کے ساتھ اور دوسرے گروہ کی نسبت اسفل کی طرف مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سرتاپا مستغرق اور اپنے رنگ میں موافق صِبْغَةَ اللّٰهِ ۳ کے رنگا جاتا ہے۔ اور دوسرا گروہ سرتاپا شیطانی تصرف کا شکار ہو کر ہمہ تن اسی کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور ارشاد ربانی کے مطابق مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ ۴ میں گرفتار ہوتا ہوا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بن جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ قبل از میدان دنیا میں یہ مخالفت و منافشت کالعدم تھی۔ یہ سراسر بشریت سے تعلق رکھتی ہے۔ گو حضرت انسان میں دونوں جہان سے نشان ہیں، لیکن یہ مقام اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ تمام بلاؤں کا گھر، ہر آزمائش کا مبداء، ہر نیک و بد کے اثرات سے متاثر اور انسان عادت کئے جانے کے رو سے مناسبت کا حامل ہے۔ اس کے بیان میں کئی اقسام ہیں جن کی تفصیل میں بہت طول ہے۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ چند وجوہات خیر و شر میں اس ذوالجلال والاکرام کی توفیق سے کچھ تحریر کیا جاتا ہے، وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ!

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان جس مقام میں مقیم ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے۔ چونکہ یہاں بشریت کا مقید ہے جو عناصر کی اضداد سے مرکب اور متحد واقع ہوئی ہے اس لئے اسی کا بندہ ہے۔ روحانیت سے بشریت کی طرف مبذول ہوا ہے اور ہر طرح کے اثرات (تخمی، صحبتی اور ملکی) کا حامل ہے۔ اولاً خورش و پوشش

۱۔ ہر گروہ اپنی یافت میں خوش ہے۔ ۲۔ ہر آدمی اپنی کمائی کے بدلے میں رہن ہے۔
۳۔ اللہ کا رنگ۔ ۴۔ تجھ سے اور تیرے پیروؤں سے۔

کا بندہ، بعدہٗ تفاخر ورعونت کا قبہ اور انانیت کا شیدا ہوتا ہے۔ ابلیس لعین کو سوائے رغبت دلانے کے زیادہ مکلّف نہیں ہونا پڑتا، کیونکہ دنیا و مافیہا کے ساز وسامان سراسر گمراہی اور غفلت پر مبنی ہیں، تاہم انانیت کی نسبت شیطان رجیم ولعین سے منتسب ہے اور اس کا تعلق ارضیت سے وابستہ ہے۔ وہ اس طرح پر کہ انسانی ضمیر کا تعلق جسمانیت سے اور جسم کا عناصر اربعہ سے اور عناصر اربعہ کا واسطہ ارضیت سے ہے۔ گو یہ تعلق عارضی اور چندروزہ ہے لیکن اس کا اثر جو سراسر حجاب بلکہ سراپا عذاب ہے، روح یا کھلے لفظوں میں انسان اور اس کے ضمیر سے وابستہ ہے۔ اور وہ اس لئے کہ بعد از انتقال اس کا حامل انسان ہی ہوگا۔

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِىْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْشِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْتَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ"

[الاعراف: ۱۷۵، ۱۷۶]

"اور پڑھ او پر ان کے قصہ، اس شخص کا کہ دیں ہم نے اس کو نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس پیچھے لگا یا اس کو شیطان نے پس ہو گیا گمراہوں سے اور اگر چاہتے ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان کے (یعنی ان نشانیوں کے) و لیکن وہ لگ گیا، طرف زمین کی اور پیروی کی خواہش اپنی کی پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے، تو اوپر اس کے، زبان لٹکائے، یا چھوڑ دے اس کو زبان لٹکائے۔ یہ ہے مثال اس قوم کی کہ جھٹلایا نشانیوں ہماری کو، پس بیان کر قصے تو، کہ وہ فکر کریں۔"

تو صاف ظاہر ہے کہ بلعام بن بعور کی ہمیشگی دنیا میں تو ممکن نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہمیشگی یعنی اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ نہ کسی کی ہوئی اور نہ ہوگی۔ معانی آیات مبارکہ اس پر دال ہیں کہ اس نے اس مقام پر اپنے سب مدارج و معارج کو فروخت کر دیا اور مطابق ارشاد باری تعالیٰ وہ اسفل کی طرف لیٹا اور آیات کے لباس کو پھاڑ کر دنیا و مافیہا کا شیدا ہو گیا۔ گویا اس نسبت ارضیت سے قدم نہ اٹھا سکا۔ ورنہ فرمان مبارک صاف عیاں ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انہی آیات سے اس کے درجے بلند کرتے۔ لیکن وہ خود لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا

سَعٰی (نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جو کچھ کوشش کرے) کے ماتحت خواہشات رذیلہ کی طرف جھک گیا اور اَخْلَدَاِلَی الْاَرْضِ کو ہی بہتر سمجھا اور ہمیشہ کیلئے کتوں کی زنجیر میں جکڑا گیا۔

یہ ہے نسبت عالم شہود: قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَاوَقَدْخَابَ مَنْ دَسّٰھَا ۱؎ اس لئے اظہر من الشمس ہے کہ جو اس مقام سے، اس نسبت رذیلہ سے پاک ہوا، فلاح پانے والا ہوا، اور جو اس جگہ میں رہ گیا وہ خاک میں مل گیا۔ جس سے مراد اس مقام میں مستغرق ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا ۲؎

حدیث شریف کے حکم سے ایسا شخص مثل چوپاؤں کے ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اُولٰٓـئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلّ یعنی وہ لوگ چوپاؤں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ، کیونکہ چارپایہ اپنی تخلیق میں کامل ہے، اور حکم خدا اور ذکر خدا سے غافل نہیں۔ لیکن انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے چوپایہ کی طرح ہو تو زیادہ گمراہ ہے۔ ایسا شخص خواہ نماز بھی پڑھے، عبادت وریاضت بھی کرتا ہو، تاہم اس کا رجوع الی الدنیا اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ اس کے اصل مقصود وحصول فی الآخرۃ کو مفقود کردے، اور اپنی التجاؤں اور دعاؤں کی انتہا حیات الدنیا ہی میں مقید رکھے۔

کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِوَالْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ:

"مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَانُوَفِّ اِلَیْھِمْ اَعْمَالَھُمْ فِیْھَاوَھُمْ فِیْھَالَایُبْخَسُوْنَ o اُولٰٓـئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِاِلَّا النَّارُوَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْھَاوَبٰطِلٌ مَّاکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ"

[ھود:۱۵،۱۶]

"جو کوئی ارادہ کرتا ہے زندگانی دنیا کا اور اس کی زینت کا پورا دیں گے ہم طرف ان کی عمل ان کے بیچ اس کے اور وہ بیچ اس کے کمی نہ کئے جائیں گے یہی ہیں وہ لوگ کہ نہیں ہے واسطے ان کے آخرت میں مگر آگ اور کھویا گیا جو کچھ تھا انہوں نے بیچ اس کے اور جھوٹا ہوا جو کچھ کہ کرتے تھے۔"

۱۔ بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔

۲۔ پناہ پکڑتا ہوں میں ساتھ اللہ تعالیٰ کے نفسانی برائیوں سے

ایسے شخص سے وہ انسان بدرجہا بہتر ہے جو محض فرائض ادا کرتا ہو اور باقی سارا وقت خواہ وہ اپنی ضروریات معیشت کے ماتحت کاروبار میں صرف کرتا ہو مگر دنیا و مافیہا سے متنفر اور آخرت کی دھن میں متفکر ہو، اس کے علائق متعلقہ فی الدنیا کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ اس کی نسبت فی الاخرۃ آہستہ آہستہ مستحکم اور مضبوط ہوتی جائے گی اور نسبت ارضیہ جس کو نفسیہ کہنا روا ہے رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جائے گی۔ گویا جسمانیت پر روحانیت غالب ہوتی جاتی ہے۔ پھر اس کو عقل سلیم سے حصہ و نصیب کی امید ہو جاتی ہے جس سے وہ علم حال کا مسبوق اور خیر و شر کا متمیز ہو جاتا ہے۔ انسانی ضمیر یعنی مملکت انسانیہ میں جنگ و جدال شروع ہو جاتا ہے۔ انسان ان ہر دو لشکروں میں بمنزلہ خلیفہ کے مجاہد ہوتا ہے۔ اس کی سعی اور ہمت باطنی سے ہر دو فریق تقویت حاصل کرنے والے ہوتے ہیں، اور ہر دو کا اثر اس کے ضمیر پر ہوا کرتا ہے۔ اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جونسا اثر قلب انسانی پر موثر ہوتا ہے اسی کو یہ چاہنے والا اور اسی کے رنگ میں رنگا جانے والا بن جاتا ہے۔ یہی نسبت کا اصل اور مناسبت کا اتحاد ہے۔ اور یہ:

"وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" [الانبیاء:۳۵]

''اور آزماتے ہیں ہم تم کو ساتھ برائی اور بھلائی کے آزمائش کو۔''

اور

"فَاَلْهَمَهَافُجُوْرَهَاوَتَقْوٰهَا" [الشمس:۸]

''پس جی میں ڈالی اس کے بدکاری اس کی اور پرہیزگاری اس کی۔''

سے عبارت ہے۔ اس مقام میں ہر دو نسبتوں کا معائنہ کرتا ہوا تغیر و تبدل سے عالم اور اپنے حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شر کی نسبت کا سردار ابلیس عَلَيْهِ اللَّعْنَة اور خیر کی نسبت کے شہنشاہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ابتداء انسان کے عمل خیر اور شر سے ہوتی ہے اور انتہا نسبت کامل سے مکمل ہو جاتی ہے۔ فرمان برداری اور نافرمانی اس کے ضمیر میں تخم کی مانند ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ"

[الشوریٰ: ۲۰]

''جوکوئی ارادہ کرتا ہے کھیتی آخرت کا زیادہ دیتے ہیں ہم اس کو بیچ کھیتی اس کی کے اور جوکوئی چاہتا ہے کھیتی دنیا کی دیتے ہیں ہم اس کو کچھ اس میں سے اور آخرت میں اس کیلئے کچھ حصہ نہیں۔

اور اس کی نشو ونما ہر دو صورت میں سے مطابقت پر مبنی ہے۔یعنی رحمی اور غضبی، ایک کی امداد کیلئے تنزیل ملائکہ، مطابق فرمان:

"اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ"

[حم السجدة: ۳۱تا۳۲]

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں یہ کہ مت خوف کرو اور نہ غم کرو اور خوشخبری سنو اس جنت کی کہ تھے تم وعدہ دیئے جاتے۔ہم دوست ہیں تمہارے بیچ زندگانی دنیا کے اور بیچ آخرت کے۔ اور تمہارے لئے بیچ اس کے جو کچھ چاہیں جی تمہارے اور تمہارے لئے ہے بیچ اس کے جو کچھ تم مانگو۔مہمانی ہے (اللہ تعالیٰ) بخشنے والے مہربان سے۔''

اور دوسرے کی تنزیل شیاطین، مطابق:

"هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ"

[الشعراء: ۲۲۱، ۲۲۲]

''کیا بتاؤں میں تم کو کہ کس پر اترتے ہیں شیطان، وہ اترتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر، شیطان اپنی سنی ہوئی ان پر ڈالتے ہیں اور اکثر ان کے جھوٹے ہیں۔''

کا ارشاد اظہر من الشمس ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی امداد من اللہ و رسول کی جاتی ہے

اور دوسرے کی امداد محض غضب وقہر اور مردودیت کے سوانہیں ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ" [الزخرف:۲٦]

''اور جوکوئی شب کوری کرے یاد خدا کی سے مقرر کرتے ہیں ہم واسطے اس کے ایک شیطان پس وہ واسطے اس کے ہم نشین ہوتا ہے۔''

لیکن یاد رہے کہ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی ١ کی زبردست سنت بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٢ کے رو سے ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کسی معصیت کا مرتکب نہ ہو مطابق ارشاد مولیٰ کریم، شیطان تصرف نہیں کرسکتا۔ اور یہ کئی وجہ پر منقسم ہے۔ اول: رغبت اور خواہشات کے ضمن میں زُيِّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ٣ کے مصداق ان کے اعمال کو زینت دینا، هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا [الکھف: ۱۰۴] ٤ کے رو سے دماغ میں خلل ڈالنا، اس پر آمادہ بلکہ مستقل کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی خاص تصرف میں خلل ڈالنا، اس پر آمادہ بلکہ مستقل کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی خاص تصرف نہیں ہوتا۔ جب انسان نیکی کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان لعین کے خرمن کو آگ لگ جاتی ہے، نامطابقت کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے، درد کمر بڑھنے لگتا ہے، باوجود اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ٥ کے دھوکا، فریب اور حیلے کرنے لگتا ہے، عبادت میں ریاکاری، آسائش میں بزرگی، تقویت میں رعونت اور تکبر، محبت الٰہی میں شریعت غرا اور فرماں برداری سے آزادی، توکل کے نشیب وفراز میں فکرمندی اور مایوسی، قبولیت خلق کو باعث زینت اور اس کی ہوس، بڑائی اور امارت کا سبق دیتا ہے۔ ماسوائے ان ہزلیات کے صاحب کشف وحال کو عجیب وغریب کیفیات میں ملبوس کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ملہم حقیقی کے الہام میں گڑبڑ مچاتا ہے۔ تخیلات اور استغراق تمنا میں خلل اندازی کرتا ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

١۔ پھیرتے ہیں ہم اس کو جدھر وہ پھرتا ہے۔ ٢۔ بسبب اس چیز کے کہ تھے وہ کماتے۔

٣۔ زینت دی واسطے ان کے شیطان نے ان کے اعمال کو۔

٤۔ وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کررہے ہیں۔

٥۔ بے شک مکر شیطان کا کمزور ہے۔

"وَمَآ اَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَانَبِیٍّ اِلَّااِذَاتَمَنّٰی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَایُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ،وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌo لِیَجْعَلَ مَایُلْقِی الشَّیْطٰنُ فِتْنَۃً لِّلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَرَضٌ وَّالْقَاسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ،وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍo وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَیُؤْمِنُوْابِہٖ فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُھُمْ وَاِنَّ اللّٰہَ لَھَادِالَّذِیْنَ آمَنُوْااِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ"

[الحج: ۵۲ تا ۵۴]

''اور نہیں بھیجا ہم نے پہلے تجھ سے کوئی رسول اور نہ نبی مگر جس وقت کہ آرزو کرتا تھا ڈال دیتا تھا شیطان بیچ آرزو اس کی کے پس موقوف کر دیتا ہے اللہ جو ڈالتا ہے شیطان پھر محکم کرتا ہے اللہ نشانیوں اپنی کو اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا۔ تاکہ کردے اس چیز کو کہ ڈالتا ہے شیطان آزمائش واسطے ان لوگوں کے کہ بیچ دلوں ان کے مرض ہے اور جو کہ سخت ہیں دل ان کے اور تحقیق ظالم البتہ بیچ خلاف دور کے ہیں اور تاکہ جانیں وہ لوگ کہ دیئے گئے ہیں علم یہ کہ وہ سچ ہے رب تیرے کی طرف سے پس ایمان لائیں ساتھ اس کے پس عاجزی کریں واسطے اس کے دل ان کے اور تحقیق اللہ راہ دکھانے والا ہے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے طرف راہ سیدھی کے۔''

لیکن ان آیات بینات سے یہ بھی صاف عیاں ہے کہ انبیائے کرام از راہ عنایت الٰہی اس بلا سے معصوم ہیں۔ قبل از حائل اس القا سے منزہ ہیں۔ اور مومن اولوالالباب اس میں تمیز کرنے والا ہوتا ہے۔ اور جن کے دل میں مرض ہے، ان کیلئے آزمائش ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے، ایک مناسبت اور مطابقت پر، اور دوسری مخالفت اور ناموافقت پر۔ دراصل یہ مطابقت، مخالفت سے اور مخالفت، مطابقت سے ملی جلی ہوئی ہے جن کا اصل ایک ہے۔ مخالفت نامناسبت کی وجہ پر موافقت اور مخالف نسبت سے دھوکا دے کر برطرف کرنا ہے۔ اور مناسبت اپنے ساتھ ملانے اور موافقت کرنے پر ہے جو عین مخالفت ہے۔ اس مشکل کے حل

کرنے کوارشاد مولیٰ کریم اظہر من الشمس ہے:

"اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ o وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ"

[البقرة:٢٥٧]

''اللہ دوستدار ہے ان لوگوں کا جوایمان لائے نکالتا ہے ان کواندھیروں سے طرف روشنی کے اور جولوگ کہ کافر ہوئے، دوست ان کے شیطان ہیں، نکالتے ہیں ان کوروشنی سے طرف اندھیروں کے۔ یہ لوگ ہیں رہنے والے آگ کے، وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

اب نورِ ایمانی سے معلوم ہوگا کہ نور سے ظلمات کی طرف نور سے مخالفت اور نار سے موافقت اور مناسبت ہے۔ اور نار سے نور کی طرف نار کی طرف، نار کی مخالفت اور نور سے موافقت اور مناسبت ہے۔ اس مقام پر انسان کی حالت نفس لوامہ کے مترادف ہوجاتی ہے۔ طالبان صادق کیلئے سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور اسی فکر میں مستغرق رہنا، اس غفور رحیم سے مدد طلب کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اور مریض قلب اور معصیت کی طرف جھک جانے والوں کیلئے تو معاملہ ہی صاف ہوجاتا ہے اور شیاطین سے موافقت اور مناسبت کی رو سے نسبت کامل کا حامل ہوجاتا ہے۔ ماخوذ فی الضمیر کے آئینہ سے صراط المستقیم کا معائنہ کرنے والا، تمام مدارج اور معارج کا بادشاہ، اپنے زعم میں مکمل اکمل ہو بیٹھتا ہے اور بحکم خدا مِنْکَ وَمِمَّنْ تَبِعَکَ [1] کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ درحقیقت مِنْکَ اور مِمَّنْ تَبِعَکَ [2] میں کوئی خاص فرق نہیں، صرف جنسیت کے لحاظ سے کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن نسبت کے رو سے کوئی تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے، قبیلہ کی بساط پر سب یکساں ہیں۔ ظاہر و باطن میں ایک دوسرے سے متفق اور ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ظاہراً مطابقت کی وجہ سے اور باطناً نسبت تنزیل شیاطین کے رو سے۔

۱۔ تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے۔

۲۔ تجھ سے اور ان سے جو تیری پیروی کریں۔

یادرہے کہ یہ مناسبت حالی خود بخود تعاون کے میدان میں استقلال اور تصرف کی مقتضی ہے اور نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفت، بلا وجوہ واسباب عداوت اور نا مطابقت ہے۔ نور اور نار کا سا حال ہے۔ یہ گروہ نور سے پرورش پانے والا ہے اور وہ نار سے۔ اور عجب یہ کہ سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے والا اور خصوصاً نسبت اور حال رکھنے والا عملی جامہ میں یا حالی بساط سے عمداً سرمو بھی تجاوز کرے تو فوراً نسبت مخالف کے تصرف کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اور صاحب حال تو اس کی کیفیات سے معاً مطلع ہو جاتا ہے اور یہ سب سے بڑا دھوکا ہے۔ اللہ کے بندے من اللہ حفاظت کی برکت سے محفوظ ہوتے ہیں۔ کیفیات وسرور، قبض وبسط وغیرہ دونوں طرف نمایاں ہوتے ہیں۔ گو گرمی سردی کا سا حال ہے، کفر واسلام کا معاملہ ہے، تاہم اس میں کئی وجہ پر دھوکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً توحید میں انکار رسالت، محبت اہل بیت میں بساط اطاعت اور متابعت سے برطرفی اور بے اعتنائی اور زہد وریاضت میں سنت کے خلاف ترک دنیا، بمصداق:

ما مقیماں بکوئے دلداریم
رخ بہ دنیا و دیں نمے آریم[۱]

لیکن اس امر کا فیصلہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے چند لفظوں میں ایسا واضح کر دیا ہے کہ کسی کلام کی گنجائش باقی نہیں رہی:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"[آل عمران: ۳۱] "کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، محبت کرے گا تم سے اللہ تعالیٰ۔"

عجب یہ ہے کہ سنت نبوی کا گروہ محض دعوت دینے اور ہمدردی اور خیر خواہی اور صراط المستقیم کی طرف بلانے والا ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا فریب نہیں ہے۔ لیکن ان سب امور کے باوجود دوسرے گروہ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ لیکن ان کا اثر متبعین سنت پر بہت جلد اور زبردست ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ اس مثال

۱۔ ہم اپنے دلدار کی گلی کے رہنے والے ہیں دین اور دنیا کی طرف ہم توجہ نہیں رکھتے۔

سے واضح ہوگی کہ اندھیرا دور کرنے اور چراغ روشن کرنے کیلئے بہت سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر اس کی حفاظت بھی از بس ضروری ہے لیکن ذرا سی مخالف ہوا سے چراغ کے گل ہو جانے سے اندھیرا خود بخود ہو جاتا ہے مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے انسان کی سرشتی حالت کو اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ [1] سے منسوب فرمایا ہے۔ سوائے تاثیرات سے متاثر ہونے کے کسی تعلیم کی حاجت نہیں ہے۔ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کا مقام یعنی دنیا و مافیھا یا صحت حال کی رو سے بشریت خود بخود استاد ہے۔

سب سے خطرناک اور لطیف تر اسلام اور دین الحق میں تصرف جو:

"وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ" [النحل: ۹]

''اور اوپر اللہ کے پہنچتی ہے، سیدھی راہ اور بعض ان میں سے ٹیڑھی ہیں۔''

کے مترادف ہے، توحید الٰہی اور محبت لامتناہی میں ہوا کرتا ہے۔ اور اس کا انحصار سراسر سعادت عبادت، ریاضت، ترک دنیا، رضائے الٰہی اور اخلاص پر مبنی ہے۔ اور وہ اس طرح پر ہے کہ اس عزیز الحکیم نے اپنی توحید اور محبت کو ایک ہی ظرف میں لبریز کر دیا ہے۔ فرمایا ہے:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" [البقرة: ۱۶۵]

''اور بعضے لوگوں میں سے وہ ہے کہ پکڑتا ہے سوائے اللہ کے شریک، محبت کرتے ہیں ان سے اللہ سے محبت کی طرح اور جو لوگ کہ ایمان لائے ہیں بہت سخت ہیں محبت میں واسطے اللہ کے۔''

جاننا چاہئے کہ شرک دو وجہ پر ہے۔ ایک جلی اور دوسرا خفی۔ جلی تو سوائے باری تعالیٰ کے کسی چیز کو معبود ٹھہرانا ہے۔ لیکن خفی جیسا کہ اس آیت پاک سے ظاہر ہو رہا ہے۔ محض محبت ہے۔ تو ان معانی سے کسی نبی اور رسول، مومن اور ولی سے محبت کرنا یا مدد مانگنا صریح شرک ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ یہ سب مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں شامل ہیں۔ لیکن دوسری جگہ:

۱۔ یقیناً نفس حکم کرنے والا ہے ساتھ برائی کے۔

''سوائے اس کے نہیں کہ دوست تمہارا اللہ ہے　　اِنَّمَاوَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا''

اور اس کا رسول اور جو لوگ ایمان لائے۔''　　[المائدہ:۵۵]

اس کے خلاف ہے۔ مان لیا کہ عوام الناس سے محبت من دون اللہ شرک اور کفر ہے لیکن جن ہستیوں کی تعریف اس خالق موجودات نے مخصوص فرمائی ہے وہ ہمارے دوست ہیں، ان کیلئے شرک کا گمان بھی کفر ہے۔ تو اس تضاد کی تطبیق کیلئے ماننا ہی پڑے گا کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سب کی محبت شرک ہے، مگر فی سبیل اللہ سرتاپا جائز بلکہ ذریعہ حصول مقصود ہے اور سبیل کا انکار سنت اللہ کا انکار اور اسباب سے اعراض ہے۔ اور اسباب کا انکار مسبب سے روگردانی ہے، اور یہ کفر ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اعتقاد کے میدان میں توحید ہی صراط المستقیم ہے۔ تمام سلسلہ نبوت ورسالت کے حامل توحید ہی لے کر آئے۔ یہی تعلیم دی۔ ظاہری، باطنی، قالی، افعالی اور حالی وجہ پر اقرار اور رویت سب کا سب اسی شجر کا ثمر ہے۔ اطاعت وفرماں برداری، صبر واستقامت اسی شجر کی پرورش اور حفاظت کا ذریعہ نیک ہے۔ اسلام وایمان کا انحصار اسی پر ہے۔ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس کے بغیر بے سود ہے۔ لیکن ایک گروہ اسلام نے جو اصل توحید سے بے خبر ہیں، اسے ایسا گھیر کے پکڑا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہو گئے ہیں اور ان کے سر پر زعمی توحید کا ایسا بھوت سوار ہوا ہے جس نے عقل سلیم کو بالکل ڈھانپ لیا ہے۔ حق وناحق دونوں کا انکار کر رکھا ہے۔ طریقت کو بدعت اور سبیل کو شرک خیال کرتے ہیں۔ گمان فاسد کے غبارہ کو اس انتہائی اوج فلک پر لے گئے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ساتھ پڑھنا شرک ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ ایسے کلمات سن کر کہنا ہی پڑے گا کہ بدون[۱] نور رسالت ایسی توحید، توحید ابلیس کے مترادف ہے اور اس کی نسبت سے عین مناسبت ہے۔ کیونکہ اس کا انکار غیر کو سجدہ کرنے کے رو سے تھا۔ لعنت کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا لیکن غیر کو سجدہ نہ کیا۔ موحد حنیف اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جس نے غیر کی عظمت کو تسلیم نہ کیا اور مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا[۲] کا تاج سر پر رکھے ہوئے مِنْکَ وَمِمَّنْ

۱۔ بغیر۔　　۲۔ مذمت کیا ہوا دھکے کھاتا۔

تبعک [۱] کے ہمراہ دوزخ کا ایندھن ہو گیا۔

دراصل ابلیس عَلَیہِ اللّعنَۃ نے امر خداوندی کا انکار کیا اور امر کا انکار آمر کا انکار ہوا کرتا ہے اور یہی کفر اور اس کی اصل ہے۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر مقام ومحل میں اسی کے مطابق عمل ہوا کرتا ہے اور سنت اللہ یعنی طریقہ احکم الحاکمین ہے۔ مطابق ارشاد لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً [۲] نہ کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ نادرات کے سوا کوئی حصول بھی سنت اللہ کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلاً (آپ خدا کے دستور کو کبھی پھرا ہوا نہ پائیں گے) دیکھئے! فرمان ہوتا ہے:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ o اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ o وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ o فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ"

[الفیل: ۱ تا ۵]

''کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو سرتاپا غلط نہ کر دیا؟ ان پر غول کے غول (ابابیل) پرندے بھیجے جو ان لوگوں کو کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے سو (اس طرح سے) ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔''

فَعَلَ رَبُّكَ کی نسبت محض فاعل حقیقی کی طرف عیاں ہے لیکن ظہور وعمل کے میدان میں ابابیل کا فعل مظہر ہے۔ عالم اسباب میں اسباب کی سنت کو کس قدر لازم رکھا ہے، دوسری جگہ اسی کے مترادف فرمایا:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا o ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا o"

[الفرقان: ۴۵، ۴۶]

''کیا تو نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ سایہ کو کیونکر پھیلایا ہے؟ اور اگر چاہتا تو اس کو تھما ہوا کر دیتا۔ پھر اس پر سورج کو علامت (دلیل) مقرر کیا۔ پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا۔''

۱۔ تجھ سے اور تیرے پیروکاروں میں سے۔

۲۔ ہرگز نہ پائے گا تو اللہ کے دستور میں تبدیلی۔

کیا ہی واضح فرمایا ہے کہ سایہ کا بڑھانا اور گھٹانا پھر اس کو اپنی طرف قبض کر لینا میرا فعل ہے لیکن اس فعل کیلئے شمس کو دلیل ٹھہرایا ہے۔ تو معلوم کیا چاہئے کہ اس فاعل حقیقی نے اپنے فعل کے ظہور کیلئے سورج کو رہنما پایا۔ عمل کے میدان میں مشاہدہ ہر کہ ومہ پر روشن ہے کہ ارض وسماء میں نظام شمسی معین فرمایا ہے۔ ظل وحرور، لیل ونہار، حرارت وبرودت، سب اسی کے نشیب وفراز، قرب وبعد اور کشف وحجاب کا نتیجہ ہے۔ کل موجودات کا خالق اس لم یزل ولایزال کے سوا کسی کو سمجھنا کفر اور شرک ہے لیکن موجودات یعنی نباتات اور معدنیات میں تصرف شمس کا انکار بھی اس سے کم نہیں۔

اب غور وفکر سے فرمان ایزدمتعال کا مطالعہ باعث رشد وہدایت ہوگا کہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا یعنی منور کر دینے والا چراغ یا آفتاب فرمایا ہے اور مومنوں کی مثال كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهُ یعنی نبات سے تشبیہ فرمائی ہے۔ جس طرح عالم دنیا میں جسمانیت کا رہبر شمس کو مقرر کیا ہے اسی طرح عالم روحانیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراجاً منیراً سے نامزد کیا ہے۔ ہر چند یہ دونوں شمس مخلوق کے سردار اور فیاض ہیں اور تا قیامت ان کا تصرف جاری وساری رہے گا۔

گو حضور کو شمس سے اور شمس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مثال دینا سراسر بے ادبی ہے مگر فہمائش کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں۔ ورنہ:

''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''[۱]

شمسین[۲] بفضلہ تعالیٰ تا قیامت فیاض وباتصرف رہیں گے۔ لیکن آفتاب نبوت قیامت کے بعد بھی رحمۃ اللعالمین اور اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ کے ضمن میں ابدی برسات سے قلبوں کو ٹھنڈا کرتے رہیں گے خواہ آفتاب کی مانند بمصداق:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ[۳]

۱۔ خاک کو پاکیزہ جہان کے ساتھ کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ ۲۔ دونوں سورج یعنی آسمانی سورج اور روحانیت کے آفتاب اعظم حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۳۔ اگر دن کو اُلّو کی آنکھ نہ دیکھے تو روشن آفتاب کا اس میں کیا قصور ہے؟

کور چشموں اور دل کے اندھوں کو سجھائی نہ دے۔

اس کور چشمی کو ہٹانے اور بصارت قلبی کے سجھانے کے لئے کیا ہی بیّن فیصلہ فرمادیا ہے کہ سِرَاجًا مُّنِيْرًا کے ساتھ معاً بلاعطف و جملہ معترضہ:

"وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا" [الاحزاب:۴۷]

''اور مومنوں کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے یہ بہت بڑا فضل ہے۔''

نازل فرمادیا ہے۔

اب عدل وانصاف سے کلام الٰہی کی تطبیق میں غور کرنا لازم ہے کہ آفتاب رسالت منور کرنے والا جس کا مفاد مومنین کیلئے عیاں ہے، کیا صرف ان مومنین کے لئے ہے جو معدودے چند حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ یا تمام مومنین کیلئے ہے جو گزر چکے ہیں اور فی زمانہ موجود ہیں؟ تو بروئے قرآن ماننا ہی پڑے گا کہ یہ حکم ان کیلئے بھی منسوخ نہیں ہے بلکہ ماضی، حال اور مستقبل سب وقتوں میں تصرف یکساں ہے۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ (اب بھی ہے جیسا کہ تھا) حیات النبی باتصرف ثابت ہوتے ہیں، اوران دلائل سے انکار کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

باوجودان دلائل اور نص قطعی کے بھی ضد اور تعصب کی بنا پر انکار ہوتو اس مرض کا کوئی علاج ہی نہیں۔ اور یہ ایسی گم گشتگی ہے جس کیلئے کوئی سراغ ہی نہیں۔ ایسی غرقابی ہے جس کیلئے کہیں ساحل ہی نہیں۔ کیونکہ اس منعمِ حقیقی نے سب سے بڑی اور انتہائی نعمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

"وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" [البقرۃ:۱۵۰۔۱۵۱]

''اور تاکہ پوری کروں میں نعمت اپنی اوپر تمہارے اور تاکہ تم راہ پاؤ۔ بھیجا ہم نے بیچ تمہارے پیغمبر تم میں سے۔ پڑھتا ہے تم پر آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت اور سکھاتا ہے تم کو جو کچھ نہیں تھے تم جانتے۔''

اوراس کا مفاد ذکٰــی پر رکھا ہے۔ان آیات کوغور سے مطالعہ فرمائیے۔کہ آیات کو پڑھ کر امر و نہی سے متنبہ کرنا تو یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا پر بس ہے اور یُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ اس نور سے نسبت ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم توجہ باطنی سے اپنی امت میں سے جس پر مہربانی فرمائیں۔بحکم خدا القا کر دیں۔اور کفران نعمت محرومی نعمت کی علت ہے۔اس بیان میں بہت طول ہے۔انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر بیان ہوگا۔اس لئے میں قلم کو روکتا ہوا اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ابتدا ہی سے دو نسبتوں (شر و خیر) کا عمل شروع ہے۔ایک (شر) کا سردار ابلیس لعین اور دوسری (خیر) کے شہنشاہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔جن کا ثبوت قرآن شریف سے ہو چکا ہے۔سب سے زیادہ سخت دھوکا ابلیس مردود کا یمین (دائیں طرف) یعنی نیکی کی طرف سے ہے۔جو صاحب نصیب نسبت نبوی سے کم و بیش حصہ رکھنے والے ہیں، وہ توفیق الٰہی سے صراط المستقیم پر چلے جا رہے ہیں۔جو سراسر نعمت عظمیٰ:

"ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ"[الفتح:۲۸]	''وہ (اللہ تعالیٰ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ۔''

سے حصہ لینے والے ہیں، اور دوسرے اس سے اعراض کرنے والے اپنے زعم کے دریائے توحید میں غوطہ زن ہونے کے بعد انکار رسالت کے ساحل پر سر نکالنے والے، حقیقتِ توحید سے جاہل، اثباتِ توحید کے بجائے نفی شرک کو عین توحید خیال کرنے والے، نسبت رسالت سے محروم، اپنے مقصود سے معدوم، اپنی سیاہی قلب سے لکھی ہوئی کتاب کو سامعین کے روبرو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نصب العین ان آیات سے یہ ہے کہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور امر و نواہی کے مطابق دین الحق کی تلقین کر کے چلے گئے۔اس سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت خیال کرنا یا خوف و رجا کے ماتحت اعتقاد رکھنا گمراہی اور ضلالت ہے۔''

جاننا چاہئے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔کفر و اسلام، نفاق و ایمان، خیر و شر، نور و ظلمت، موت و حیات و مثلہم۔تو نور رسالت سے انکار اور اعراض بھی اپنی ضد کے سوا نہیں۔پھر نور کی نسبت کا

حصول کیسے اور کس جگہ سے ہوسکتا ہے؟ خداوند کریم جل وعلا نے اس امر کو واضح کرنے کیلئے کیا ہی بین (واضح) ارشاد فرمایا ہے:

"قَدْجَآءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌوَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" [المائدة:١٥]

''بے شک آیا ہے تمہارے پاس اللہ تعالیٰ سے نور اور کتاب بیان کرنے والی۔''

کلام الٰہی میں نور کا لفظ بہت سی آیات میں مذکور ہے۔ مثلاً:

١. "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِوَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِاِلَى الظُّلُمٰتِ"[البقرة:٢٥٧]

''اللہ والی ہے مسلمانوں کا، انہیں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور کافروں کے حمایتی شیطان ہیں۔ وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔''

٢. اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرِ" [الانعام:١]

''سب خوبیاں اللہ کو جس نے آسمان اور زمین بنائے، اور اندھیرے اور روشنی پیدا کی۔''

٣. "قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًاوَّهُدًى لِّلنَّاسِ" [الانعام:٩١]

''تم فرماؤ کس نے اتاری، وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے روشنی اور لوگوں کے لئے ہدایت۔''

٤. "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًافَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَالَهٗ نُوْرًايَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ" [الانعام:١٢٢]

''اور کیا وہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کیلئے ایک نور کردیا جس سے لوگوں میں چلتا ہے۔''

٥. "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْانُوْرَاللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّااَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْكَرِهَ الْكَافِرُوْنَ"[التوبة:٣٢]

''چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے منہ سے بجھادیں اور اللہ نہ مانے گا مگر اپنے نور کا پورا کرنا، اگرچہ برا مانیں کافر۔''

٦. "قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ"

[الرعد:١٦]

''تم فرماؤ کیا برابر ہو جائیں گے اندھا اور دیکھنے والا؟ کیا برابر ہو جائیں گے اندھیرے اور اجالا۔''

٧. "هُوَالَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ"

[الاحزاب:٤٣]

''وہی ہے کہ درود بھیجتا ہے تم پر وہ اور اس کے فرشتے کہ تمہیں اندھیروں سے اجالے کی طرف نکالے۔''

٨. "وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ○ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ"

[الفاطر:١٩، ٢٠]

''اور برابر نہیں اندھا اور دیکھنے والا، اور نہ ہی اندھیرے اور اجالا۔''

٩. "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ"

[الزمر:٢٢]

''تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہیں۔''

١٠. "مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"

[الشوریٰ:٥٢]

''اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل، ہاں ہم نے اسے نور کیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں سے جسے چاہتے ہیں۔''

١١. "هُوَالَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" [الحدید:٩]

''وہی ہے کہ اپنے بندہ پر روشن آیتیں اتارتا ہے تا کہ تمہیں اندھیروں سے اجالے کی طرف لے جائے۔''

١٢. "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ وہ اپنی رحمت کے دو حصے

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ"[الحدید:۲۸]

"تمہیں عطا فرمائے گا، اور تمہارے لئے نور کر دے گا جس میں چلو اور تمہیں بخش دے گا۔"

۱۳۔ "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ"

[الصف:۸]

"چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے۔ اگرچہ برا منائیں کافر۔"

۱۴۔ "رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ"

[الطلاق:۱۱]

"وہ رسول کہ تم پر اللہ کی روشن آیتیں پڑھتا ہے تاکہ انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اندھیروں سے اجالے کی طرف لے جائے۔"

۱۵۔ "يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ"[التحریم:۸]

"جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا نبی اور ان کے ساتھ کے ایمان والوں کو، ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے آگے اور ان کے داہنے۔"

ان آیات مبارکہ میں سے اکثر کے معانی اور تفسیر میں دو گروہ کا اختلاف ہے۔ ایک کے نزدیک تو نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور دوسرے گروہ کے افراد اس سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ مناظرہ ومباحثہ میں اس حد حیا تک پہنچتے ہیں کہ: "کیا حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی لحیہ مبارک سیاہ نور تھی؟" اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ ایسے شخصوں کا تو انجام بھی خطرہ میں ہے۔

صحت حال اور تطبیق کلام الٰہی کی رو سے ایک نے تو کم فہمی کی بنا پر غلو کیا ہے، اور دوسرا انکار اور کفر کی وجہ پر حقیقت سے دور ہوا ہے۔ کیونکہ ان تمام آیات پر غور وفکر کرنے سے بحث وتنقید کا میدان ختم نہیں ہوسکتا۔ دوسرے گروہ نے ؛قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ میں نور اور کتاب مبین کو ایک سمجھنے میں غلو کیا ہے اور اس کیلئے :قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ کو دلیل پکڑتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ کتاب انسانوں کیلئے نور اور ہدایت ہے۔ لیکن اس کے حامل انسان ہیں

عمل کے رو سے اور فرمانبرداری کی وجہ پر۔اوراس کا نور ہونا عملی جامہ میں مستور ہے۔ورنہ یہ صرف عبارت ہے جوصحتِ صوت کے لحاظ سے حروف اور الفاظ کے لباس میں ملبوس ہے۔معانی اور برکات واسرار کے حامل تو وہ اشخاص ہی ہیں جو ایمان رکھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے نُوْرٌعَلٰی نُوْرٍ ہے جس کا اصل صفت بالذات مولیٰ کریم کے قدوسی پردہ میں نہاں ہے۔لیکن دوسری تمام آیات میں سے ایک کی بھی اس کے ساتھ تطبیق نہیں ہے۔غور سے مطالعہ کرنا روز روشن کی طرح ظاہر کردیتا ہے۔بالخصوص آیات نمبر۴، ۹، ۱۰، ۱۱اور ۱۵ بالکل واضح ہیں کہ نُوْرٌمِّنْ نُوْرِاللّٰہِ ایک نعمت عظمیٰ اور حیاتِ ابدی ہے جس سے ہدایت فی الدنیا اور مدارج فی الاخرۃ حاصل ہوا کرتے ہیں، نہ ہی یہ کتاب ہے اور نہ ہی مومن اور مرسل ہو سکتے ہیں۔اختلاف صرف عارضہ اور کم فہمی کے سبب سے ہے۔تعجب ہے کہ کتاب کو (جو کاغذ، سیاہی اور حروف والفاظ کی شکل وصورت، ہر ایک چیز سراسر حدث ہے) نور ماننے پر مصر ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور مان لینے میں کس وجہ سے انکار ہے؟ کوئی خاص عداوت ہے جس پر انکار کا انحصار ہے۔

پہلا گروہ کسی حد تک حق پر ہے۔اس کی غلطی کا انحصار حفظ مدارج پر ہے۔اور وہ اس لئے کہ انسان کی حالت اسفل اور اعلیٰ کئی درجوں پر منقسم ہے۔مثلاً مسلم، کافر، مومن ومنافق، عالم وجاہل، روح وبشر ومثلہم۔انسان جس نسبت سے مناسبت پیدا کرتا ہے اسی صفت سے موصوف اور اسی اسم سے موسوم ہو جاتا ہے۔جیسا کہ مسلم کو اسلام سے، کافر کو کفر سے، مومن کو ایمان سے، منافق کو نفاق سے، عالم کو علم سے اور جاہل کو جہالت سے نسبت ہے۔قرآن حکیم بھی انہی صفات اور اسماء سے مخاطب کرتا ہے۔جیسا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا (اے ایمان لانے والو!)، یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (اے کافرو!) وغیرہما۔مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ سوائے انسان کے (جو ذاتی اسم ہے) باقی سب صفاتی نام ہیں اور ہر ایک کو اس کی صفت سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ولی کو ولایت سے، نبی کو نبوت سے، رسول کو رسالت سے نسبت ہے اوران سب نسبتوں کا تعلق اس خالق موجودات سے ہے، خواہ مقبولیت سے ہو یا مردودیت سے۔فرق صرف یہ ہے کہ مطابق فرمان مولیٰ کریم:

"لَاتَجِدُقَوْمًايُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرَةِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّاللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَوْكَانُوْااٰبَآءَ هُمْ اَوْاَبْنَآءَ هُمْ اَوْاِخْوَانَهُمْ اَوْعَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ"

[المجادلة:۲۲]

''نہ پائے گا تو کسی قوم کو کہ ایمان لاتے ہوں ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے دوستی کریں ساتھ اس شخص کے کہ مقابلہ کرتا ہے اللہ کا اور رسول اس کے کا اگرچہ ہوں باپ ان کے یا بیٹے ان کے یا بھائی ان کے یا کنبہ ان کا یہ لوگ، لکھ دیا ہے اللہ نے بیچ دلوں ان کے کے، ایمان اور قوت دی ہے ان کو ساتھ روح کے اپنی طرف سے۔''

اور مطابق:

"وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًافَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ"

[الزخرف:۳۷]

''اور جو کوئی شب کوری کرے یاد خدا کی سے، مقرر کرتے ہیں ہم واسطے اس کے ایک شیطان، پس وہ واسطے اس کے ہم نشیں ہوتا ہے۔''

جیسا کہ فاعل حقیقی نے فرمایا ہے کہ:

"مَآاَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍفَمِنَ اللّٰهِ وَمَااَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍفَمِنْ نَّفْسِكَ"

[النساء:۷۹]

''جو کچھ پہنچے تمہیں نیکی سے پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو کچھ پہنچے تمہیں برائی سے پس وہ تمہارے اپنے نفس سے ہے۔''

اور مطابق:

"اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَعَلٰى نُوْرٍمِّنْ رَّبِّهٖ"

[الزمر:۲۲]

''کیا پس جو شخص کہ کھولا ہے اللہ نے سینہ اس کا واسطے اسلام کے پس وہ اوپر نور کے ہے، اپنے رب سے۔''

یعنی اس کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور نور سے ظلمات کی طرف کی نسبت شیطانوں کی طرف کی ہے۔ اور اس نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے مومن کی ہدایت کو اپنے نور سے ارشاد فرمایا ہے،

مطابق: يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَشَاءُ یعنی جس کو چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے۔
یادر ہے کہ یہ تعلیم خارجی نہیں ہے کہ امر ونہی کی طرح دعوت عمل ہو، بلکہ اس کی رحمت سے انسانی ضمیر میں ودیعت کے مترادف ہے۔ایک طاقت ہے جو رگ وریشہ میں سما جاتی ہے۔ایک قوت ہے کہ طاقت جسمانی کو جو بہیمیت کے مترادف ہے، کمزور کر دیتی ہے۔قرب خداوندی، لقائے الٰہی اور مشاہدہ لامتناہی، بصیرت قلبی اس کے فرع کا حکم رکھتی ہے اس کا چلنا پھرنا، کلام وگفتار، صحت وبیماری اسی وجہ پر نمایاں ہوتی ہے۔بارہا کے تجربہ سے ثابت ہے کہ جب بندگان خدا کو اس میں ذرا کمی واقع ہوتی ہے تو کمزور اور بیمار ہو جاتے ہیں لیکن جب یہ درد درست ہوتا ہے تو قوی، توانا اور تندرست ہو جاتے ہیں۔
بمصداق:

چو تو پنہاں شوی ازمن ہمہ تاریکی وکفرم چو تو پیدا شوی برمن مسلمانم بجان تو[1]

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ" [الانعام:۱۲۲]

"کیا جو شخص کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کو نور عطا کیا کہ اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔"

خبردار! یہ حال تو مومن کا ہے کہ خدا کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔اسی کے نور سے فی الدنیا والآخرة انسانوں میں چلتا پھرتا ہے، حیات ابدی کا حامل ہو جاتا ہے۔گو ایسے شخص کی بشریت مفقود نہیں ہوتی لیکن صفات الٰہی سے متصف[2] ہو جاتی ہے۔بمصداق:

۱۔جب تو مجھ سے پوشیدہ ہو جائے تو تب میں کفر وتاریکی میں ہوں گا اور جب تو میرے سامنے ظاہر ہو جائے تو تیرے وجود کی وجہ سے میں مسلمان ہوں گا۔۲۔حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر سوم مکتوب نمبر ۵۳ میں تحریر فرماتے ہیں: "فنا کے یہ معنی نہیں کہ وجود زائل ہو جائے اور نہ ہی بقا کے یہ معنی ہیں کہ ممکن سے امکان بالکل زائل ہو جائے اور اس کو وجوب حاصل ہو جائے۔کیونکہ یہ محال عقلی ہے اور اس کے قائل ہونے سے کفر لازم آتا ہے۔بلکہ اس کے معنی امکانیت کے باقی رہنے کے باوجود خلع ولبس کے ہیں۔یعنی صفات بشریت سے نکلنا اور صفات الٰہی سے موصوف ہونا۔"

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود[1]

مرسلین کا حال اس سے وراء ہے، جس کے بیان کا کسی کو یارا نہیں۔ سوائے اس کے کہ حسب استعداد کلام الٰہی سے کچھ ذکر کیا جائے۔ اور خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت صرف نور کہنا بے ادبی ہے۔ کیونکہ عزیز الحکیم نے اپنے بندے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانچ وہبی صفات سے خاص فرمایا ہے:

"یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ٥ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ٥ وَّبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا"

[الاحزاب: ٤٥ تا ٤٧]

"اے نبی! یقیناً ہم نے بھیجا ہے تجھ کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا طرف اللہ کی ساتھ اس کے حکم کے اور چراغ روشن اور خوشخبری دے ایمان والوں کو کہ واسطے ان کے ہے اللہ کی طرف سے فضل بڑا۔"

یہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ اس خالق کائنات نے بلا محنت و مشقت بلکہ بلا طلب اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان صفات حسنہ سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے۔ دوسرا صفات کے علاوہ سِرَاجًا مُّنِیْرًا کا مفاد مومنین کیلئے بشارت و رحمت تاکید مزید کے ساتھ مِنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا پر رکھا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جس طرح شمس کو رہنما بنایا ہے اور سایہ کے بڑھنے اور سکڑنے کو جو سوائے کسی چیز کے بذاتہٖ کوئی وجود نہیں رکھتا، اپنی جانب منسوب فرمایا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روحانیت کا رہنما بنایا ہے۔ سِرَاجًا مُّنِیْرًا جو لغت کے لحاظ سے اسم فاعل ہے۔ تو موافق ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَللّٰہُ مُعْطِیْ وَاَنَا قَاسِمٌ[2] کے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کے معنی منور کر دینے والے ہیں۔ اور اس فاعل حقیقی نے اپنے فعل کے اجراء کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ضمیر میں جاری کر دیا ہے۔ یا صحیح معنوں

١۔ اس (اللہ کے بندے) کا فرمایا ہوا خود اللہ کا فرمایا ہوا ہی ہوتا ہے ہاں اگرچہ یہ گفتگو اللہ کے بندے کے حلق سے نکلتی ہے۔

٢۔ اللہ تعالیٰ مجھے عطا فرمانے والا ہے اور میں بانٹنے والا ہوں۔

میں فاعل کے رو سے مختار کر دیا ہے۔اس کے خلاف خیال کرنا سراسر انکار کلام اللہ اور مشیت ایزدمتعال پر اعتراض ہے جو سراپا کفر پر مبنی ہے۔اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ١

نتیجہ اس عبارت سے یہ ہوا کہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ٢ میں مفسرین کے بہت اقوال ہیں۔جن میں فرع کے لحاظ سے اختلاف ہے اور اس میں بہت طول ہے جو اس جگہ مقصود نہیں ہے۔اور پہلے بیان ہو چکا ہے۔مختصر طور پر صرف اتنا کافی ہے کہ مطابق قرآن مجید تمام خیر و برکت،ثواب ورحمت، توفیق وطاقت،نور وہدایت من اللہ ہی ہے اور اس کی سبیل وصراط مستقیم ،ہادی وراہنما اپنی سنت کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنایا ہے اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا کا خطاب عنایت فرمایا ہے یعنی منور کرنے والا سورج۔جس طرح وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ٣ کے ضمن میں یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ ٤ کو اپنی نسبت سے منسوب کیا ہے۔لیکن صراط المستقیم اور صحت حال کی رو سے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ٥ پر انحصار رکھا ہے،اسی طرح نور وہدایت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن طریقت کے لحاظ سے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کو رہنما فرمایا ہے۔اور یہ سلسلہ سینہ بہ سینہ جاری ہے اور تا قیامت جاری وساری رہے گا۔جس کیلئے قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ٦ کا فرمان روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بجلی کا مبداء یا منبع پانی یا کوئی اور چیز ہے جس کے اخذ کرنے کیلئے انجن تیار کیا گیا ہے۔اور اس انجن سے تاروں کے ذریعہ سے دور دراز مقامات تک بجلی کے چھوٹے بڑے لیمپ روشنی کرتے ہیں۔کئی کارخانے مشینوں کے ذریعے کاروبار کرتے ہیں۔اگر مبداء سے بجلی کی آمد بند ہو جائے تو ان اوزار وظروف سے کوئی فعل سرزد نہیں ہوسکتا۔سب مانند مردہ بے حس وحرکت پڑے نظر آئیں

١۔پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے اپنے نفس کی برائیوں اور اپنے برے اعمال سے۔

٢۔نور آسمانوں کا اور زمین کا۔ ٣۔اور جو لوگ ایمان لائے بے حد محبت رکھتے ہیں اللہ سے۔

٤۔محبت رکھتا ہے وہ ان سے اور وہ محبت رکھتے ہیں اس (اللہ تعالیٰ) سے۔

٥۔اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

٦۔بیچ کا راستہ اور اس سے ٹیڑھے راستے۔

گے۔لیکن جب برقی رو درست ہوئی اور بجلی کی آمد جس کو امر الٰہی اور فاعل حقیقی کے تصرف سے تشبیہ دینا بجا و درست ہوگا، بدستور جاری ہوئی تو سب لیمپ (بلب) روشن اور کاروبار کی مشینیں فاعل ہوں گی۔اس مثال سے یہ مفاد حاصل کرنا چاہئے کہ مبداء بجلی نور ذات باری تعالیٰ ہے، اور کارخانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور تار اور لیمپ یعنی بلب اولیائے کرام اور مومن ہیں۔اگر بلب میں نقص واقعہ ہو جائے تو بجلی کی رو جاری ہونے کے باوجود وہ روشن نہیں ہوسکتا۔اور اگر بلب صحیح سالم تار اور آئینہ سمیت درست ہو لیکن اس کو کھینچ کر برقی رو سے الگ کردیا جائے تو خواہ راستہ بجلی بدستور کھلا رہے لیمپ روشن نہیں ہوگا اور نہ ہی طاقت بجلی خرچ یا ضائع ہوگی۔مطلب یہ ہے کہ طاقت بجلی بغیر درستی بلب کے اور بلب بغیر برقی طاقت کے کارآمد نہیں ہوسکتے۔اور تاریں اور لیمپ سب کے سب کارخانے کے محتاج ہیں اور کارخانہ یا انجن بغیر منبع بجلی کے کچھ تصرف نہیں رکھتا۔چھوٹے سے بڑا اور بڑے سے چھوٹا ہر ایک بلب حسب استعداد روشن ہر زمانہ میں معروف ہے۔

یاد رہے کہ جس طرح یہ سلسلہ طریقت صراط المستقیم پر جاری ہے، اسی طرح اس کے برخلاف سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر دو نسبتوں کا جہان میں شور برپا ہے۔ایک مطابق قَصْدُ السَّبِيْلِ خدا تک پہنچتا ہے اور دوسرا مِنْهَا جَآئِرٌ کے موافق عزازیل (شیطان) تک رہ جاتا ہے۔بمصداق:

ہر گز بکعبہ نہ رسی اے اعرابی!

آن راہ کہ تو می روی بترکستان است [۱]

لیکن بایں ہمہ اس گروہ کا تصرف میدان دنیا میں بڑھ چڑھ کر ہے، کرامت کی جگہ استدراج کی وجہ پر دنیا والوں کے کاموں میں حیرت انگیز تصرف رکھتا ہے۔

غور طلب امر تو یہ ہے کہ یہ اپنے حال میں خوش كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ [۲] کے موافق شاداں و فرحاں بلکہ دوسرے فرقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اپنی ترک دنیا کے مقابلہ میں ان کو دنیا

۱۔اے اعرابی تو ہرگز کعبہ شریف تک نہ پہنچ سکے گا کیونکہ جس راستہ پر تو چل رہا ہے وہ ترکستان کا ہے۔

۲۔ہر ایک گروہ اپنی یافت پر خوش ہے۔

دار خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو حال کی رو سے اچھا خیال کرتے ہیں تو اس کو بھی اسفل منزل کا مقیم سمجھتے ہیں اور اپنے حال کو سب سے اعلیٰ اور ارفع جانتے ہیں۔ غرضیکہ اپنی نسبت کے پورے شکار ہوتے ہیں۔ مطابق اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ [1] دوسرے کے حال کو دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے حال کے دیوانے، سرور کے متوالے، اپنی دھن میں جانے والے۔ لیکن یہ سب یکساں نہیں ہوتے بعض ان میں سے شریعتِ غرا یعنی صوم وصلوٰۃ کے پابند، سنت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عظمت ورسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے حال میں کچھ تامل ہے لیکن نسبت خلاف نبوت خطرہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور وہ اس لئے کہ اس گروہ سے جو محض خشک توحید کے پودے اور نور رسالت سے سراسر محروم ہیں، کی اس گروہ سے موافقت پائی گئی ہے۔

قصہ مختصر، روئے خطاب تو خصوصاً اس گروہ کی طرف ہے جن کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف انکار ہے۔ صرف اعراض ہی نہیں بلکہ اعتراض تک ان کے کلام سے ظاہر ہو چکا ہے اور ابلیس عَلَیْهِ اللَّعْنَة سے مطابقت ثابت ہے۔ بلکہ اس کے حق میں تعریف اور رفعت کو کلام واشعار میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کہتا ہے:

تیری نہ مانی اے حضرت شیطان عجیب	جو قدم بوسی کرے صورت انسان عجیب
تو نے نہ مانا مگر تجھ کو خدا مان گیا!	پھر تیرا ہی ذکر کرے ناطق قرآن عجیب
نسل آدم پہ ارے خوف تیرا طاری	پھر جاری ہر ایک جگہ تیرا ہی فرمان عجیب
جس نے دیکھا ہے تمہیں اس نے خدا دیکھ لیا	پر تیری کچھ ایسی انوکھی سی ہے پہچان عجیب

صوفی بیچارے کو بھی تیری چاہ نے مارا
ورنہ یہ بھی تھا کسی ملک کا سلطان عجیب

الامان! [2] یہ گروہ اس نسبت سے پورا حصہ لینے والا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ میدان قیامت میں ان کے

۱۔ وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔
۲۔ اللہ کی پناہ۔

راز کی قلعی کھل جائے گی۔ حقیقت کا انکشاف ان کیلئے روز روشن کا حکم رکھے گا۔ تب اپنے ظلم اور تعدی کی داد یتے ہوئے کف حسرت مل کر کہیں گے:

"وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًاo يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا o لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَ نِىْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا"

[الفرقان:۲۷تا۲۹]

''اور جس دن ظالم کاٹ کاٹ کر کھائے گا اوپر دونوں ہاتھوں اپنے کے، کہے گا اے کاش! کہ پکڑتا میں ساتھ رسول کے راستہ، اے وائے ہے مجھ کو کاش کہ نہ پکڑتا میں فلانے کو دوست۔ البتہ بے شک گمراہ کیا اس نے مجھ کو ذکر سے پیچھے اس کے کہ آیا میرے پاس، اور ہے شیطان آدمی کو ہلاکت میں ڈالنے والا۔''

هیہــــات! اس وقت اس تعلق و رفاقت، خلت و محبت اور نسبت و مناسبت کا علم ہو جائے گا لیکن بے سود۔ ہر ایک زمرہ (گروہ) اپنے پیشوا کے پیچھے مطابق حال و مناسبت کچھ دوزخ کی طرف اور کچھ جنت کی طرف ہنکایا جائے گا۔ لیکن متبع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ تمام انبیاء و مرسلین لوائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ میں عین مقصود اور حصول کو پانے والے مشکور و ممنون ہوں گے اور نسبت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرتاپا مستغرق و محفوظ ہو جائیں گے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ!

فریب نفس اور شیطانی دھوکے

خواص بشریہ:

جاننا چاہیے کہ اس خالق کائنات نے انسان کی فطرت کو از حد متاثر بنایا ہے، اور یہی اس کی ہر قسم کی ترقی کا باعث ہے۔خواہ ناری طبقات سے ہو یا نوری، پاکی ہو یا پلیدی، نیکی ہو یا برائی، خیر ہو یا شر، نفع ہو یا نقصان، ہر ایک فعل سے متاثر، ہر ایک نسبت سے مناسبت اختیار کر جانے والا اور "اَلْعَادَۃُ طَبِیْعَۃٌ ثَانِیَۃٌ" (عادت دوسری طبیعت بن جاتی ہے) کے مصداق ہر رنگ میں رنگ جانے والا ہوتا ہے۔ جہان میں اس کی بے شمار مثالیں موجود اور مشہور ہیں۔

مثلاً کوئی شخص پہلی دفعہ ایک رتی بھر افیون کھالے تو اس کو کافی نشہ ہو جاتا ہے۔لیکن آہستہ آہستہ بوجہ خون غلیظ ہونے کے زیادہ مقدار میں کھانے کے سوا چونکہ پیوست اور حدت خون میں ناکافی تحریک ہوتی ہے۔اس لئے مقدار بڑھتی جاتی ہے اور تولہ دو تولہ تک کھانے سے ایک رتی مقدار کے برابر نشہ ہوتا ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بجائے افیون کے سنکھیا کھا جاتے ہیں۔بعض کی حالت اس درجہ تک ہو جاتی ہے۔کہ ایک زہریلا سانپ رکھا ہوتا ہے۔افیون اور سنکھیا نہ ملنے کی صورت میں زبان پر سانپ ڈسا لیتے ہیں، تب ان کا وقت گزرتا ہے۔دوسرے کیلئے ان سمیات (تمام زہر) کا استعمال موجب ہلاکت ہے اور اس کے واسطے صرف نشہ تو درکنار سوائے ان سمیات کے کھانے کے چلنا پھرنا بھی دشوار اور بالکل ترک میں بلاشبہ موت کا شکار۔ایک کیلئے زہر قاتل ہے اور دوسرے کیلئے تریاق۔دراصل دونوں کیلئے زہر قاتل ہی تھا لیکن عادت ہو جانے کی وجہ سے اور ضمیر کے فنا اور زہر سے بقا حاصل کرنے سے وجود میں سم کا ایک وجود پیدا ہو گیا جو غذا کی مانند طاقت کا سبب بن گیا۔اسی طرح ہر عمل اور ہر نسبت سے مناسبت اختیار کر کے مطابق فرمان مولیٰ کریم:

"کُلُّ امْرِءٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ" [الطور: ۲۱]

"ہر آدمی بیچ اس چیز کے کہ کمایا ہے گرفتار ہے۔"

کے قیدی اور مجبور ہو جاتا ہے۔

شیریں آب کی مچھلی تلخ آب میں مر جاتی ہے اور تلخ آب کی مچھلی آب شیریں میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ گرم ملک کے باشندے خطہ سرد کو بلائے جان سمجھتے ہیں اور سرد ملک کے باشندے گرم ملک کو عذابِ جان جانتے ہیں۔

"كُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَيْهِمْ فَرِحُوْن" ''ہرایک گروہ، ساتھ اس چیز کے، کہ پاس اس کے ہے، خوش ہے۔'' [المؤمنون: ۵۳]

کے موافق ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے

اسی طرح ہر اثر سے تعلق اور ہر تعلق سے متاثر ہونا لازم ہے۔ پیدائش ہی سے جبکہ میدانِ علم بھی اس کیلئے تنگ تھا، تاثرات سے متاثر ہونا جاری ہی رہا اور ہر قسم کا اثر نیک ہو یا بد، اسلام ہو یا کفر، اس کی فطرت پر صفاتی نقش و نگار سے ایسی گل کاری کرتا ہے کہ نقش بر سنگ ہو جاتا ہے، جس کا مٹانا اور اس کی جگہ دوسرا نقش جمانا دشوار بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے مثلاً ہندو بچہ ''رام رام'' کرتا ہوا پرسن (بوڑھا) ہو جاتا ہے لیکن ''اللہ اللہ'' کرنا اس کیلئے کفر ہے۔ اسی طرح مسلمان اسمائے الہیہ کے ذکر سے مطمئنہ ہوتا ہے۔ لیکن ''رام رام'' کہنا اس کے لیے بلائے جان ہے۔ غرض ہر قسم کے اثرات سے جوارح کے راستے حوض دل کا (جو بے رنگ پانی کی طرح ہے) رنگین ہونا لازم ہے اور تاثرات، گو خارجی ہوتے ہیں لیکن جب عادت کرتے کرتے طبیعت ثانیہ کی حد تک پہنچ جائیں تو ذاتی کا حکم رکھتے ہیں۔ تب وہ شخص اپنے ضمیر کا بندہ اور اپنی خواہشات کا شیدا ہو جاتا ہے "اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" (کیا آپ نے نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا ہے) کا حکم اس کے لئے درست ہو جاتا ہے۔ لیکن صرف اس کو برائی ہی کی طرف حصر کرنا سراسر خطا ہے کیونکہ یہ اصطلاحات دینیہ میں

شیطانی فریب

سے نامزد ہے اور یہ بالکل درست و بجا ہے۔ کیونکہ دنیا و مافیہا کی طرف نفسِ امارہ (جس کو امارہ بالسوء فرمایا ہے) کا رجوع بلا دعوت ہے۔ اس میں شیطانی تصرف رغبت کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ

سودکا قاعدہ اور نفع کا شجر ہے، حرص کا میدان اور رذیل حظ کا سامان ہے۔ البتہ نیکی کی طرف شیطانی تصرف بڑی محنت سے ہے۔ یعنی نیکی میں دھوکا دینا ہے "وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" میں ان کے اعمال کو مطابق "زُيِّنَ لَهُمْ سُوْءُ اَعْمَالِهِمْ" (شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال مزین کر دیے) مزین کرنا ہوتا ہے جہاں میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور تصرف معروف۔

عوام وخواص کے نزدیک دنیا و مافیہا کو ترک کرنا اور روحانیت کے میدان میں قدم رکھنا اعلیٰ مقصود ہے۔ لیکن اس کا علم اور عمل نہایت مشکل ہے اور تمیز نہایت دشوار۔

ایک گروہ کے نزدیک علم امر ونواہی اور قوانین اسلام (جو محض نظام کی درستی اور ضروریات نفس کے حلال وحرام اور جائز و نا جائز کو جاننا ہے) اور اس پر کار بند ہونا اصل مقصود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ بے حد ضروری ہے۔ نفس کی تادیب اور اصلاح کے لئے سامان، رجوع الی اللہ کی سبیل اور مہذب بننے کا شیوہ ہے، آخرت کے لیے سرمایہ، گناہوں کی مغفرت کا سبب، کامیابی کا راستہ، مولیٰ کریم کی خوشنودی کا ذریعہ، یوم حشر میں آرام حاصل کرنے کا طریقہ اور حصول نعمات کے لیے نیک مجاہدہ ہے۔ لیکن ہدایت یعنی ذات باری تعالیٰ کے مشاہدہ ولقا اور قرب خداوندی کے مقام کی علت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ محض فضل ایزدی ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ" [یونس: ۹]

"بے شک جو لوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ہدایت دے گا ان کو اللہ تعالیٰ بسبب ان کے ایمان کے۔"

ہیہات، آج کل تو معاملہ الٹ ہو رہا ہے، عمل تو در کنار، علم کے حصول میں نیت ہی درست نہیں ہوتی عالم اور مناظر ومباحث بننے، فخر اور تکبر کی دستار باندھنے، حصول دنیا کا ذریعہ بنانے کے لئے عمر ضائع کر بیٹھتے ہیں، اور فقط اسی یافت و یاب کو معراج کمال سمجھ لیتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ صرف اسی پر ہی بس نہیں ہے۔ اولیاء اللہ اور انبیاء کرام کے علم کو بھی اسی پر حصر کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ان سے اکمل و افضل جانتے ہیں اور اپنے زعمی مراتب کی وجہ سے جہالت کے دریا میں ایسے مستغرق ہوئے ہیں کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ

(میں اس سے بہتر ہوں) سے سر نکالنا ناممکن ہو گیا ہے۔ الامان!

"یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡهِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِکۡرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ الشَّیۡطٰنِ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ"

[المجادلة:۱۸،۱۹]

"گمان کرتے ہیں یہ کہ وہ اوپر کسی چیز کے ہیں۔ خبردار ہو۔ تحقیق وہی ہیں جھوٹے۔ غالب آیا ہے اوپر ان کے شیطان، پس بھلا دی یاد ان کو خدا کی۔ یہ لوگ گروہ شیطان کے ہیں خبردار ہو، بے شک گروہ شیطان کے ہی ہیں خسارہ پانے والے۔"

دوسرے گروہ نے اس راز مخفی کو جو نیت کے پردہ میں اوجھل ہو رہا تھا، وہ مقصد جس کے لئے کسی بہانہ یا اوٹ کی ضرورت تھی، اس کو بالکل فاش کر دیا ہے قرآن شریف کی آیات مبارکہ کو اپنی حرص و ہوا کے ڈھانچے میں ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں۔

مناسبت رکھنے والے طبقہ جہلا نے ان کے ساتھ موافقت کی ہے امارت کے شیدا اَلدُّنۡیَا مَلۡعُوۡنٌ وَ مَافِیۡهَا مَلۡعُوۡنٌ [۱] کے طالب:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا"

[النور:۵۵]

"جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے مستحکم و پائیدار کریگا، اور خوف کے بعد ان کو امن دے گا۔"

کے مستحق اور عامل بننے کے لئے لباس سپاہیانہ کو کافی سمجھ لیا ہے۔ اور جن ہستیوں اور اعمال صالح کرنے والوں کی نسبت یہ وعدِ اللہ ہوا ہے، عملی حیثیت سے ان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے سرے ہی سے اعراض کیا ہوا ہے نہ خلافت کے معانی سے واقف ہوئے ہیں اور نہ ہی وعدہ کے مستحق ہونے کی طرف رجوع

۱۔ دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے اس پر بھی لعنت کی گئی ہے

کیا ہے اصل کے خلاف فرع کے فریقوں نے آخرت سے دنیا کو مقدم رکھا ہے شاید انہوں نے کلام پاک میں:

"فَاَمَّا مَنْ طَغٰی o وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی" [النزعت:۳۷، ۳۹]	"پس اے پر جس نے سرکشی کی اور اختیار کیا زندگانی دنیا کو پس بے شک دوزخ ہے ٹھکانہ اس کا۔"

کونہیں پڑھا ہے۔اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِهِمْ۔

تیسرا گروہ، بلا درد محبّ کہلانیوالے ہیں۔نہ شریعت سے کچھ واسطہ، نہ طریقت سے سروکار، حقیقت کا تو ذکر ہی کیا، تمام جہان کے مذاہب سے نرالے، اپنے ضمیر کے متوالے، معانی سے بے خبر، مطلق جہالت کے گرفتار، امر و نواہی سے بیزار۔

چوتھا گروہ، جو اسی گروہ کی مانند ہے، لیکن ایک فرق ضرور ہے کہ وہ اپنے کردار میں کاذب نہیں۔ دنیا سے بے تعلقی ہے اور طالبِ مولیٰ ہیں۔مجاہد بھی ہیں اور زاہد بھی، تارک بھی ہیں اور حال بھی رکھتے ہیں۔ ایسی ہستیوں کے لئے کچھ توقف ہے۔

حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہ اپنے مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ قیامت کو ہر ایک گروہ کو اس کے نام سے پکاریں گے یعنی اس کی صفت سے ندا کریں گے کہ اے امت موسیٰ، اے امت عیسیٰ، اے امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اے محبان خدا،،۔

یہ جو کچھ ارشاد مبارک ہے بالکل بجا و درست ہے۔لیکن یاد رہے کہ یہ ان صاحبان کے لئے ہے جنہوں نے شریعت عزا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور مقصود کو حاصل کیا ہے۔**بمصداق:**

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوس نا کے چہ داند جام وسنداں باختن[1]

۱۔ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے میں عشق کا پیالہ ہے کوئی بھی ہوس کا پجاری کیا جانے کہ (شریعت کا) جام اور (عشق کا) پیالہ (بیک وقت) کیسے درست رہ سکتا ہے

میرا مذہب اس کتاب میں محض ''انسان فی القران'' ہے۔اس لئے اس کی تفصیل کی، میرا مسلک مجھے اجازت نہیں دیتا۔سوائے اس کے کہ بندگان خدا نے ریا کاری سے نفور اور اخلاص کے میدان میں قدم جمانے کے لئے ملامت کو اختیار کیا لیکن ملامت کا وہی معیار صحیح ہوسکتا ہے جو شریعت غزا کے خلاف نہ ہو۔یہ لوگ اخلاص کے پودے۔محبت کے پھول اور اعلیٰ مقصود کو پانے والے ہیں۔دنیا مافیھا سے اعراض کئے ہوئے لَایَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کھاتے) ہوتے ہیں۔

لیکن آج کل تو صرف شریعت کی پابندی اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل ہی اعلیٰ درجے کی ملامت ہے۔مخلصوں کے لئے یہ وقت نایاب اور قیمتی ہے۔کیونکہ آج کل معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔عوام شریعت کے خلاف چلنے والوں کو ولی سمجھتے ہیں، اور پابندِ شریعت کو حقیر خیال کرتے ہیں۔اور فرمان ایزدی ہے:

"وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"
[آل عمران:۸۵]

''اور جو کوئی چاہے سوائے اسلام کے دین پس ہرگز نہ قبول کیا جائے گا اس سے اور وہ بیچ آخرت کے خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔''

میرے حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''یکے فقر رحمانی و یکے شیطانی'' سبحان اللہ! کیا ہی لطیف اور پر حقیقت ارشاد مبارک ہے

ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ پر ایک نور عظیم متجلیٰ ہوا اور اس میں سے ندا آئی کہ ''اے عبدالقادر! ہم نے تجھے نماز و مجاہدہ وغیرہ معاف کیا۔اب تیرے لئے کسی محنت و ریاضت کی ضرورت نہیں رہی۔تو ہمارا مقبول ہوگیا ہے'' جناب کو معاً خیال آیا کہ کیا میرا معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ گیا ہے؟ تو استغفار پڑھی۔وہ تجلی اور روشنی دھوئیں میں تبدیل ہوگئی اور آواز آئی کہ ''تو بڑا امرد ہے کہ بچ گیا۔ورنہ میں نے اس مقام پر لاتعداد انسانوں کو گمراہ کیا ہے'' آپ نے لاحول پڑھی (کہ شیطان نے یہ دوسرا زبردست وار کیا ہے لاحول پڑھنے سے اشارہ فرمایا کہ صرف اس کے فضل سے بچا ہوں) اور ایک پتھر اٹھا کر اس دھوئیں کی طرف پھینکا۔ایک چیخ کے ساتھ آواز آئی کہ یہ میرا آخری داؤ تھا۔مگر اس میں بھی نا

کام رہا۔'' اور دھواں گم ہو گیا۔

اگر حضرت اس وقت شان جلال و جمال میں تمیز نہ فرماتے اور اس کہا مان لیتے تو ملحد ہو جاتے۔ لیکن بڑے ہوشیار تھے، بچ گئے۔ شرع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ علم راہ نما ہو گیا۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کا واقعہ ہے کہ حسب مدارج جب حال کھلنے پر آئے تو شیطانی تصرف غالب ہوا۔ کئی نوع پر خوابیں آنے لگیں۔ تو تکبر اور رعونت کی راہ سے عوام کے سامنے بیان کرنی شروع کر دیں کہ: ''مجھے رات کو فرشتے لے جاتے ہیں ۔ جنت کی سیر کراتے ہیں ۔ حور وغلمان میری خدمت کرتے ہیں .... میں نے اپنے عالی مقام کو کئی دفعہ دیکھا ہے...... آج مجھے تخت پر بٹھا کر عرش معلٰی کی سیر کرائی گئی''۔ وغیرہ وغیرہ

جب حضرت جنید نے سنا تو اس کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا ''اے عزیز! تو کیا دیکھتا ہے''؟ اس نے حسب دستور بیان کیا۔ آپ نے فرمایا ''اب کے جب ملائکہ تمہیں لے جائیں تو لاحول پڑھنا'' اس نے کچھ اعراض کیا کہ میرے حال کو آپ نے شیطانی خیال کیا ہے۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا مَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ (نہیں ہے ہم پر مگر پہنچا دینا) جب رات کو وہی معاملہ پیش آیا تو پہلے سے بڑھ چڑھ کر حالات منکشف ہوئے۔ ایک نہایت خوشنما تخت ملائکہ اٹھائے ہوئے آئے جس کے گرد حوریں نغمہ سرا تھیں۔ اور اس پر اس کو بٹھا کر لے گئے۔ تب اسے وہی خیال جو دن کو انکار و اعراض کی صورت میں پیدا ہوا تھا، ظاہر ہوا۔ لیکن معاً یہ خیال بھی آ گیا کہ لاحول پڑھنے میں کیا حرج ہے۔ اور آپ کا فرمان بھی ہے تو پڑھا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ [1] پڑھتے ہی وہ سب سامان جاتا رہا اور اپنے آپ کو مزبلے میں گرا پڑا دیکھا۔ تب حضرت کی خدمت میں زار و نزار روتا ہوا حاضر ہوا اور توبہ کی۔

حالات و کیفیات کو مد نظر رکھتے ہوئے وضاحت کے لیے یہ دو واقعات تحریر کئے گئے ہیں ورنہ قرآن مجید کے ہوتے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ مولٰی کریم ذوالجلال والاکرام نے

۱۔ نہ نیکی کی طاقت ہے اور نہ برائی سے بچنے کی قوت مگر اللہ بلند و برتر کی مدد سے۔

صراط مستقیم

کو واضح کرنے کے لئے، مشعل ہدایت کو روشنی بخشنے کے لئے اور نفسانی شر اور شیطانی تصرف سے بچنے کیلئے کیا ہی بین دلیل سے مطلع فرمایا ہے۔

بھائی! صراط المستقیم کے دو رخ ہیں۔ایک بندے کو اس ہادی ونصیر کی طرف، اور دوسرا مولیٰ کریم کا اپنے بندے کی طرف، سو بندے کو خداوند کریم کی طرف سوائے مجاہدہ کے جو اسی کی توفیق سے ہے، چارہ نہیں ہے، اور اس رب العالمین کا راستہ بندے کی طرف اس کی رضا اور خوشنودی کے باعث ہدایت اور رحمت ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"فَمَنْ يُّرِدِاللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْاَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًاحَرَجًاكَاَنَّمَايَصَّعَّدُفِى السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ ،وَهٰذَاصِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا"
[الانعام:۱۲۵]

"تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے، اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کردے، اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔اسی طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔"

پس ہر ایک انسان کو اس ترازو سے اپنی حالت کو جانچ لینا اور معلوم کو لینا چاہئے کہ اگر اسلام کے لئے میرا سینہ کشادہ ہے اور اعمال صالح میرے لئے آسان ہو رہے ہیں، اور ذوق وشوق میرے لئے روحانی غذا بن رہا ہے، تو ضرور میرے واسطے خداوند کریم کا ارادہ خیر ہے اور ہدایت کی امید ہے: ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ [۱] اور اگر نَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ [۲] طبیعت کا رخ دوسری طرف دیکھے تو استغفار مانگے اور توبہ کرے۔کیونکہ یہ ایسی گمراہی ہے جس کیلئے راستہ ہی نہیں اور ایسا اندھیرا ہے جس کے واسطے کوئی چراغ ہی نہیں، ایسی غرقابی ہے جس کے لئے سہارا ہی نہیں، اور ایسا طوفان ہے جس کیلئے کوئی

۱۔یہ اللہ کا فضل ہے، دیتا ہے اس کو جس کو چاہتا ہے۔ ۲۔پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے۔

کنارا ہی نہیں۔ مطابق ارشاد مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَه جس کو اللہ گمراہ کرے اس کیلئے کوئی ہادی نہیں

خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے انسان کو اشرف المخلوقات اور اپنی محبت کا امین بنایا ہے اور اس کی پیدائش اپنی سرشت یعنی صفت پر، انسان کے ضمیر میں جو عادت کیا جانے کی صفت ہے یہی تنزل وعروج کا سرمایہ اور سبیل الرشد (ہدایت کا راستہ) کا سامان ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کا حامل ہونا ہی ممکن نہ تھا، ہر فرد و بشر حصول اور یاب ہی سے آزمایا جاتا ہے، جیسے اندھے کے لیے جو بینائی ہی نہیں رکھتا، حلال وحرام نظر سے اس کو کیا حصہ؟ نامرد کیلئے عورت بلا نہیں ہوسکتی، عَلٰی هٰذَا الْقِیَاس انسان میں دونوں جہان سے نشان ہیں۔ کفر وایمان، انکار واسلام، خلق نیک وبد، ظلم ورحم، وفا وجفا، محبت وعداوت ومثلهم۔ ان سب کا حامل ہے، یہی اس کی آزمائش کے اسباب ہیں اور من اللہ ان سے بخوبی واقف ہے۔

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" [الشمس:۸] "پھر اس کو سمجھ دی، برائی اور بھلائی کی"

تاکہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا [۱] کے علم سے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی [۲] کے مصداق میں قدم بڑھائے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا [۳] کی حقیقت اس پر ظاہر ہو جائے۔

اے بھائی! جب آدم علیہ السلام کو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَة کے ارادہ سے شرف وبزرگی کی خلعت پہنائی گئی تو ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوا، ابلیس نے عداوت اور تکبر کی راہ سے انکار کردیا، حکم خداوندی سے سرکشی کی، لعنت کا طوق اس کے گلے میں اِلٰی یَوْمِ الدِّیْن پہنا دیا گیا۔ عجز وانکساری اور قصور کا اعتراف تو درکنار، نامطابقت کی وجہ پر مردانہ وار کمر ہمت کو مضبوط کیا اور میعاد اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْن کا سوال کیا۔ اس عزیز الجبار نے قادریت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے غضب وغیرت کی رو سے مہلت دے دی، قرآن کریم میں یہ کئی وجہ پر ذکر ہے جس کا بیان اس جگہ موزوں نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ یہ ابتدا ہی سے دو گروہ بن

۱۔ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنی جان کیلئے نیکی کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اپنے لئے۔

۲۔ نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جو کچھ کوشش کرے۔

۳۔ بے شک خلاصی پا گیا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے معصیت میں چھپایا اس کو۔

گئے ۔ ایک نوری، اور ایک ناری، ایک صلحاء اور دوسرے اشقیاء، ایک فرماں بردار اور دوسرے نافرمان، ایک تابعدار اور دوسرا سرکش، ایک صاحب رحمت اور دوسرا صاحب لعنت، ایک مقرب دوسرا محجوب، ایک مقبول دوسرا مردود، ایک نسبتِ نعمت سے مسرور، دوسرا نسبت غضبی سے مقہور دونوں میں سرکاری ظہور، ایک نیکی میں مستغرق، دوسرا بدی میں سراپا غرق ۔ ایک پر من اللہ نزول رحمت وصلوٰۃ، دوسرے پر نزول شیاطین جیسا کہ مومنوں کیلئے فرمان مولیٰ کریم صادر ہورہا ہے:

"هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" [الاحزاب: ۴۳]

''وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے اوپر تمہارے اور فرشتے اس کے تا کہ نکالے تم کو اندھیروں سے طرف نور کے''

اور جو نسبت غضبی سے مقہور ہے، دوسری جگہ اس کے حق میں ارشاد مولیٰ کریم دیکھئے:

"هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ، تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ" [الشعراء: ۲۲۱، ۲۲۲]

''کیا تم کو میں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ وہ نازل ہوتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر۔''

اَفَّاکَ کے معنی لغت میں پھرے ہوئے کے ہیں، یعنی حق سے، یا فرماں برداری سے خواہ عملی صورت میں یا انکار کی رو سے ۔ لَایَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ آپ ہی اپنے پر ظلم کر لیتے ہیں۔

''پھر پھر کے قدم رکھتے ہیں دائرے کے اندر'' ایک کا مرجع خدا اور رسول، دوسرے کا مرجع شیطان وقبیلہ، ایک کی ولایت یعنی دوستی اطاعت، مطابقت، مناسبت اور محبت کے راستہ بتوسل رحمۃ اللعالمین، سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مولیٰ کریم کے ساتھ اور مولیٰ کریم کی ان پاکباز بندوں کے ساتھ، اور دوسرے کی انکار اور سرکشی کے راستہ بتوسل طاغوت ابلیس مردود کے ساتھ متصرف، ہر دو فریق کے تصرف جاری ہیں اور جاری وساری رہیں گے ۔ بلکہ تصرف کے لحاظ سے دوسرا گروہ زیادہ اثر دکھاتا ہے اور وہ اس لئے نفس کا رجوع (اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ) اکثر برائی کی طرف ہے جو سراسر گمراہی ہے اور شریعت عزا کے سب احکام نفس کے خلاف ہیں، تا کہ آزمائش ہو سکے۔

گو تصرفِ حق کے سامنے تصرفِ نفس وشیطان کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

؎ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

لیکن یہ جب معلوم ہو کہ نفس زکیٰ حاصل کرے، عالم قدس کا پرتو اس کو منور کرے، چشم دل نور معرفت سے روشن ہو، شیطان اس کی حس سے بھاگے اور اس کی مثال روشنی اور اندھیرے کی سی ہے، نجاست وطہارت کا سا حال ہے۔ بلندی وپستی کا سا معاملہ ہے، ہدایت وضلالت کا رنگ ہے، روشنی، طہارت، بلندی، ہدایت، ان سب میں انسان مکلّف ہے اور ذوالجلال والاکرام کے فضل کا محتاج ہے۔ لیکن اندھیرا، نجاست، پستی اور ضلالت کے لئے مکلّف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب خود بخود موجود ہے۔ صرف پہلی صفات حسنہ سے تغافل ہی کافی ہے۔ مطابق فرمان ایزدی اُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا (فائدہ دیتا ہوں میں اس کو تھوڑا سا) ان کو بھی متمتع کرتے رہیں گے، اور:

"نُوَلِّـهٖ مَاتَـوَلّٰـى وَنُـصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا"	ہم اسے ادھر ہی پھیریں گئے جدھر وہ خود پھرے گا اور جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری
[النساء:115]	جگہ ہے پھر جانے کی۔"

کی پرزور تدبیر کی سنت سے فائدہ حاصل کرتے رہیں گے، مگر افسوس! اس دن یعنی قیامت کے روز یہ قلعی کھل جائے گی۔ تب حسرت اور یاس کی بصیرت سے اپنے اعمال کا ملاحظہ کرتے ہوئے افسوس سے اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَيَـوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ٭ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا"	ترجمہ: اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا ظالم اوپر دونوں ہاتھوں اپنے کے، کہے گا اے کاش کہ پکڑتا میں ساتھ رسول کے راہ، ہائے افسوس
[الفرقان:۲۷، ۲۸]	ہے مجھ کو کاش کہ نہ پکڑتا میں فلانے کو دوست۔

اسی حجت کے ختم کرنے کیلئے، مشعل ہدایت کو روشن کرنے کیلئے، صراط المستقیم کو واضح اور حق وباطل میں تمیز کرنے کے واسطے خاتم النبیین

سید المرسلین

رحمۃ اللعالمین، فخر الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور فرمایا۔لیکن کفار اور اہل کتاب کی آنکھیں جو مدت سے آخر الزمان پیغمبر کی بعثت کی منتظر تھیں جب ایک در یتیم اور ایک امّی پر پڑیں تو تاج رسالت جو آفتاب سے زیادہ روشن، کل انبیاء ومرسلین کی عزت اور تصدیق کے ساتھ رحمۃ اللعالمین کے سر پر فخر و ناز لئے کھڑا تھا، اس سے شناسا نہ ہوسکیں۔مطابق فرمان ایزدی:

"اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ" [المومنون: ٦٩]

''کیا انہوں نے پہچانا نہیں اپنے رسول کو کہ وہ اس سے منکر اور ناشناسا ہو رہے ہیں؟''

تعجب کی رو سے اور دوسرے بظاہر وجہ پر، کیا نہیں پہچانا انہوں نے اپنے رسول کو امانت، سچائی، تحمل، وفا کرم، مروت، خوش خوئی اور کمال علم کے ساتھ، باوصف اس کے کہ انہوں نے علم حاصل نہیں کیا۔تو وہ کافر اس رسول کے منکر اور نہ پہچاننے والے ہوں؟ یعنی ایسا نہیں ہے کہ رسول کو پہچانتے ہی نہ ہوں تاکہ انکار کریں اور کہیں کہ یہ بیگانہ ہے، ہم اس کا حال نہیں جانتے۔یہ اعتبار کی رو سے، لیکن جب ان کی نظریں صرف ظاہر یعنی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت

پر رہ گئیں تو ان کو انکار ہی آسان معلوم ہوا اور سیاہی قلب سے لکھی ہوئی کتاب کو اپنے سامعین کے روبرو اسی طرح پیش کیا جس طرح پہلوں نے کہا تھا کہ:

"مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ٥ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ" [المومنون: ٣٣]

''کہ یہ تو تمہیں جیسا آدمی ہے، جس قسم کا کھانا تم کھاتے ہو اسی طرح کا یہ بھی کھاتا ہے، اور جو پانی وغیرہ تم پیتے ہو اسی قسم کا یہ بھی پیتا ہے، اور اگر تم نے اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کی تو اس وقت تم گھاٹے میں پڑ گئے۔''

اور جب پیغمبروں نے انہی سرداروں اور قوم کے آسودہ حال لوگوں کو دعوت دی، اور اس حیات

ابدی اور بے نہایت نعمت کی طرف بلایا جس کو وہ نہ چاہتے تھے اور نہ ہی اعتقاد رکھتے تھے تو مرسلوں کو یہی جواب دیا:

"فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ"

[ہود: ۲۹]

''تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تمہیں اپنے جیسا آدمی دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو صرف وہی لوگ ہوتے ہیں، جو رذیل ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و تعمیق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کچھ فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔''

گو انکار کفار کئی وجہ پر تھا، مگر یہاں تو صرف ظاہری اسباب پر ہی تھا او ربطن میں یقین لانا محال، اس لئے خدا کی برگزیدہ ہستیوں سے یہی جواب ملا:

"قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ"

[ہود: ۲۸]

''کہا کہ اے قوم ! اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی ہو جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہو، تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے باندھ سکتے ہیں حالانکہ تم اس سے بیزار ہو''

لیکن جب "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ" [۱] کا وقت آیا اور شجر رسالت جڑ سے لے کر آہستہ آہستہ پتے، ٹہنیاں اور پھول نکالتا ہوا بار آور ہوا تو پہلے دین منسوخ ہو گئے اور باطل کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا گیا، آتش کدے سرد ہو گئے، قصر کسریٰ کے کنگرے گر گئے، بت پرستوں کے دلوں سے بتوں کی وقعت جاتی رہی، زمین و آسمان میں انوار بے نہایت غمام کی صورت میں ہویدا ہوئے، دین ہمیشہ کے لئے کامل کر دیا گیا، تب

۱۔ بہترین زمانوں کا میرا زمانہ ہے۔

مولیٰ کریم نے حجت ختم کرنے کے لئے کافروں کے جواب میں اپنے حبیب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف اس طرح ارشاد فرمایا:

"قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ"

[الکھف:۱۱۰]

''(کہ میرے حبیب !ان سے) کہہ دو کہ اور کچھ نہیں (یعنی تمہاری ہی عقل وسمجھ کے مطابق) ایک تمہارے ہی جیسا آدمی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ معبود تمہارا ایک ہی معبود ہے۔''

تا کہ اسی کی عبادت کی جائے، تو اس میں کفار کے لئے دو مفاد ظاہر ہوئے، ایک تو اگر یہ ایمان لے آئیں گے تو خود بخود جان پہچان لیں گے کہ ہمارے نبی بظاہر بشریت کی رو سے تو مثل ہی ہیں لیکن حقیقت میں مثل نہیں ہیں، دوسرے نہ ماننے والوں کے لئے حجت قائم ہو جائے گی۔

باوجود اس امر کے بھی کفار کئی باتیں بناتے تھے۔ مثلاً:

"وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ مَلَکٌ"

''اور کہتے کہ پیغمبر پر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوا؟''

جو ان کے ساتھ رہتا۔'' جواب میں فرماتے ہیں:

"وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ، وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ"

[الانعام:۸،۹]

''ہاں اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو کام ہی فیصل ہو جاتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی، اور اگر ہم (ان کے کہنے کے مطابق) کسی فرشتے کو بھیجتے تو ضروری تھا کہ اسے مرد کی صورت میں بھیجتے تو جس شبہ میں پڑے ہوئے ہیں پھر اسی اشتباہ ہی میں پڑ جاتے۔''

مگر اس تشبیہ کا سوائے اعتقاد کفار یا جواب کفار کے سارے قرآن مجید میں اول سے آخر تک کہیں (مثلنا یا مثلکم کا) ذکر تک نہیں، اب تعجب تو یہ ہے کہ نام نہاد مسلمان بلکہ علمائے دین متین توحید خالص کی تعمیر کو اوپر سے شروع کرنے لگے ہیں، اور اس کے لئے اینٹ اور مصالحہ کفار ہی کے بھٹہ سے لے

رہے ہیں، تاکہ عوام کو شرک زعمی سے بچانے کے لئے اس لباس میں ملبوس کردیں جس میں آفتابِ نبوت کی شعاعیں نہ پہنچیں، ہیہات۔ ورنہ مومنوں کے لئے کلام پاک میں جو ارشاد ہے وہ اس کے سخت برخلاف ہے، دیکھو! بخطاب مومن کیا فرمارہے ہیں:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ"

[الحجرات: ۲]

''اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو اور جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے حضور نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔''

مولیٰ کریم اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں:

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا"

[الشمس: ۸]

''ہم نے انسان کو گناہ اور صواب کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔''

تاکہ گناہ سے متقی ہو اور اعمال صالح میں ساعی اور گناہ کے استغفار کرنے والا، تائب ہونے والا اور توفیق من اللہ کا شکر کرنے والا ہو، سب گناہوں سے وہ معصیت زیادہ سخت اور خطرناک ہے جس کا انسان کو علم ہی نہ ہو، ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اور گناہ و ثواب حال کے تغیر کا سبب اور دل کی زندگی اور موت کے موجب ہیں، تو جب دل نور ایمانی سے روشن اور زندہ ہے معصیت کی پہچان اور اطلاع ضرور ہوتی ہے، اور وہ گناہ جو نور ایمانی اور حیات ابدی کے لئے زہر ہلاہل ہو، اور وہ تیز ہوا جو اس چراغ کو فوراً گل کردے اور کفر کی تاریکی ایسا ڈھانپ لے کہ وہ ضیاء جس سے علم معصیت کا امکان تھا معدوم ہو جائے تو پھر شعور نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے، جیسے کہ مولیٰ کریم فرماتے ہیں کہ گناہ نیکیوں کو کھا جاتے ہیں، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا (نفس کی برائیوں سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اسی لئے نہایت کرم لطف سے مومنوں کو متنبہ فرمارہے ہیں کہ اے ایمان والو! جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو سمجھتے اور بولتے

بلاتے ہو، اپنی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ سمجھنا اور نہ ہی ایک دوسرے کی مثل بلند آواز نکالنا، ورنہ ایسے گمراہ ہو جاؤ گے کہ تم کو شعور بھی نہ ہوگا، اور تمہاری عقلیں ماری جائیں گی۔

آہ! آج کل تو بجائے نور و ہدایت علم کے سیاہی علم نے عقلوں کو ڈھانپ ہی لیا ہے۔ ورنہ کچھ بھی سمجھ ہوتو کلام الٰہی ایسی فاصل ہے کہ کوئی دقیقہ باقی ہی نہیں رہتا۔ بشرا رسول اور عبدہ ورسولہ میں تو کسی کو بھی کلام نہیں، بلکہ یہ لازمی اور ضروری ہے تا کہ ہماری تعلیم میں جنسیت اور مطابقت کے لحاظ سے آسانی ہو سکے اور تا کہ نسبتِ فیض کا ورود با آسانی پہنچ سکے۔ ورنہ اگر عدل وانصاف سے کچھ بھی موازنہ ہوتو معلوم ہوگا کہ حضور علیہ ﷺ کی بشریت کی خاصیت وحقیقت تو درکنار، ظاہرا بھی کوئی چیز ہماری مثل نہ تھی اور علمائے متقدمین ومتاخرین میں سے اکثر اہل حق وتحقیق نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ بطور

استشہاد:

چند ایک حوالہ جات درج ذیل ہیں:

1۔ تفسیر کبیر جلد ثانی، مطبوعہ مصر، صفحہ ۴۴۰، سطر ۲۲۔ زیر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى آدَمَ......الخ۔

وَاعْلَمْ اَنَّ تَمَامَ الْكَلَامِ فِیْ هٰذَاالْبَابِ اَنَّ النَّفْسَ الْقُدْسِيَّةَالنَّبَوِيَّةَمُخْتَلِفَةٌ بِمَاهِيَتِهَاسَائِرَ النُّفُوْسِ......الخ بلفظه یعنی قدسیہ نبویہ کی ماہیت باقی تمام نفوس کی ماہیت سے مختلف ہے

2۔ تفسیر کبیر، جلد پنجم، صفحہ ۴۹۶، سطر ۱۳، مصری، سورہ کہف:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاعِلْمًافَنَقُوْلُ جَوَاهِرَ النَّفْسِ النَّاطِقَهِ مُخْتَلِفَةٌ بِالْمَاهِيَّةِبلفظه!

ترجمہ: یعنی جواہر نفوس مختلف الماہیت ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفس مطہرہ کی ماہیت سے وہ جداگانہ ہے، اس لئے نفس بشریت میں مساوات یا مماثلت کسی انسان سے نہیں۔

3۔ تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۴۳۹، ۴۴۰، سطر ۳۵، مصری:

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" وَذَكَرَ الْحَلِيْمِیُّ فِیْ كِتَابِ الْمِنْهَاجِ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لَابُدَّوَاَنْ يَّكُوْنُوْامُخَالِفِيْنَ لِغَيْرِهِمْ فِى الْقُوَى الْجِسْمَانِيَّةِ وَالْقُوَى الرُّوْحَانِيَّةِ وَقَوْلُهٗ ﷺ زُوِيَتْ لِیَ الْاَرْضُ فَرَءَيْتُ مَشَارِقَهَاوَمَغَارِبَهَاوَقَوْلُهٗ ﷺ اَقِيْمُوْاصُفُوْفَكُمْ

وَتَوَاصَلُوْا فَاِنِّیْ اَرَاکُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِیْ بلفظه! یعنی جانو کہ رسالت کہاں رکھی جاتی ہے، اور حلیمی نے کتاب منہاج میں ذکر کیا ہے کہ تحقیق انبیاء علیہم السلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے قوئ جسمانی اور قوئ روحانی میں سے جدا ہیں۔ اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ میرے لیے زمین کو سمیٹا گیا۔ پس میں نے اسکے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھ لیا۔ اور فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ قائم اور سیدھی کرو نماز میں اپنی صفوں کو اور مل کر کھڑے ہو۔ پس تحقیق میں دیکھتا ہوں کہ تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی''۔

4۔ تفسیر فتح العزیز، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، پارہ عم، صفحہ ۲۱۸، از سطر ۱۰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات:

از خصوصیاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را در بدن مبارکش دادہ بود:

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از پس پشت می دیدند چنانچہ از پیش روئے خود می دیدند۔

۲۔ ودر شب وتاریکی چناں می دیدند کہ بروز در روشنی۔

۳۔ وآب دہن ایشاں آبہائے شور را شیریں می کرد۔

۴۔ وباطفال شیرخوارہ یک قطرہ از آب دہن بچکانیدند، آن اطفال تمام روز شکم سیر می ماندند وطلب شیر نمی کردند۔ چنانچہ در روز عاشورہ باطفال اہل بیت تجربہ شدہ۔

۵۔ وبغل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفید رنگ براق بود واصلاً موئے نداشت۔

۶۔ وآواز ایشان جائے می رسد کہ آواز دیگراں بعشر عشیر آن نمی رسد واز دوری شنیدند کہ دیگراں باں مسافت نمی تواند شنید۔

۷۔ ودر خواب چشم ایشان خواب آلود می شد ودل خبردار می ماند۔

۸۔ وفاژہ دہن ہرگز ایشاں در تمام عمر اتفاق نہ افتاد۔

۹۔ واحتلام ہرگز واقع نہ شد۔

۱۰۔ عرق مبارک ایشاں خوشبوتر از مشک بود۔ بحدے کہ اگر در کوچہ می گزشتند، مردم بسبب بوئے خوش

عرق ایشان کہ در ہوا سرایت کردہ می ماند پے می بروند کہ ازیں کوچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزشتند۔

۱۱۔ ہیچ کس از فضلۂ ایشاں برروئے زمین می شگافت فرومی بردواز اں زمین بوئے مشک می شمیدند۔

۱۲۔ و در وقت تولد مختون پیدا شدند۔

۱۳۔ وناف بریدہ و پاک وصاف، ہرگز لوث نجاست بر بدن ایشاں نبود۔

۱۴۔ چوں برزمین افتادند، سجدہ کناں وانگشت خود راسوئے آسمان برداشتند۔

۱۵۔ و در وقت تولد ایشاں نور متشعشع شد کہ بسبب آن شہرہائے شام مادر ایشاں رانمودار شد۔

۱۶۔ ومہد ایشاں ملائکہ می جنبانیدند۔

۱۷۔ ومہتاب بایشاں در حالت گہوارہ تکلم می فرمود۔

۱۸۔ ہمیشہ بروز وقت تمازت گرما ابر برایشاں سایہ می داشت۔

۱۹۔ اگر زیر درختے می آمدند سایہ درخت بسمت ایشاں متوجہ می شد۔

۲۰۔ وسایہ ایشاں برزمین نمی افتاد۔

۲۱۔ وسپش ایشاں راایذا نمی داد۔

۲۲۔ برجامہائے ایشاں مگس نمی نشست۔

۲۳۔ اگر بر جانورے سواری شدند آن جانور تا مدت سواری ایشاں بول و براز نمی کرد۔

۲۴۔ درعالم ارواح اول کسے کہ پیدا شد ایشاں بودند۔

۲۵۔ اول کسے کہ درجواب اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ بَلٰی گفت نیز ایشاں بودند۔

۲۶۔ وسیر معراج مخصوص بایشان ست۔

۲۷۔ وسواری براق نیز مخصوص بایشاں۔

۲۸۔ وبلائے آسمان رفتن وبحد قاب قوسین رسیدن وبدیدار الٰہی مشرف شدن۔

۲۹۔ وملائکہ را فوج وچشم ایشاں ساختن ہمراہ ایشاں مانند لشکریاں جنگ وقتال کردند نیز خاصہ ایشاں ست

۳۰۔ وشق القمر ودیگر معجزات عجیبہ وغریبہ نیز مخصوص بایشاں است۔

۳۱۔ ودر روز قیامت آنچہ ایشاں را دہند ہیچ کس راند ہند۔

۳۲۔ اول کسے کہ از قبر سر برآرد ایشاں باشند۔

۳۳۔ ایشاں بر براق حشر نمائند۔

۳۴۔ وہفتاد ہزار فرشتہ گرداگرد ایشاں جلودار باشند۔

۳۵۔ وبجانب راست عرش بالائی کرسی ایشاں را جادہند۔

۳۶۔ وبمقام محمود مشرف سازند۔

۳۷۔ ودر دست ایشاں لواء الحمد دہند کہ حضرت آدم وتمام ذریت ایشاں زیر آں نشان باشند۔

۳۸۔ وہمہ انبیاء باقیان خود پس ایشاں شوند۔

۳۹۔ ودر دیدار خدا اول بایشاں شروع شدند۔

۴۰۔ وبشفاعت عظمیٰ ایشاں را مخصوص سازند۔

۴۱۔ واول کسے کہ بر پل صراط بگذرد ایشاں باشند وتمام خلائق حشر را حکم شود کہ چشمہائے خود را فرو بروند تا دختر ایشاں فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بر پل صراط بگذرد۔

۴۲۔ اول کسے کہ جنت را بکشاید ایشاں باشد۔

۴۳۔ درروز قیامت ایشاں را بمرتبہ وسیلہ مشرف سازند وآں مرتبہ ایست نہایت بلند کہ کسے را در مخلوقات میسر نہ شد۔

۴۴۔ وحقیقت آن آنست کہ ایشاں دراں روز از جناب خداوندی بمنزلہ وزیر از پادشاہ باشند وآنچہ درشرائع ہاں مخصوص اند چیزہائے بسیار است کہ تعدد آں موجب تطویل ست۔ بلفظہ

عوام کے فائدہ کیلئے اس فارسی عبارت کا ترجمہ بھی تحریر کردیا جاتا ہے۔

وہ خصوصیتیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن مبارک کو دی گئیں:

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پشت مبارک سے بھی ویسا ہی دیکھتے تھے، جیسا کہ اپنے سامنے سے دیکھتے تھے۔

۲۔ اور رات کو اور اندھیرے میں بھی ویسا ہی دیکھتے تھے۔ جیسا کہ دن کو اور روشنی میں۔

۳۔ آپ کے منہ مبارک کا لعاب کڑوے پانی کو میٹھا کر دیتا۔

۴۔ اور شیر خوار بچوں کے منہ میں آپ اپنے دہن مبارک سے ایک قطرہ ٹپکاتے، وہ بچے سارا دن شکم سیر رہتے اور دودھ نہ مانگتے۔ جیسا کہ عاشورہ کے دن اہل بیت کے بچوں پر تجربہ ہوا۔

۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغل مبارک نہایت سفید شفاف تھے۔ ان میں بال مطلق نہیں تھے۔

۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز مبارک اتنی دور پہنچتی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی دور سے سنتے کہ دوسرا کوئی نہ سن سکتا۔

۷۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چشم مبارک سو جاتے لیکن دل بیدار رہتا۔

۸۔ ساری عمر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلغم (کھنگھار) نہیں آیا۔

۹۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی احتلام نہ ہوا۔

۱۰۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسینہ مبارک کستوری سے بھی زیادہ خوشبوناک تھا۔ اس حد تک کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی گلی میں سے گزر جاتے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خوشبو سے جو ہوا میں رچ بس جاتی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے آجاتے اور پہچان جاتے کہ یہاں یہاں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے ہیں۔

۱۱۔ کسی آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فضلہ (براز) زمین پر نہیں دیکھا۔ کیونکہ زمین اسے نگل لیتی اور وہاں سے کستوری کی طرح خوشبو آتی۔

۱۲۔ ولادت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختون ہوئے۔

۱۳۔ اور ناف بریدہ تھے، نہایت پاک صاف، کسی قسم کی نجاست وآلائش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اطہر پر نہ تھی۔

۱۴۔ اور ولادت کے وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر تشریف لائے اسی وقت سجدہ ریز ہو گئے اور اپنی انگشت مبارک کو آسمان کی طرف اٹھایا۔

۱۵۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت ایسا نور متجلی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ نے اس کی روشنی میں شام کے شہر دیکھے۔

۱۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جھولا فرشتے جھلاتے تھے۔

۱۷۔ اور چاند آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھولے میں باتیں کرتا تھا۔

۱۸۔ گرمی کے موسم میں ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بادل سایہ کئے رہتا۔

۱۹۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی درخت کے پاس تشریف لاتے تو درخت سایہ کیلئے آپ پر جھک جاتا۔

۲۰۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔

۲۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جوئیں نہیں پڑتی تھیں۔

۲۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑوں (اور جسم اطہر) پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی۔

۲۳۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جانور پر سواری فرماتے تو وہ جانور سواری کی مدت تک بول وبراز نہ کرتا۔

۲۴۔ عالم ارواح میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سب سے پہلے پیدا ہوئے۔

۲۵۔ اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے بَلٰی فرمایا۔

۲۶۔ معراج کی سیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۷۔ اور براق کی سواری بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے ساتھ مختص۔

۲۸۔ اور آسمانوں پر جانا اور قاب قوسین (دو کمانوں) تک پہنچنا اور دیدار الٰہی سے مشرف ہونا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا حصہ ہے۔

۲۹۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاہ وحشم کی خاطر فرشتوں کا فوج کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنا اور جنگوں میں شریک ہو کر کفار کے ساتھ لڑنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا خاصہ ہے۔

۳۰۔ شق القمر (چاند کے دو ٹکڑے کرنا) اور دوسرے کئی عجیب وغریب معجزے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہی کو دیئے گئے۔

۳۱۔ قیامت کے دن جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا جائے گا اور کسی کو نہیں دیا جائے گا۔

۳۲۔ سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی قبر سے باہر تشریف لائیں گے۔

۳۳۔ میدان حشر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براق پر سوار ہوں گے۔

۳۴۔ اور ستر ہزار فرشتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرداگرد جلودار ہوں گے۔

۳۵۔ اور عرش معلیٰ کی دائیں جانب کرسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جگہ دی جائے گی۔

۳۶۔ مقام محمود سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو مشرف کیا جائے گا۔

۳۷۔ لواء الحمد (خداوند تعالیٰ کی حمد وثنا کا جھنڈا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے دست اقدس میں دیا جائے گا۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی تمام (ایماندار) اولاد اس کے نیچے ہوگی۔

۳۸۔ تمام انبیاء اپنی امت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے ہوں گے۔

۳۹۔ خداوند جل وعلیٰ کا دیدار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے شروع ہوگا۔

۴۰۔ شفاعت عظمیٰ کا سہرا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے رخ انور پر بندھے گا۔

۴۱۔ سب سے پہلے پل صراط پر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی گزریں گے۔ اور تمام خلقت کو حکم ہوگا۔ کہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پل سے گزریں۔

۴۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی جنت کا دروازہ کھولیں گے۔

۴۳۔ قیامت کے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیلہ کے مرتبہ سے مشرف کیا جائے گا۔ (جو ایک مرتبہ ہے نہایت بلند کہ مخلوق میں سے کسی اور کو میسر نہ ہوگا)

۴۴۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن خداوند تعالیٰ کے حضور میں بمنزلہ وزیر ہوں گے۔ اور جو کچھ شرائع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے مخصوص ہے وہ بہت چیزیں ہیں جن کا گننا طوالت کا باعث ہے۔ **بلفظہ**

5۔ حدیث شریف صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۴۶، سطر ۳۵، مطبوعہ مصر، باب الوصال۔

ترجمہ: ''یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علہ وآلہ وسلم نے کہ وصل نہ کرو۔ یعنی روزہ وصل نہ رکھو۔ عرض کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہ آپ جو وصل کرتے ہیں اس لئے ہم بھی روزہ وصل رکھیں گے۔ اس پر فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لَسْتُ کَاَحَدٍمِّنْکُمْ کہ میں تمہارے کسی آدمی کی مانند نہیں ہوں۔''

6۔ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۴۶ سطر ۳۷، مصری۔

ترجمہ: یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ منع فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزہ وصال سے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ جو وصال کرتے ہیں۔ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِنِّیْ لَسْتُ مِثْلَکُمْ کہ تحقیق میں تمہاری مثل یا مانند نہیں ہوں۔''

7۔ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۴۷ سطر ۲ مصری۔

ترجمہ: ''حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وصال کے روزہ کی بابت، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنِّیْ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ کہ میں تمہاری شکل وصورت کی مانند نہیں ہوں۔ کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کھلانے والا کھلاتا ہے اور پلانے والا پلاتا ہے۔''

8۔ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۴۷ سطر ۲، مصری۔

ترجمہ: ''روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہ منع فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزہ وصال سے اور فرمایا: اِنِّیْ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ کہ میں تمہاری شکل وصورت اور خوخصلت کے مانند نہیں ہوں۔''

9۔ صحیح بخاری، جلد اول، صفحہ ۲۴۶، سطر ۹ مصری۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزہ وصال سے منع فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور! جو روزہ وصال رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یعنی تمہارے میں کون میری مانند ہے۔''

10۔ مواہب اللدنیہ، للشیخ قسطلانی علیہ الرحمہ جلد اول صفحہ ۲۴۸ مقصد ثالث، سطر ۲۳۔

"اِعْلَـمْ اَنَّ مِـنْ تَـمَـامِ الْاِيْمَانِ بِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِيْمَانُ بِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَ بَـدَنَـهُ الشَّـرِيْفُ عَـلٰى وَجْهٍ لَمْ يَظْهَرْ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ خَلْقَ آدَمَ مِثْلَهُ ...... الخ بلفظہ یعنی خوب جان لے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کمال ایمان یہ ہے کہ ایمان لاوے اللہ تعالیٰ پر کہ اس نے پیدا کیا، آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن شریف کو ایسی وجہ پر کہ ان کے برابر نہ کوئی پہلے پیدا ہوا اور نہ ان کے بعد پیدا ہوگا۔ یعنی ان کی مثل یا نظیر کوئی نہیں ہوگا۔"

11۔ مکتوبات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ جلد سوم، مکتوب نمبر ۱۱۰۔

ترجمہ: "جاننا چاہیئے کہ پیدائش محمدی تمام افراد انسان کی پیدائش کی طرح نہیں۔ بلکہ افراد عالم میں کسی فرد کی پیدائش کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باوجود عنصری پیدائش کے حق تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خُـلِقْتُ مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ میں اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں۔ دوسروں کو یہ دولت میسر نہیں ہوئی۔ اس دقیقہ کا بیان یہ ہے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت واجب الوجود جل شانہ کے صفات ثمانیہ حقیقیہ اگرچہ دائرہ وجوب میں داخل ہیں۔ لیکن اس احتیاج کے باعث جو ان کو حضرت ذات تعالیٰ کے ساتھ ہے ان میں امکان کی بو پائی جاتی ہے اور جب صفات حقیقیہ قدیمیہ میں امکان کی بو پائی جاتی ہے تو حضرت واجب الوجود جل شانہ کی صفات اضافیہ میں بطریق اولیٰ امکان ثابت ہوگا اور ان کا قدیم نہ ہونا ان کے امکان پر پہلی دلیل ہوگا۔ کشف صریح سے معلوم ہوا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش اس امکان سے جو تمام ممکنات عالم میں ثابت ہے۔ ممکنات عالم کے صحیفہ کو خواہ کتنا ہی باریک نظر سے مطالعہ کیا جائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مشہود نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی خلقت کے امکان کا منشا عالم ممکنات میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اس عالم سے برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سایہ نہ تھا۔ نیز عالم شہادت میں ہر ایک شخص کا سایہ اس کے وجود کی نسبت زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ جب جہان میں ان سے زیادہ لطیف کوئی نہیں تو پھر ان

کا سایہ کیسے متصور ہوسکتا ہے۔'' بلفظہ!

12۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر سوم، مکتوب نمبر ۶۴۔

''جن محجوبوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر کہا اور دوسرے انسانوں کی طرح تصور کیا وہ منکر ہو گئے۔ اور جن سعادت مندوں نے ان کو رسالت اور رحمت عالمیاں کے طور پر دیکھا اور تمام لوگوں سے ممتاز اور سرفراز سمجھا وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے اور نجات پا گئے۔'' بلفظہ!

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فرقان حمید میں مولیٰ کریم نے فرمایا:

"وَمَامَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْااِذْجَآءَ هُمُ الْهُدٰی اِلَّااَنْ قَالُوْااَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًارَّسُوْلًا"

[بنی اسرائیل: ۹٤]

''اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو ایمان لانے میں اس کے کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر کر کے بھیجا ہے۔''

یہ وہی مرض ہے جس کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ وہی حجاب ہے جو کھل نہ سکا، یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے انکار آسان معلوم ہوا۔ لیکن آج کل نام نہاد مسلمان اس آیت کو عجیب طرح سے حجت پکڑتے ہیں اور مَنَعَ النَّاسَ کا اطلاق بَشَرًارَّسُوْلًا پر کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ یہ انکار کہ آپ بشر نہ تھے، وہی انکار ہے جو کفار کرتے تھے۔ یہ وہی حجاب ہے جس میں وہ محجوب ہو رہے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بَشَرًارَّسُوْل اور عَبْدًارَّسُوْل میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ صرف مِثْلُکُمْ میں کلام ہے۔ جیسا کہ اقوال بزرگان دین واحادیث اور تفاسیر سے اوپر گزر چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا انکار کی رو سے ہے اور دوسرا افضلیت مدارج اور نور ایمانی کی رو سے ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کی عورتوں نے دیکھا تو ان کے حسن وصورت کی وجہ سے بے ساختہ بول اٹھیں کہ حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَابَشَرًا[۱] ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول محض عزت وتکریم کی وجہ سے تھا، انکار کی رو سے نہ تھا۔ ورنہ خوب جانتی تھیں کہ یہ بشر ہے، زلیخا کا غلام ہے، اور طعن کی

۱۔ پاکی ہے اللہ کو، نہیں ہے یہ کوئی بشر۔

روسے:

"تُرَاوِدُفَتٰهَاعَنْ نَّفْسِهٖ قَدْشَغَفَهَا حُبًّا اِنَّالَنَرٰاهَافِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" [یوسف:۳۰]

''عزیز کی عورت اپنے غلام سے ناجائز خواہش کرتی ہے اوراس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے۔ ہم دیکھتی ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہے۔''

کہاتھا۔

معلوم کرنا چاہئے کہ اس خالق موجودات نے انسان کیلئے بشر کا لفظ کس جگہ اور کس وقت استعمال فرمایاہے اوراس کا وصف کیا ہے؟ دیکھوذوالجلال والاکرام کا فرمان:

"اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًامِّنْ طِیْنٍ o فَاِذَاسَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْالَهٗ سٰجِدِیْنَ"[ص: ۷۱،۷۲]

''میں بنانے والا ہوں ایک بشر مٹی سے جب اس کو ٹھیک بنا چکوں اوراس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا''

روح کے بغیر صرف انسان کے بت کو بشر سے نامزد کیا ہے۔اورلغت میں بشر کے معنی ردی الخلق چڑے کے ہیں۔بعض بزرگوں نے بھی آپ کو سید البشر فرمایا ہے،لیکن اس لحاظ سے تو میرے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کیلئے یہ خطاب بھی مذموم ہی ہے۔اس واقعہ سے پہلے حضرت باری تعالیٰ نے بھی قبل ازظہور جب بشر اور بشریت کا نام تک نہ تھا،انسان فرمایاہے:

"هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِلَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا" [الدھر: ۱]

''بے شک آیا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں سے کہ نہ تھا کچھ چیز ذکر کی گئی۔''

اور یہ اسم مبارک اس کا ذاتی ہے جو تمام صفات کا جامع اوراحسن تقویم سے مزین ہے:

"وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ o وَطُوْرِسِیْنِیْنَ وَهٰذَاالْبَلَدِ الْاَمِیْنَ o لَقَدْخَلَقْنَاالْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"[التین: ۱تا۳]

''انجیر اورزیتون کی قسم اورطور سینین کی اوراس امن والے شہر (مکہ) کی کہ ہم نے انسان کو اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔''

باقی سب کے سب نام صفات حسنہ اور سیئہ کے اسموں سے موسوم ہیں۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے آدمی ہو گیا ہے۔ بعدہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ١ اور بعض جگہ صرف روح کے نام ہی سے مخاطب فرمایا ہے۔ یہاں ہر اسم کے ساتھ آیات کا حوالہ دینا ضروری نہیں۔ کیونکہ ہر مسلمان ان صفات سے علم رکھتا ہے۔ مثلاً کافر، منافق، فاسق، مشرک اور مسلم، مومن، ولی، نبی، رسول۔ یہ سب کے سب نام صفاتی ہیں۔ جس صفت سے انسان نسبت رکھتا ہے اسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان میں سے کافر، منافق، مشرک، فاسق یا مومن اور مسلمان بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٢ کی وجہ پر ہے۔ لیکن ولایت، نبوت اور رسالت، سو یہ وہبی شرف ہے جو کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ٣ اور اَرْسَلْنٰكَ ٤ اس پر شاہد ہے اور اس میں بھی مدارج ہیں۔ گو رسالت میں سب یکساں ہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ٥ لیکن تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ٦ کی حیثیت سے مختلف۔ جیسے نوح نجی اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ علیہم السلام۔ ہر ایک کو اس صفت سے موصوف فرمایا ہے جس میں وہ ممتاز تھے۔ اور ہر وجود باجود سے مطابق مدارج وصفات فعل بھی سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً نجات سے حضرت نوح علیہ السلام کو اور خلت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور کلام سے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سرفراز فرمایا۔ اور روحانیت کے کرشمے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوئے۔ جیسے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست، مردہ کو زندہ اور مٹی کا جانور بنا کر ٹھیک اور سچ مچ کا پرندہ بنا دینا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کونسی صفتوں سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے۔

١۔ ہر ایک جان موت کو چکھنے والی ہے۔ ٢۔ بسبب اس چیز کے کہ کماتے ہیں۔
٣۔ یہ میرے رب کا فضل ہے۔ ٤۔ ہم نے تجھے بھیجا۔
٥۔ ہم رسولوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔
٦۔ یہ رسول ہیں کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

سراجامنیرا

کی خلعت سے آراستہ فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے سراج کے معنی چراغ کے لئے ہیں اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ چراغ سے دوسرا چراغ بلکہ لاانتہا چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور آفتاب سے ایسا فعل سر زد ہونا ناممکن سمجھ کر مفاد کو ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن تطبیق قرآن شریف کی رو سے سراجاً منیرا کے معنی شمس ہی کے ہیں۔ گو سراج کے معنی چراغ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن آفتاب کے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ کیونکہ جو حقیقت اور مفاد آفتاب سے عیاں ہے، چراغ ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور وہ اس لئے کہ چراغ نے بھی آفتاب ہی سے روشنی حاصل کی ہے، کیونکہ چراغ کی روشنی کا اصل سرمایہ کوئی روغن ہے اور باقی وجود یا چراغ یا بتی سامان ہے، ہر روئیدگی جس سے روغن حاصل کرنا ممکن ہے، اپنی نشوونما کے میدان میں آفتاب کی محتاج ہے اس میں کلام نہیں کہ عالم موجودات کی ہر چیز کو اس خالق یکتا نے عناصر اربعہ یعنی آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہی سے خلقت کیا ہے۔ نیز فرمایا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ یعنی کہ ہم نے ہر چیز کی زندگی کو پانی سے وابستہ کیا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو پانی تھا۔ مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

"وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً"

[ھود:۷]

"اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو بیچ چھ دن کے اور تھا عرش اس کا اوپر پانی کے تاکہ آزمائے تم کو کون تم میں بہتر ہے عمل میں۔"

اور موجودات کی تخلیق اربعہ عناصر میں سے کسی ایک عنصر سے ہونا روا نہیں ہے۔ اور جو فرمایا:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ، وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ"

[الحجر: ۲۶، ۲۷]

"اور البتہ بے شک پیدا کیا ہم نے آدمی کو بجنے والی مٹی سے جو بنی تھی کیچڑ سڑی ہوئی سے اور جنوں کو پیدا کیا ہم نے ان کو پہلے اس سے آگ لوؤں کی سے۔"

یہ جنسیت کے لحاظ سے اور غلبہ کی رو سے ارشاد مبارک ہے۔ ورنہ یہ امر معروف ہے کہ ہوا کے بغیر زندگی محال ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مخلوق اربعہ عناصر ہی سے بنائی گئی ہے اور ہر ذی روح کے جسم کا نظام اور وجود کا ثبات وصحت انہی عناصر کے قریب بہ اعتدال رہنے پر منحصر ہے۔ اور ایک دوسرے کا اضداد کا مستحیل ہو کر اور ترکیب پا کر فنا ہونے کے بعد باہمی اتحاد وامتزاج ایک وجود کے ظہور کا باعث ہے جس میں وجود عناصر کی انفرادیت کا نشان معدوم ہو چکا ہے۔ مثلاً لکڑی میں آگ مٹی، ہوا اور پانی کا بعینہٖ ملنا ناممکن ہے، اور یہی حال تمام مخلوق کا ہے۔

مطابق ارشاد مولیٰ کریم تخلیق میں دو درجے ثابت ہوتے ہیں، اول عناصر سے اور دوسرا نطفہ یا تخم سے، پس ہر تخم میں روح اور جسد پنہاں ہے جس کا ظہور انہی عناصر سے خوراک کا محتاج ہے تا کہ جڑ سے لے کر تنے، ٹہنیوں اور برگ وگل کے مراحل کو طے کرتا ہوا پھل یعنی تخم سے بارآور ہو، اور مولیٰ کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے کل موجودات کا نظام شمس سے متعلق رکھا ہے، جس کے بغیر سلسلہ نشو ونما بالکل ناممکن ہے، اس لئے اس کو نظام شمسی کہنا بجا و درست ہے، اس کے پورے بیان میں بہت طول ہے، اختصار کے طور پر کچھ حوالہ قرطاس کیا جاتا ہے، مثلاً رات اور دن کی آمدورفت اسی کے چہرہ کے نقاب اور رویت کا نتیجہ ہے، موسم کا تغیر وتبدل اسی کے بعد وقرب کے باعث ہے، پانی کو اسفل مقام سے اٹھا کر اوج فلک پر پہنچا دینا اور اس سے چمک اور گرج پیدا کرنا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، پہاڑوں کی سخت چٹانوں میں اپنی شعاعوں کے تصرف سے لعل وزمرد کا پیدا کرنا اس کے طبعِ فیض کا ظہور ہے، بجلی اور اس کی طاقت سے کارخانوں کی حرکت اور دور دراز کی خبروں کے سامان کا مبدا یہی ہے، لیکن اس کا تصرف وفیض اور ہر قسم کا مفاد دراصل مولیٰ کریم کی طرف سے ہے۔ بلکہ سایہ تک کو بھی جو محض آفتاب کی رویت میں حجاب کے سوا وجود نہیں رکھتا، اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے، اور اسی سنت اللہ پر ہر ایک چیز کے فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، مثلاً فرمایا ہے نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ یعنی ہم ہی تم کو رزق دیتے ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّالظِّلَّ وَلَوْشَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًاثُمَّ جَعَلْنَاالشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا	"بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْراً" [الفرقان: ۴۵،۴۶]

چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر نشانی ٹھہرایا۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔"

اسی طرح ہر ایک فعل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے، ہاں ایک مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر ہے:

"اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ" [الواقعہ: ۵۸،۵۹]

"دیکھوتو کہ جس نطفے کو تم عورتوں کے رحم میں ڈالتے ہو، کیا تم اس سے انسان کو بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں۔"

"اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ" [الواقعۃ: ۶۳،۶۴]

"بھلا دیکھوتو کہ جو کچھ تم بوتے ہو۔ تو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔"

فرق صرف یہ ہے کہ ہر شے مثل دانہ یا نطفہ میں تصرف کسی قدر اسباب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن تصرف روح کو (جس کے سوا کسی وجود کی بھی پرورش ناممکن ہے اور درحقیقت وہ حق کے فعل کے سوا نہیں ہے) اپنی ذات کے فعل سے ملحق کیا ہے، لیکن یہ بھی قاعدہ کلیہ نہیں ہے بعض تصرف روحی بھی مخلوق کی طرف منسوب ہیں، تاہم ان کی حقیقت بھی حق کی طرف ہی سے ہے، جو مخلوق روحی ہیں اور یہ اقسام مخلوق ہیں جیسے زمین وآسمان و مافیھن سب مخلوق ہیں اور سب کے سب فانی ہیں، لیکن ملائکہ جو نوری وجود رکھتے ہیں، اس مخلوق سے ان کی کوئی مناسبت نہیں ہے، انسان، دوزخ اور جنت بھی مخلوق ہیں لیکن انکو فنا حقیقی نہیں ہے اور مرسلین بشریت کی رو سے یا بنی آدم ہونے کی حیثیت سے انسان ہی ہیں لیکن زمین وآسمان کا فرق ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں آنکھ یا حجریات میں لعل یا آئینہ۔ کیونکہ آئینہ باوجود وجود رکھنے کے سایہ نہیں رکھتا، حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اپنے مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر ۱۰۰ میں فرمایا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ: "پیدائش محمدی تمام افراد انسان کی پیدائش کی طرح نہیں بلکہ افراد عالم میں کسی

فرد کی پیدائش کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی۔''اس لئے خام مثالیں بیگانگی ہیں اور شرم وحیا مانع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے کوئی مثال پیش کی جائے، چونکہ مولیٰ کریم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا کے لقب سے ممتاز فرمایا ہے اس لئے آفتاب اور آپ کا فرق بیان کرنے کے بغیر چارہ نہیں۔

واضح ہو کہ اَلشَّمْسُ ضِيَاءً کی صفت آفتاب کیلئے ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا فرمایا ہے، یعنی خورشید ضیاء سے متصف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراپا نور، سورج دنیا کی تاریکی کو روشنی سے بدلنے والا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانیت کی ظلمات کو مٹا کر نور سے منور کرنے والے، سورج موجودات کی نشوونما کا رہنما اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانیت کے پودوں کے ہادی وپیشوا، سورج ہر بار آور کو ثمر تک پہنچانے والا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مومن تابع کو کعبہ مقصود تک لے کر جانے والے ہیں، زیادہ تحریر بھی سوء ادبی ہے، صرف یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح عالم موجودات کا سب نظام مولیٰ کریم نے آفتاب پر رکھا ہے اور اس کو راہنما فرمایا ہے اسی طرح عالم روحانیت کا سارا نظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رکھا ہے، فرمان ایزد متعال اس پر دال ہے

"يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا"

[الاحزاب: ۴۵ تا ۴۷]

''اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی)! بے شک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر ناظر اور خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب اور ایمان والوں کو خوشخبری دو کہ ان کیلئے اللہ کا بڑا فضل ہے۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ جل شانہ نے پانچ صفات سے متصف فرمایا:

۱۔شاہد، ۲۔مبشر، ۳۔نذیر، ۴۔داعی الی اللہ اور ۵۔سراجامنیر۔

مبشر ونذیر اور داعی الی اللہ ذات حق کے فرمان یعنی قرآن حکیم کے ذریعے سے معروف ہے۔ اس کی تسلیم میں تو کسی بھی مسلمان کو کلام نہیں، رہا شاھد وسراجامنیرا، سو

شاھد

کے معنی گواہ کے ہیں، اور یہ دووجہ پر ہے، ایک تو کسی غیر پر اس کے حال سے آگاہی رکھنے والا اور دوسرا اپنے افعال کی وجہ سے اپنی ذات پر شہادت دینے والا، پہلا علم احوال غیر کی وجہ پر شاھد ہے اور دوسرا اپنے حال کی وجہ پر شہید، جیسے "لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو شہید کہنا درست ہے اور اس کے لئے کسی علم کی احتیاج لازم نہیں ہے۔ لیکن شاہد کے لئے علوم ظاہری و باطنی کا ہونا از حد ضروری ہے۔ کیونکہ وہ معنی جو شاہد کے لئے لازم ہے، بغیر علم کے مطلق ناممکن ہیں۔ لیکن شاہد اور شہید دونوں صفتوں کا جمع ہونا کمال علم کی دلیل ہے، جیسے ارشاد مولیٰ کریم وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا یعنی شہید تو کمال وصف ذاتیہ سے اور شاہد وصف فعلیہ سے، جیسا صفات بالذات جو ذات سے متصف ہیں، نہ ذات سے منفک ہوئی ہیں اور نہ ہی کبھی ہوں گی، اور صفات بالفعل کا تصرف وظہور الی الخلق ہے، گو صفات فعلیہ بھی ذات سے منفک نہیں ہیں لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ صفات بالفعل تابع صفات بالذات ہیں اور صفات بالذات تابع ذات۔

اس طرح ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں شہید کا لقب استعمال فرمایا ہے:

"وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" "اور ہیں رسول تمہارے نگہبان اور گواہ۔"

[البقرة:۱۴۳]

تو اس میں ہر دو معانی منکشف ہوئے، یعنی شہیدا اپنے حال وذات کیلئے اور عَلَيْكُمْ کی رو سے شاہد امت کے واسطے، لہٰذا ان دونوں وصفوں کا جمع ہونا آپ کے کمال حال اور علم کی دلیل ہے: "ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ" یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عنایت کرتا ہے خود ذات باری تعالیٰ نے فرمایا ہے: "كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" یعنی اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے، اور یہ تخصیص کی رو سے ہے، جو قابلیت رسالت اور منصب نبوت کیلئے لازم ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول مکتوب نمبر ۹۹ میں ایک حدیث شریف کے تحت بیان فرماتے ہیں:

"تَنَامُ عَيْنَایَ وَلَایَنَامُ قَلْبِیْ" کہ تحریر یافتہ بود اشارت بدوام آ گاہی نیست بلکہ اختیارات از عدم غفلت احوال خویش وامت خویش، لہٰذا نوم درحق آں سرور ناقض طہارت نگشت، وچوں نبی رنگ شبانست درمحافظت است خود غفلت شایاں منصب نبوت او نباشد۔"

ترجمہ: "حدیث: میری آنکھیں سوجاتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔ جولکھی ہوئی تھی اس میں دوام آ گاہی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اپنے اور اپنی امت کے احوال سے غافل نہ ہونے کی خبر ہے، یہی وجہ ہے کہ نیند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وضوکو توڑنے والی نہ ہوئی، اور جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی امت کی محافظت میں نگہبان کی طرح ہیں تو پھر غفلت منصب نبوت کے مناسب نہیں۔"

رہی سراجا منیرا کی مثال، جوذات باری تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے، بالکل عیاں ہے، اس عزیز الحکیم سے بہتر کون مثال پیش کرسکتا ہے، یہ رب العالمین ہی کے شایاں ہے، کیونکہ خالق موجودات، وارث کائنات جس نے ہر چیز کواس کی اصل سے پیدا کیا اور اس کی نوع کوظہور کا اسباب بنایا، ہر چیز کی حقیقت کا علم اسی عزیز الحکیم ہی کیلئے خاص ہے، سوائے اس کے کماحقہ عارف ہونا، یا ذات باری تعالیٰ کا ساعلم ہونا مخلوق کیلئے روانہیں ہے:

"وَلَایُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَاشَآءَ" "اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے۔" [البقرۃ: ۲۵۵]

ہاں جس قدرعنایت فرمائیں صرف اسی قدر۔ وَمَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّابِاللّٰهِ!

تواس قادرقیوم نے جیسے عالم موجودات میں شمس کواس قدرروشنی عطا فرمائی ہے کہ ہر چیز اس کی ضیاء سے روشن اور فیض یاب ہے، یہ ضیاء زمین وآسمان وَمَابَیْنَهُمَا ہر جگہ تمام موجودات پر حاوی ہے بلکہ کل کائنات ومخلوقات کی حیات کا سبب ہے کوئی جگہ اس سے پوشیدہ نہیں اور یہ ہر چیز کیلئے عیاں ہے، اسی طرح حضورصلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کے جہان میں انہی صفتوں کے ساتھ موصوف ہیں، اب اس مثال کی مطابقت بھی من اللہ ہی ہونی چاہئے تا کہ معانی میں کوئی اشکال باقی نہ رہے، مومنوں کے واسطے اطمینان قلب اور نور ایمانی میں افزائش کا باعث ہو، مذبذبین کیلئے دلیل ہو اور منکروں پر حجت ہو۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ دے، اس خالق کائنات نے آفتاب کونعمت فرمایا ہے اورشکر کیلئے دعوت دی ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْافِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْامِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" [القصص:۷۳]

"اوراس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اوردن بنائے کہ رات میں آرام کرواور دن میں اس کافضل ڈھونڈواوراس لئے کہ تم حق مانو۔"

رات اوردن کا ہونا سورج کے پھرنے سے ہے، تواصل میں یہاں منعم کریم کی نعمت شمس کے شکر کیلئے ہی فہمائش کی گئی ہے ہرنعمت کاشکراس منعم حقیقی کی قدرت کاملہ کی تحمید اورصنعت کی توصیف وتعریف سے ہےاورکفران نعمت محسن حقیقی کے احسان کوفراموش کرنا ہے۔

نعمت دونوع پر ہے: ایک نعمت جسمانی اوردوسری روحانی، جسمانی کا دارومدار میدان دنیاپر ہے اورروحانی کا دارالاخرہ پر، دنیوی انعام فانی ہیں اور **نعمات الاخرہ** یعنی روحانی انعام باقی رہنے والے ہیں، نعمت دنیاایک حدتک ضرورت کے پورا کرنے کے بعد متغیرصورت اختیار کرنے سے زحمت ہوجاتی ہے ،لیکن نعمت عظمیٰ یعنی فی الآخرۃ بےانتہا اورتغیر سے مبرا ہے، مثلاً پیاسے کیلئے پانی نعمت ہے، لیکن سیراب کیلئے جوسردی سے کانپ رہاہو، زحمت ہے، بھوکے کیلئے کھانا بہت بڑی نعمت ہے، لیکن سیری شکم کے بعد کھانااس کیلئے بلا کاحکم رکھتاہے، جاڑے میں تمازت آفتاب اکسیر کاحکم رکھتی ہے لیکن گرمیوں میں بعض اوقات ہلاکت کا موجب ہوجاتی ہے۔ عَلٰی هٰذَاالْقِيَاسِ!

تیسری نعمت وہ ہے جودین ودنیامیں باعث برکت اورنعمت کا اصل ہے، اسلام وایمان، توحیدو رسالت، ان سب کااصل اورثمرتوحید باری تعالیٰ ہے، جس کااول ایمان بالغیب مطابق يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ محض ظن سے ہےاورآخررویت ہے: اِنَّ الظَّنَّ لَايُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [1]

لیکن خبردارہوناچاہئے کہ سوائے توحیدورسالت کے توحید بھی مذموم اور باعث گمراہی ہےاورصراط

۱۔ یقیناً ظن حقیقت سے کچھ بھی مستغنی نہیں کرتا۔

المستقیم کی راہروی سوائے نورِرسالت کے ناممکن اوراس سے روگردانی باعث اعمیت وکفران نعمت، زمین قلب کو ماسوائے اصل کے پاک کر کے کتنی ہی محنت سے سنوارا جائے اورحب مقصودڈال کراعمال صالحہ سے آبپاشی کی جائے، جب تک آفتاب نبوت کی شعاعیں رہنمائی نہ کریں، روئیدگی محال ہے اورعمل بے فائدہ، کیونکہ ارادۂ الٰہی اورسنت اللہ اسی طرح جاری ہے کلام الٰہی اس کا مصدق اوردلیل روشن موجود، نص اس پر شاہداورمثالیں بین، عدل وانصاف کومدنظر رکھتے ہوئے نورایمانی کے ترازو سے موازنہ کرنا چاہئے کہ جس طرح مولیٰ کریم نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوآفتاب منیر سے مثال دی ہے اسی طرح آفتاب رسالت کی شعاعوں میں پرورش پانے والوں، اس نورخدا سے منورہونے والوں، دین وایمان سے مزین اورثمرتوحیدِ رسالت اورمقصودکوحاصل کرنے والوں کی مثال روئیدگی سے بیان فرمائی ہے، تاکہ اشکال باقی نہ رہے، فرمایا:

"كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهُ فَاٰزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ"

[الفتح:۲۹]

''وہ گویاایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھراس کومضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی اورپھرنالی پرسیدھی کھڑی ہوگئی اورلگی کھیتی والوں کوخوش کرنے تاکہ کافروں کاجی جلائے۔''

ھیھـات! آج کل تاریکی وظلمات کی گھٹائیں اس قدرمحیط ہوگئی ہیں کہ حق وباطل میں تمیزمحال ہوگئی ہے، ایمان کے میدان میں تسلیم تودرکنارصاف انکارہی کوصراط المستقیم سمجھ رہے ہیں۔

اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَكْبَر[۱] کے ملبوس، اپنے زعم کے موحد، نورمعرفت سے بےنور، چاہ کومینار اورمینارکوچاہ جان رہے ہیں۔

سچ ہےارشادباری تعالیٰ:

۱۔ علم بہت بڑاحجاب ہے۔

"بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ"

[یونس: ۳۹]

''حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر قابو نہ پاسکے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا، اور ابھی اس کی حقیقت ان تک آئی ہی نہیں، اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے تکذیب کی تھی، سو دیکھ لو کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔''

لیکن جنہوں نے اس نور سے بصارت قلبی حاصل کی، اللہ جل شانہ نے اپنی رحمت سے ان کے سینوں کو شفا بخشی اور یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کی دولت سے مالا مال ہوئے، اس نعمت عظمیٰ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت سے عارف ہوئے، فرمان ایزدی:

"وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○

[البقرة: ۱۵۰، ۱۵۱]

''اور تا کہ میں اپنی تمام نعمتیں بخش دوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو (من جملہ اور نعمتوں کے) میں نے تم میں تمہیں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو میری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہیں پاک بناتے ہیں اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔''

کی ان کے دلوں نے تصدیق کی وَيُزَكِّيْكُمْ کے مفاد سے زکیٰ حاصل کرتے ہوئے وَيُعَلِّمُكُمْ سے علم حاصل کیا تب اس بے بہا دولت سے مومنین کو آگاہ کرنے کیلئے یوں ارشاد فرمایا:

ا۔ علامہ نبہانی اپنی تحقیق ارقام فرماتے ہیں:

"حَيْثُ قَالَ وَاِنَّ الَّذِیْ اَرَاهُ اَنَّ جَسَدَهُ الشَّرِيْفِ لَا يَخْلُوْا مِنْهُ زَمَانٌ وَلَا مَكَانٌ وَلَا مَحَلٌّ وَلَا اِمْكَانٌ وَلَا عَرْشٌ وَلَا لَوْحٌ وَلَا

''میں جو دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضور پرنور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مقدس سے زمان خالی ہے نہ مکان، محل خالی ہے نہ امکان، عرش خالی ہے نہ

كُرْسِيٌّ وَلَا قَلَمٌ وَلَابَرٌّ وَلَابَحْرٌ وَلَاسَهْلٌ وَلَاغَرٌّ وَلَابَرْزَخٌ وَّلَاقَبْرٌ" قلم، کرسی خالی ہے نہ لوح زمین خالی ہے نہ سمندر، نرم زمین خالی ہے نہ پہاڑ، برزخ خالی ہے نہ قبر، غرضیکہ تمام عالم کے ذرہ ذرہ میں سرکار اعظم جلوہ افروز ہیں۔"

۲۔ شفاء حضرت قاضی عیاض شرح ملا علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ، صفحہ ۱۱۷، جلد ثانی:

"اِنْ لَّمْ يَكُنْ فِي الْبَيْتِ اَحَدٌ فَقُلْ؛ اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ لِاَنَّ رُوْحَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَاضِرٌ فِي بُيُوْتِ اَهْلِ الاسلامِ"

یعنی اگر (کسی مسلمان کی ملاقات کو جاؤ) وہ گھر میں موجود نہ ہو تو کہو کہ میرا اسلام ورحمت وبرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ یہ اس واسطے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ہر اہل اسلام کے گھر میں حاضر رہتی ہے۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر عزیزی میں "وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" کی یوں تفسیر فرماتے ہیں:

"یعنی باشد رسول برشما گواہ زیرا کہ مطلع است بنور نبوت بر رتبہ ہر متدین بدین خود کہ درکدام درجہ از دین من رسیدہ وحقیقت ایمان او چیست وحجابے کہ بداں از ترقی محبوب ماندہ است کدام است، پس اومی شناسد گناہان شمارا ودرجات ایمان شمارا واعمال نیک وبد شمارا واخلاص ونفاق شمارا ولہٰذا شہادت اودر دنیا بہ حکم شرع درحق امت مقبول وواجب العمل است"۔

ترجمہ: "یعنی ہوں رسول تمہارے تم پر گواہ، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور نبوت کے ساتھ اپنے دین کے ہر دیندار کے رتبہ پر مطلع ہیں کہ میرے دین میں کون کس درجہ پر پہنچا ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے، اور جس حجاب کی وجہ سے اس میں ترقی سے مجوب ہو گیا ہے وہ کون سا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہچانتے ہیں تمہارے گناہوں کو، اور تمہارے ایمان کے درجوں کو اور تمہارے اچھے اور برے اعمال کو، اور تمہارے اخلاص ونفاق کو، اس لئے آپ کی شہادت دنیا

میں شرع کے حکم سے امت کے حق میں مقبول اور واجب العمل ہے۔''

۴۔شیخ شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ، جلد اول، باب تشہد، صفحہ ۴۳۰ میں حدیث شریف از عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَاالنَّبِیُّ وَرَحْمَۃُاللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''دعا بخیر وسلامت ست بر تو اے پیغمبر ومہربانی خدا وافزونیھا سے خیر وکرم وے ووجہ خطاب با نخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بجہت القائے ایں کلام است بر آنچہ دراصل بود کہ در شب معراج از جانب پروردگار تعالیٰ وتقدس برآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطاب بسلام آمد۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درحین تعلیم امت نیز برہماں لفظ اصل گزاشت تا ایشاں رابذکر آں حال گردد، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ نصب العین موموناں وقرۃ العین عابدان است درجمیع احوال واوقات، خصوصاً درحالت عبادت وآخر آنکہ وجود نورانیت وانکشاف دریں محل بیشتر وقوی تر است، وبعضے عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است درزرائر موجودات وافراد ممکنات، پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درذات مصلیاں موجود وحاضر است، پس مصلی را باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد وازیں شہود غافل نبود تا بانوار قرب واسرار معرفت منور وفائز گردد''۔بِلَفْظِہٖ۔

گو میرے مسلک کے خلاف تھا کہ ان سندات کو پیش کیا جائے، لیکن تصدیق اور امید مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بزرگان دین کے اقوال مبارک کو باعث برکت سمجھ کر درج کر دیا گیا ہے۔امید ہے کہ ناظرین کیلئے مفید ہی ثابت ہوں گے۔

شاید میرے وہ مسلمان بھائی جنہوں نے محض خشک اور ظنی توحید کے شجر کو تاویل اور بے اصل اعتراض کے میدان میں کھڑا کیا ہے، کہہ دیں کہ یہ مُمْتَنِعَات' سے ہے۔ میں نہایت ادب سے ملتمس ہوں کہ اس مُمْتَنِعَات' سے ان کا مقصود علم ذاتی ہے یا عطائی؟ امید اغلب ہے کہ وہ ذاتی کے علاوہ عطائی کو بھی مُمْتَنِعَات' ہی سے قرار دیں گے، اس اعتراض کے رفع کرنے کیلئے کلام الٰہی اظہر من الشمس ہے۔

"اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُبْرِیءُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَO"

[آل عمران: ٤٩]

کہ میں تمہارے سامنے بہ شکل پرند مٹی کی مورت بنا تا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے (سچ مچ) کا جانور ہو جاتا ہے، اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو خدا کے حکم سے تندرست کر دیتا ہوں اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر کے رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں، اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لئے (قدرت خدا کی) نشانی ہے۔

اب یہ افعال یعنی مردے کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا، مٹی کا جانور بنا کر پھونک مارنے سے سچ مچ کا جانور بن جانا اور لوگوں کے کھانوں اور گھروں کے ذخیروں تک سے مطلع کرنا، اگر یہ سب مُمْتَنِعَاتْ سے نہیں ہیں تو مردے کو زندہ کرنا اور مٹی سے پرندہ بنا کر روح پھونکنا ضرور مُمْتَنِعَاتْ سے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ فعل ذات باری تعالی ہیں جو سوائے اس کے غیر کے لائق نہیں، اور جیسے قرآن مجید میں کئی جگہ پر ذکر ہے، مثلاً:

"وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَایَعْلَمُهَا اِلَّاهُوَ"

[الانعام: ۵۹]

''اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی۔ نہیں جانتا ان کو کوئی مگر وہی۔''

"اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَافِی الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَاتَکْسِبُ غَدًاوَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ"

[لقمٰن: ۳۴]

بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کا علم اور اتارتا ہے بارش، اور جانتا ہے جو کچھ بیچ پیٹوں ماں کے ہے اور نہیں جانتا کوئی جی کہ کیا کمائے گا کل کو۔ اور نہیں جانتا کوئی نفس کہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا

ہے خبردار ہے۔

ان آیات بینات میں اختلاف لاحق ہوا ہے جن کی تطبیق مشکل بھی ہے اور نہایت ضروری بھی، کیونکہ مولیٰ کریم اپنے کلام کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:

"اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْافِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًاO" [النساء: ۸۲]	بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

یہ آیت مبارک اس امر کی بین دلیل ہے کہ کلام الٰہی میں اختلاف محال ہے۔

اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تصور و تصدیق کے موضوع پر علمائے کرام نے کئی کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن کو منطق کے نام سے موسوم کیا ہے، اور اسی علم کی بساط پر چھ تصدیقات بیان فرمائی ہیں:

۱۔تصدیق بالذات، ۲۔تصدیق بنعت الذات، ۳۔تصدیق بالرب، ۴۔تصدیق بنعت الرب، ۵۔تصدیق بالحال، ۶۔تصدیق بالحکم۔

اور تحریر فرمایا ہے کہ ان میں پانچ مردود ہیں اور ایک مقبول:

۱۔تصدیق بالذات:

یعنی تصدیق ساتھ ذات کے۔ اَلآنَ کَمَا کَانَ جیسا تھا ویسا ہی ہے اور اسی طرح رہے گا: قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ [۱]، اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ [۲] بخاری شریف میں وارد ہے: كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ شَیْءٌ وَّهُوَالْآنَ كَمَا كَان [۳] سوائے واحد یا ذات کے یہاں بیان ہی نہیں، سوائے ذات کے کسی وصف کا عیان ہی نہیں۔

۲۔تصدیق بنعت الذات:

یعنی ان صفات کی نعت یا تعریف جو ذاتیہ ہیں، اور یہ سات ہیں؛ ۱۔حی، ۲۔قدیر، ۳۔علیم،

۱۔ کہو وہ اللہ ایک ہے۔ ۲۔ معبود تمہارا ایک ہے۔

۳۔ تھا اللہ تعالیٰ اور نہ تھی ساتھ اس کے کوئی چیز اور وہ ہے اب بھی جیسا کہ تھا۔

۴۔مرید، ۵۔سمیع ،۶۔بصیر، ۷۔کلیم ، یہ صفات ذاتیہ نہ ذات سے منفک ہوئی ہیں اور نہ ہوں گی ،ان کو ذات سے اتصال ہے جن کا انفصال ناممکن ہے۔

۳۔تصدیق بالرب:

یہ صفت ربوبیت ہے،خواہ اس کا ظہور ہو یا نہ ہو، متحقق بالذات ہے یعنی قدرت ربوبیت جو صفت ذاتیہ کے تابع ہے۔

۴۔تصدیق بنعت الرب:

یہ صفات فعلیہ سے ہے اور یہ ظہور الی الخلق ہے، یعنی ربوبیت کی تعریف ہے۔خواہ جسمانی صورت سے ہو یا روحانی صورت سے۔

۵۔تصدیق بالحال:

یہ عبارت حال سے ہے، نہ اس سے کوئی کما حقہ واقف ہے اور نہ ہونا ممکن ہے۔یہ ذات باری کو چگونگی سے ہے جو حرام ہے۔

۶۔تصدیق بالحکم:

جس کیلئے کوئی ظرف چاہئے۔اس قادر مطلق کی قدرت کا ظہور فی الخلق ہے، پہلی صفات خمسہ تو اس لَمْ یَزَلُ وَلَایَزَالُ ، بے نظیر و بے مثال ہی کے لائق ہیں۔سوائے ذوالجلال والاکرام کے کسی کو قدرت اور طاقت نہیں اور نہ کسی کیلئے روا ہیں اور نہ ہی کبھی کسی کے لائق اور روا ہوں گی اور نہ ہی قبل اس کے کبھی ہوئی ہیں۔لیکن یہ جو چھٹی صورت ہے یعنی اس کے حکم سے، دراصل یہ فعل خداوندی ہے جو اس کے اذن سے خلق میں برگزیدہ ہستیوں کیلئے مرسل ہوا ہے، اسی لئے علم منطق میں ان پانچوں کو مردود کہا گیا ہے اور اس چھٹی کو مقبول، یعنی وہ پانچ واقعی ممتنعات سے ہیں اور یہ چھٹی مقبولات سے، جس کا ظہور ہوتا رہا ہے اور ہے اور ہوتا رہے گا۔جیسا حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کی نسبت اوپر گزر چکا ہے۔

اب جس طرح یہ فعل درحقیقت فاعل حقیقی کے سوا نہیں ہیں اور اسی کی قدرت کا ظہور ہیں۔منسوب بِاِذْنِہٖ حضرت عیسیٰ بن مریم (جو اللہ کے بندے اور اس کے فیض اور بلا شک وشبہ مخلوق ہیں) کی طرف ہیں

اسی طرح ان صفات کو جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے مرسل کرنے کے ساتھ مختص بالذات ہوئے ہیں۔ بنظر انصاف ملاحظہ کرنے سے صاف ظاہر ہو جائے گا۔ کہ ویسے ہی فرمان باری "اِنَّـآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" ہے جو تصدیق بالحکم ہی کے مترادف ہے۔ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ رب العالمین نے حضور کی شان میں "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ"

رحمۃ للعالمین:

کا خطاب ارشاد فرمایا ہے جو متذکرہ بالا پانچوں صفات کا اجمال اور نتیجہ ہے تاکہ رحمۃ اللعالمین کا مفاد تکمیل کے ساتھ ظاہر ہو، کیونکہ جب تک ان اوصاف خمسہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متصف نہ ہوں رحمۃ للعالمین کا عمل دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اور وہ اس لئے کہ رحمۃ للعالمین کی باران رحمت ایک دو عالموں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام عوالم کے لئے ہے، جیسے عالم دنیا میں مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا کی تعلیم سے، یعنی تسلیم کنندگان کے لئے بشارت اور منکرین کے لئے وعید تاکہ وہ خوف کریں اور اس خوف سے حصول رجوع الی اللہ ہو، اور دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ ان نعمت عظمیٰ کے لئے جو مقصود فی الدنیا والآخرہ ہے، اور سِرَاجًا مُّنِيْرًا ہدایت جو سراسر رحمت اور فیض انوار جو سرتاپا صبغۃ اللہ کے مترادف ہے، عالمین کیلئے ہے، جس سے کوئی عالم بھی محروم نہیں ہے اور مثال اس کی بِاِذْنِهٖ مثال آفتاب کی ہے جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اور یہ عوالم کی تفصیل ہر کہ ومہ پر روشن ہے اور یہ دو وجہ پر ہے، ایک انسان کیلئے ذاتی ہے اور دوسرا کوئی، جیسے عالم موجودات، عالم محسوسات، عالم معلومات، عالم معروفات، عالم امر اور ذات باری تعالیٰ میں ذاتی اثرات وحصول کی رو سے ہے۔ اور کوئی تمام مخلوقات کے لئے ہے۔ ذاتی عوالم کا حجاب محجوب کے لئے بمنزلہ عذاب کے ہے اور اس کا کشف وحصول اور نعمت عظمی ہے۔ موجودات عالم دنیا ہی کا نام ہے۔ اس میں حضور کی ایک ادنیٰ رحمت ظاہر ہے کہ پہلی امتوں میں بداعمالیوں کی وجہ سے صورتیں مسخ ہوتی رہیں:

"كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ" [القرہ:٦٥] "ہو جاؤ بندر ذلیل وخوار۔"

لیکن آج اس سے زیادہ سخت بدکاریاں ہو رہی ہیں مگر صدقہ رحمۃ للعالمین تا قیامت کوئی گروہ اس صورت سے مسخ نہ ہوگا۔

دوسرا عالم برزخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممدومعاون ہونے کی رو سے مسلمانوں کے لئے رحمت ہیں اور خاص مومنوں کے لئے فیض وبشارت، ولی کیلئے عطا اور مناسبت رکھنے والوں کے لئے نسبت، جملہ انبیاء ومرسلین کے لئے سید المرسلین، خاتم النبیین، آخر آمد بود فخر الاولین۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَاِذْاَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍثُمَّ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْااَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَامَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَذَالِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○"

[آل عمران: ۸۱، ۸۲]

اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں، پھر جب آئے تمہارے پاس رسول تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا؟ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا، فرمایا کہ تم اس کے گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ فاسق ہیں۔

یہ میثاق ہے جس کا علم سوائے انبیاء کرام کے ثابت نہیں ہوسکتا، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ برزخ دو وجہ پر ہے، ایک قبل از پیدائش فی الدنیا اور دوسرا مابعد الموت، ان دونوں کا علم مومنین کے لئے میدان دنیا میں ظن کے سوانہیں، جیسے بخطاب مومن فرمایا:

"وَمَالَكُمْ لَاتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْابِرَبِّكُمْ وَقَدْاَخَذَمِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"

[الحدید: ۸]

اور تمہیں کیا ہوا کہ خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ پیغمبر خدا تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ اور اگر تم کو باور ہو تو وہ تم سے اس بارے میں عہد بھی لے چکا ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس امر پر شاہد ہے کہ محض محل یقین کے سوا اس کا کچھ علم نہیں، اس کے علاوہ اور جگہ بھی جس قدر یہ میثاق بیان ہوئے ہیں اسی طرح ہیں، صرف انبیائے کرام کا میثاق ءَاَقْرَرْتُمْ اقرار کی رو سے سوالیہ جملہ مولی کریم کی طرف سے اور اَقْرَرْنَا انبیائے کرام سے وعدہ کی رو سے اس امر کی دلیل ہے کہ مرسلوں کو عالم روحانیت میں عمل سے علم ہے۔ کیونکہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی قید ان کے لئے نہیں ہے۔ دوسری صورت اس اقرار کے عمل کی ہے۔ جس کے لئے فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ٥ کی وعید ظاہر ہے۔ وہ بھی عالم برزخ ہی سے ہے۔ عام مفسرین اس پر ہیں کہ یہ امرامت کیلئے ہے۔ یعنی ہر ایک نبی اپنی امت کو متنبہ کرتا گیا، تاکہ جونسی امت اس وقت موجود ہو اس پر عمل کرے۔ لیکن اس کے اسباب اس سے بالکل خلاف ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سوائے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے اور کوئی امت تھی ہی نہیں، تو تمام انبیاء کی امتوں کا عمل مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ وہ تاویل ہے جس کے سوا چارہ نہ ہو سکا، یہ وہ تفسیر ہے جو اپنے ضمیر کے محل سے اپنی رائے کے دروازہ پر مکاشف ہوئی۔ ورنہ صاف ظاہر ہے کہ سرے ہی سے میثاق انبیائے کرام سے لیا گیا ہے۔ نہ امت کا ذکر اور نہ وقت پانے کی قید۔ اگر ذرا بھر تعمق نظر سے غور کیا جائے تو یہ سب اشکال حل ہو جاتے ہیں جس کی مثالیں موجود ہیں، اور عمل ظاہر۔ جیسے کہ لیلۃ الاسراء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی امامت لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ کا عمل اور تصدیق ہے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کا نماز میں تخفیف کرانے کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دربار رب العزت میں تشریف لے جانے کے لئے عرض کرنا وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کے مترادف ہے اور آپ کا یہ استفادہ مشہور ومعروف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

یہ دونوں واقعات حدیث شریف کی اکثر کتابوں کے باب فی المعراج میں مذکور ہیں اور چونکہ حدیثیں طویل ہیں اس لئے اختصار کے پیش نظر صرف یہ حصہ بطور تصدیق درج ذیل ہے:

....وَقَدْ رَاَيْتُنِيْ فِيْ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاِذَا مُوْسٰى قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فَاِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ جَعْدٌ كَاَنَّهٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَةَ وَاِذَا عِيْسٰى قَائِمٌ

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اور بیشک دیکھا میں نے اپنے تئیں انبیاء کی جماعت میں پس ناگہان موسیٰ کھڑے نماز پڑھتے ہیں پس نا

يُصَلِّيْ اَقْرَبُ النَّاسِ بِهٖ شِبْهًا عَرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدِ الثَّقَفِيّ فَاِذَا اِبْرَاهِيْمُ قَائِمٌ يُصَلِّيْ اَشْبَهُ النَّاسِ بِهٖ صَاحِبُكُمْ يَعْنِيْ نَفْسَهٗ فَحَانَتِ الصَّلٰوةُ فَاَمَمْتُهُمْ....[رواہ مسلم]

گہان موسیٰ ایک مرد ہیں میانہ قد، مڑے ہوئے بالوں کے گویا کہ وہ مردوں شنوءَ کے سے ہیں اور ناگہان عیسیٰ بھی کھڑے نماز پڑھتے ہیں نزدیک ترین لوگوں کا ساتھ ان کے مشابہت میں عروہ بن مسعود ثقفی ہے پس ناگہان ابراہیم بھی کھڑے نماز پڑھتے ہیں۔ مشابہ ترین لوگوں کا ابراہیم سے یار تمہارا ہے یعنی خود حضور۔ پس نماز کا وقت آیا پس میں ان کا امام ہوا۔'' [مسلم شریف]

دوسری حدیث شریف:

".....ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَااُمِرْتَ قُلْتُ اُمِرْتُ بِخَمْسِيْنَ صَلَوَاةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَاتَسْتَطِيْعُ خَمْسِيْنَ صَلَوَاةً كُلَّ يَوْمٍ وَاِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْجَرَبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِاُمَّتِكَ فَرَجَعْتُ فَوُضِعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهٗ فَرَجَعْتُ فَوُضِعَ عَنِّيْ عَشْرًافَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهٗ فَرَجَعْتُ فَوُضِعَ عِنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهٗ فَرَجَعْتُ فَوُضِعَ عَنِّيْ

''(حضور نے فرمایا:) پھر فرض کی گئی مجھ پر نماز یعنی پچاس نمازیں ہر دن رات میں پس پھرا میں درگاہ رب سے پس گزرا میں موسیٰ علیہ السلام پر پس کہا موسیٰ نے ساتھ کس عبادت کا حکم کیا گیا تو؟ کہا کہ حکم کیا گیا ہوں میں ساتھ پچاس نمازوں کے ہر دن میں۔ کہا موسیٰ نے کہ یقیناً امت تیری نہیں ادا کر سکے گی پچاس نمازیں ہر دن میں قسم اللہ کی تحقیق آزمایا ہے میں نے لوگوں کو پہلے تمہارے۔ علاج کیا ہے میں نے بنی اسرائیل کا سخت علاج کرنا پس پھر جاؤ تم طرف پروردگار اپنے کے اور درخواست کرو اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی واسطے امت اپنی کے۔ پس پھر گیا میں پس موقوف کیں مجھ پر دس نمازیں پس پھر

عَشْرًا فَاُمِرْتُ بِعَشْرِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَاُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَا اُمِرْتَ قُلْتُ اُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَاتَسْتَطِيْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَاِنِّىْ قَدْجَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ اَشَدَّالْمُعَالَجَۃَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِاُمَّتِكَ قَالَ سَاَلْتُ رَبِّىْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ وَلٰكِنِّىْ اَرْضٰى وَاُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّاجَاوَزْتُ نَادٰى مُنَادٍاَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِىْ وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِىْ"

پھر پھرا میں طرف موسیٰ کے پس کہا موسیٰ نے مانند اس کلام کے پس پھر گیا میں درگاہ خدا میں پس کم کیں مجھ سے اور دس نمازیں۔ پس آیا میں نزدیک موسیٰ کے پس کہا مانند اس کے پس گیا میں پس کم کیں مجھ سے دس نمازیں۔ پھر آیا میں موسیٰ کے پاس پس کہا مثل پہلے کلام کے پس پھر گیا میں پس کم کیں مجھ سے دس نمازوں کے ہر روز پس آیا میں موسیٰ کے پاس پس کہا مانند اسی کلام کے پس پھر گیا میں پس حکم کیا گیا میں ساتھ پانچ نمازوں کے ہر روز، پھر پھرا میں موسیٰ کی طرف پس کہا موسیٰ نے، یقیناً امت تیری نہیں طاقت رکھے گی پانچ نمازوں کی ہر روز اور تحقیق میں نے آزمایا ہے لوگوں کو پہلے تم سے اور علاج کیا میں نے بنی اسرائیل کا سخت ترین علاج پس پھر جا طرف رب اپنے کے اور سوال کر اس سے تخفیف کا اپنی امت کیلئے کہا حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ سوال کیا میں نے اپنے رب سے یہاں تک کہ شرم زدہ ہوا میں ولیکن راضی ہوں میں اور تسلیم کرتا ہوں میں، فرمایا حضرت نے پس جب گزرا میں اس مقام سے آواز دی آواز دینے والے نے کہ جاری کیا میں نے فرض اپنا اور تخفیف کی میں نے اپنے بندوں سے۔" [بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب فی المعراج]

عالم آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان مومنین کے لئے جن کا اعتقاد صحیح ہوگا، دین کی بنیاد درست ہوگی اور ایمان نور رسالت سے منور ہوگا۔ شفاعت کی رو سے رحمت ہوں گے۔ منکرین کیلئے سخت حسرت کا دن ہوگا۔ سب تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ کل انبیاء بھی نفسی نفسی کہیں گے لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی

اللہ علیہ وسلم اُمَّتِـیْ یَـارَبِّ اُمَّتِیْ کی صدا باذن اللہ بلند کریں گے۔ آہ! اس دن علمائے سوء جن کے دلوں پر زنگ جم چکا ہے، حرفوں کی سیاہی قلب پر حجاب ہیں، سدراہ ہو چکے ہیں، دیکھ لیں گے اور کہیں گے کہ ''کاش! اگر ضد پر نہ اڑے رہتے تو آج محروم نہ رہتے۔'' مگر بے سوداور وہ اس لئے کہ اس دن کا اسلام وایمان، تسلیم وایقان خواہ پہاڑ کے برابر ہو، آج کے ذرہ بھر کے برابر بھی نہیں ہے۔

اور یہ انکار اور ضد دو وجہ پر ہے: ایک علم کی وجہ سے اور دوسرا جہالت کی رو سے۔ پہلا جو علم کی وجہ پر ہے اگر جان بوجھ کر ہے تو یہ ایسا مرض ہے جس کا علاج ناممکن ہے، یہ ایسی بلا ہے جو ٹلنے والی نہیں ہے، ایسی گمراہی ہے جس کے لئے کوئی راستہ ہی نہیں، ایسی بیگانگی ہے جس کے لئے بیگانگی روا ہی نہیں، یہ ایسی ضد ہے جو ہٹنے والی ہی نہیں اور ایسی نوشت ہے جو مٹنے والی ہی نہیں کیونکہ یہ طبیعت کا اصل اور اس کی فرع ہے۔ ابوجہل وابولہب وغیرہ کفارِ مکہ اور یہود اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر کہا کرتے کہ ہمیں اپنے بچوں کے اپنے ہونے میں تو یقین نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ہماری عورتوں نے کہیں اور سے حاصل کیے ہوں، لیکن اس میں شک شبہ نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اپنے دعویٰ میں صادق ہیں۔ لیکن ہم ہرگز ایمان نہیں لا سکتے، اور نہ ہی لائیں گے۔

مولیٰ کریم نے شروع کتاب مبین میں فرمایا ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْاسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُـنْـذِرْهُـمْ لَایُؤْمِنُوْنَ O خَتَـمَ اللّٰـهُ عَلٰی قُلُوْبِهِـمْ وَعَـلٰـی سَـمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ"

[البقرة:٦، ٧]

''بے شک جو لوگ کافر ہوئے ان کیلئے برابر کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔''

اب یہ ایسا اشکال ہے جو خلاف سنت اللہ وخلاف قرآن حمید اور خلاف عمل ہے کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حی قیوم کی طرف سے وَاَنْـذِرْ عَشِیْـرَتَکَ الْاَقْـرَبِیْـنَ (اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ) کا فرمان ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسب الحکم ایک پہاڑی (کوہ صفا) پر تشریف لے گئے

اور یَامَعْشَرَالْقُرَیْش یَامَعْشَرَ الْقُرَیْش کی صدا بلند کی، اہل عرب کیلئے یہ ایک ایسی آواز تھی جیسے ہر ملک میں کسی مصیبت کے وقت امداد کی غرض سے پکارنا مروج ہے، چنانچہ سب لوگ اس پہاڑی کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن آرہا ہے تو تسلیم کرو گے؟ سب یک زبان ہوئے کہ ہم کو معلوم ہے کہ ساری عمر گزشتہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، ہم آپ کو صدیق محمد، امین محمد اور سعید محمد صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں اس لئے صرف اس بات کا یقین تو درکنار ہم از روئے تصدیق مسلح ہو کر لڑائی کیلئے تیار ہو جائیں گے، تب جناب نے بحکم خدا فرمایا کہ مجھے اس قادر ذوالجلال والاکرام نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور تبلیغ توحید کا حکم دیا ہے، تم اس پر ایمان لاؤ اور شہادت کے لئے "اَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَشْهَدُاَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہو، سب کے سب مفرور ہو گئے اور ان میں سے ایک بھی مومن اور مسلمان نہ ہو سکا۔ سب نے انکار فاش کر دیا۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ انکار کی رو سے سب کافر ہی تھے جن کیلئے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ الایة (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) کا خطاب ہو رہا ہے، اور یہ محال ہے۔ کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے اصحاب کبار اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے شیر جرار جن کے ہاتھوں خلاف اسلام جنگی کارنامے مشہور ہیں، بالآخر مشرف باسلام ہوئے۔ جن کے ذریعے سے اسلام کا بول بالا ہوا۔ مشرق سے مغرب تک پرچم اسلام لہرا اٹھا تو اریخ کے اوراق انہی کی جانکاہیوں کے ثناخواں ہیں، اور قیامت تک رہیں گے۔

بعض لوگ خصوصاً عیسائی بے علمی کی وجہ سے قرآن الحکیم پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں جو سراسر لایعنی ہے کیونکہ اس رحیم وودود نے اپنی سنت کے مطابق رسالت کو خلق کیلئے سرتاپا رحمت بنایا ہے اور دلوں کی تصدیق کیلئے سبیل۔ تو جب تک تصدیق بالقلب نہ ہو جائے رسالت کا کام باقی رہتا ہے۔ اور کفر یعنی انکار کئی وجوہات سے تھا۔ بعض بے قرار کر دینے والے شک میں پڑے ہوئے تھے جن کو مذبذبین بھی فرمایا ہے:

"مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآاِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآاِلٰی هٰٓؤُلَآءِ"[النساء:۱۴۳] "(کم بخت) بیچ میں ہی پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف ہوتے ہیں نہ ان کی طرف۔"

بعض اپنے سرداروں اور قبیلوں کے سبب سے انکار کر رہے تھے۔ بعض ڈر کے مارے اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔

"وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ" [الفتح: ۲۵]

"اور اگر نہ ہوتے مرد مسلمان اور عورتیں مسلمان نہیں جانتے تم ان کو یہ کہ کچل ڈالو تم ان کو پس پہنچ جائے تم کو ان سے ایذا بے خبر۔"

اور بعض ایسے تھے جن کا ایمان دنیوی عزت کے بحر ظلمات میں غرق ہو رہا تھا۔ ولید بن مغیرہ کا قصہ اسی کے مترادف ہے۔ لیکن ان سب صورتوں میں خَتَمَ اللّٰهُ کا عمل جاری نہ ہوا۔ خَتَمَ اللّٰهُ صرف ان کافروں کیلئے مخصوص ہے جن کے دلوں نے تسلیم کر لیا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ واقعی یہ خدا کے سچے پیغمبر حق لے کر آئے ہیں۔ دیکھو فرمان ایزد متعال فرعون اور اس کی قوم کی نسبت کس زور سے شاہد ہو رہا ہے:

"وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" [النمل: ۱۴]

"ان کے دلوں نے تو ان کا یقین کر لیا مگر انہوں نے بے انصافی اور غرور سے انکار کیا۔"

تو مان لینے یا خفیہ ایمان لانے اور تصدیق قلب ہو جانے کے بعد ضد اور غرور سے انکار کرنا خَتَمَ اللّٰهُ کا سبب ہوتا ہے۔ کیونکہ اب رسالت کا کام ختم ہو چکا ہے، تصدیق رسالت کا حق تھا، ادا ہو چکا۔ اب ان کو ڈرانا مساوی ہو گیا۔ مطابق آیات بینات اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ صراط المستقیم سے اعراض کرنے والوں، حق کو پہچان کر اعراض کرنے والوں، دنیا کی زندگی کو آخرت کو حیاتی پر ترجیح دینے والوں کو آگاہ کرنے کیلئے، اعراض کو رفع کرنے کیلئے۔ اختلاف کلام کو مٹانے کیلئے، ہوائے نفس میں غرق شدہ کو بچانے کیلئے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا رکھا ہے) کو خواب سے جگانے کیلئے تطبیق قرآن مجید کے سلجھانے کے لئے کیا ہی اچھا اور بین فیصلہ دیا ہے:

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے بھی اس

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ"
[الحاثیۃ:۲۳]

کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پس کون ہدایت کرے گا اس کو پیچھے اللہ کے۔ کیا پس نہیں نصیحت پکڑتے تم۔"

لیکن یہ ان لوگوں کی نسبت کا ذکر ہے جنہوں نے جان بوجھ کر اور غرور و تکبر کے رو سے انکار کیا اور اپنی خواہش کے پردہ میں محجوب رہنے کی وجہ سے کافر ہی رہے۔ سوائے اس کے ان کو مزید علم حاصل نہ ہوا اور نہ ہی اسلام کی برکات اور نور ایمانی سے حصہ ملا۔

دوسرا انکار جہالت کی وجہ سے ہے جو اہل اسلام کی طرف سے پیدا ہوا ہے اور اس میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو قرآن مجید اور احادیث شریف کے اختلافات کی تطبیق سے عاجز ہیں۔ چونکہ انسانی قاعدہ ہے کہ جس چیز سے اس کو حصہ نہ ہو، اس شے کی نسبت اس کے قلب میں اثر رکھتی ہو، مطابقت و مناسبت کا ظہور اس کی زبان سے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان کا نور ایمانی کسی طرف حکم لگانے کیلئے مقتضی نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں وہ کسی مواخذہ کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن آج کل یہ لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اثبات توحید کیلئے حق و ناحق دونوں کا انکار کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید و حدیث شریف سے بجائے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم

بیان کرنے کے لئے نفی علم کی آیات و احادیث منتخب کرتے ہیں۔ اور گستاخانہ و بے باکانہ کلمات خبیثہ سے اپنے انکار پر مصر ہیں۔ طبقہ جہلاء نے بوجہ مطابقت و مناسبت ان سے موافقت کر رکھی ہے اور ان کے اقوال کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سوائے وحی جلی کے کچھ بھی علم نہ تھا۔"

حالانکہ یہ مطابق:

''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ'' [الشوریٰ:۵۱]	''اور کسی آدمی کیلئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔''

نص کے خلاف ہے۔

نیز رحمۃ اللعالمین خاصہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (سخت تعجب سے حیرانگی ہے کہ) کس قدر سخت انکار ہے۔ امید اغلب بلکہ یقین ہے کہ وہ رحمۃ اللعالمین خاصہ رب العالمین تو مانتے ہی ہوں گے اور یہ بالکل درست ہے۔ لیکن توسل اور اسباب کا انکار مسبب کا انکار ہے۔ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ مناظرہ (جو آج مجادلہ اور مکابرہ کی صورت اختیار کر چکا ہے) کا نتیجہ اور ثمر ہے۔ کیونکہ مجادلہ اور مکابرہ میں خواہ ایمان بھی نہ رہے۔ پرواہ نہیں کی جاتی۔ یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۱؎

اس میں شک نہیں کہ انبیائے کرام کے حال سے عام مومنین تو در کنار کسی ولی اللہ کو بھی کما حقہ علم نہیں ہے۔ لیکن جن کو اس آفتاب نبوت سے (خواہ ذرہ کی مقدار ہی کیوں نہ ہو) روشنی نصیب ہوئی ہے وہ تسلیم ہی کریں گے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اکسیر ہدایت (کیمیائے سعادت) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''یہ ظاہری علم مانند تالاب کے ہے اور باطنی مثل چشمہ کے جو زیر زمین ہے جب تالاب کا پانی نکال نہ دیا جائے اور اس کے نیچے سے کریدا نہ جائے چشمہ کا پانی آنا محال ہے۔''

بھائی! علم اجمالی صورت کے لحاظ سے تین نوع پر منقسم ہے: ایک ظاہری، جس میں عوام وخواص سب مشترک ہیں۔ جیسے آیات محکمات، احکام اوامر ونواہی، بشارت ونذارت ومثلہم۔ دوسرا علم باطنی ہے جو صرف خاصوں کا حصہ ہے، عوام اس کے حامل نہیں ہو سکتے اور تیسرا علم وہ ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان ہے۔ نہ تو اس کا ذکر عام سے ہو سکتا ہے اور نہ خاص سے۔ پہلا ظاہر علم سے ہے، دوسرا علوم باطنیہ سے اور تیسرا اسرار الٰہیہ سے ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

۱۔ افسوس ہے بندوں پر۔

"قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ فِيْكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ يَعْنِىْ مَجْرَى الطَّعَامِ رَوَاهُ الْبُخَارِىُّ"

[مشکوٰۃ، کتاب العلم]

فرمایا کہ محفوظ کیں (یاد کیں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو تھیلیاں (علم کی)۔ایک کو میں نے پھیلا دیا تم میں، اور دوسری اگر میں پھیلاؤں اس کو تو میری رگ گردن کاٹ دی جائے۔" (مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم)

معاملات کی رو سے عمل اسی پر ہے حسب الحکم ذوالجلال والاکرام حسب استعداد ہر ایک کو تعلیم ہوئی اور یہ سنت اللہ اسی طرح جاری ہے اور جاری و ساری رہے گی۔اسی معاملہ کی وجہ سے بالکل ظاہر کے میدان میں دوڑنے والوں کو اعتراضات کا موقع ملا اور اسی وجہ سے انہوں نے انبیاء اور اولیاء کے حال کو اپنے حال کی مانند سمجھا۔اسی لئے ان کا علم ان کیلئے حجاب اور سدراہ ہوگیا اور جہالت کے باعث ان کو انکار ہی آسان معلوم ہوا۔چنانچہ اعتراضات کے ڈھانچے میں ایسے اشکال پیدا کردیئے جو بالکل لایعنی ہیں۔مثلاً حدیث شریف تَنَامُ عَيْنَایَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِىْ [1] کے جواب میں کہا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بیدار ہی رہتا تو لیلۃالتعریس کے موقع پر مع صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز فجر قضا نہ ہوتی۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم | کہ بامن ہرچہ کرد آن آشنا کرد [2]

اگر کوئی آریہ یا نصرانی یہ اعتراض کرتا تو اسے زیبا بھی تھا۔لیکن تف ہے ایسی مسلمانی پر جو اپنے پیغمبر کی زندہ دلی کی بھی قائل نہیں۔

عزیز من! اگر کچھ نور ایمانی ہے تو اس کے لئے یہی حدیث شریف کافی ہے کہ میری آنکھیں سوجاتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقض وضو بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔تو ایسی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ قضا ہوئی نہ ہوسکتی تھی اور یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔یہ واقعی حدیث شریف میں ان الفاظ سے ذکر ہوا ہے:

۱۔میری آنکھیں سوجاتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔۲۔میں اپنے بیگانوں سے ہرگز نالاں نہیں ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے خود میرے جاننے والوں نے کیا ہے۔

"عَنْ زَيْدِبْنِ اَسْلَمَ قَالَ عَرَّسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً بِطَرِيْقِ
مَكَّةَ وَوَكَّلَ بِلَالًا اَنْ يُّوْقِظَهُمْ
لِلصَّلٰوةِ فَرَقَدَ بِلَالٌ وَرَقَدُوْا حَتّٰى اسْتَيْقَظُوْا
وَقَدْ طَلَعَتْ عَلَيْهِمُ الشَّمْسُ فَاسْتَيْقَظَ الْقَوْمُ
فَقَدْ فَزِعُوْا فَاَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّرْكَبُوْا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْ
ذٰلِكَ الْوَادِیْ وَقَالَ اِنَّ هٰذَا وَادٍبِهٖ شَيْطَانٌ
فَرَكِبُوْا حَتّٰى خَرَجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِیْ
وَقَالَ اِنَّ هٰذَا وَادٍبِهٖ شَيْطٰنٌ فَرَكِبُوْا حَتّٰى
خَرَجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِیْ ثُمَّ اَمَرَهُمْ رَسُوْلُ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنْزِلُوْا وَاَنْ
يَّتَوَضَّئُوْا وَاَمَرَ بِلَالًا اَنْ يُّنَادِیَ لِلصَّلٰوةِ وَيُقِيْمُ
فَصَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بِالنَّاسِ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدْ رَاٰی مِنْ فَزَعِهِمْ
فَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا وَلَوْ
شَاءَ لَرَدَّهَا اِلَيْنَا فِیْ حِيْنٍ غَيْرِ هٰذَا فَاِذَا اَرْقَدَ
اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ نَسِيَهَا ثُمَّ فَزِعَ اِلَيْهَا
فَلْيُصَلِّهَا كَمَا كَانَ يُصَلِّيْهَا فِیْ وَقْتِهَا ثُمَّ
اَلْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اِلٰى اَبِیْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ فَقَالَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

"روایت ہے زید بن اسلم سے کہا کہ اترے
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بیچ آخر رات کے مکہ
کے راہ میں اور حکم کیا بلال رضی اللہ عنہ کو یہ کہ
جگا دے ان کو واسطے نماز کے پس سو گیا بلال
اور سو گئے لوگ یہاں تک کہ جاگے اس حال
میں کہ تحقیق طلوع ہوا ان پر آفتاب پس جاگے
لوگ پس تحقیق گھبرائے پس حکم کیا ان کو پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ سوار ہوں، یہاں تک
کہ نکلیں اس جنگل سے اور فرمایا تحقیق یہ جنگل ہے
کہ مسلط ہے اس میں شیطان۔ پس سوار ہوئے
حتی کہ نکلے اس جنگل سے پھر حکم کیا ان کو پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ اتریں اور وضو کریں
اور حکم کیا بلال کو کہ اذان کہے واسطے نماز کے
اور تکبیر کہے پس نماز پڑھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
نے ساتھ لوگوں کے پھر پھرے اور دیکھی
گھبراہٹ ان کی، پس فرمایا اے لوگو! تحقیق اللہ
نے قبض کی تھیں روحیں ہماری اور اگر چاہتا البتہ
پھیرتا ان کو طرف ہماری بیچ غیر اس وقت کے
پس جس وقت کہ سو جائے نماز سے پس گھبرائے
طرف اس کی پس چاہیے کہ پڑھے اس کو جیسا
کہ تھا پڑھتا اس وقت اس کے میں پھر التفات کی

اَتٰی بِلَالًا وَهُوَقَائِمٌ يُصَلِّيْ فَاضْجَعَهٗ ثُمَّ لَمْ يَزِلْ يَهْدِئُهٗ كَمَا يَهْدِ الصَّبِيُّ حَتّٰى نَامَ ثُمَّ دَعَارَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَالًا فَاَخْبَرَبِلَالٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ الَّذِيْ اَخْبَرَرَسُوْلُ اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَابَكْرٍفَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَشْهَدُاَنَّكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ رَوَاهُ مَالِكٍ مُرْسِلًا"

[مشکوٰۃ شریف]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے طرف ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے، پس فرمایا تحقیق شیطان آیا بلال کے پاس اور وہ (یعنی بلال) کھڑا نماز پڑھتا تھا۔ پس تکیہ لگوایا اس کو پھر بڑی دیر تک تھپکتا رہا اس کو جیسے تھپکا جاتا ہے لڑکا، یہاں تک کہ سویا وہ پھر پکارا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو، پس خبر دی بلال نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مانند اس چیز کی کہ خبر دی تھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پس کہا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گواہی دیتا ہوں میں یہ کہ بے شک آپ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے روایت کی یہ مالک نے بطریق ارسال کے۔"

دیکھئے! خود اسی حدیث شریف سے جو نفی علم کیلئے پیش کی جاتی ہے، صاف ظاہر ہے کہ آپ اس حال میں بھی سب حالات سے باخبر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر شیطان کے تصرف سے ایسا علم رکھتے تھے کہ گویا آپ دیکھ رہے ہیں اور اسی اطلاع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی تصدیق رسالت کو دوہرایا۔ لیکن بایں ہمہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ نماز ادا کی اور وہ اس لئے کہ حکم ظاہر شریعت کے مطابق ہے، حال پر نہیں۔ صاحب حال کو حسب استعداد خواہ مخواہ تقلید حاصل ہوا کرتی ہے۔ لیکن جو صاحبِ حال نہ ہو اس کیلئے حال کی تقلید حرام ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا نہ کرتے تو صاحب حال کیلئے حجت ہو جاتی، سنت بن جاتی اور ان جہلاء کیلئے دلیل بن جاتی جو آج اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم ہر وقت نماز ہی میں رہا کرتے ہیں۔ [1] اور ایک حکمت اس میں یہ تھی کہ اگر یہ واقعہ پیش نہ

(۱) خیال ہے کہ شاید عوام اس لطیف اشارہ کو نہ سمجھ سکے ہوں لہٰذا اس کی تفہیم کیلئے مثالاً ایک واقعہ نقل کرتے ہیں: حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "ایک دفعہ ہم اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ (بقیہ صفحہ آئندہ)

آ تا تو عوام کے لئے نیند کی حالت میں نماز کا وقت گزر جانے کی صورت میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔

نفی علم میں ایک ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ''حضور پوچھتے تھے'' یہ کھجور صدقہ کی ہے یا نہیں؟'' سو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہوتا تو دریافت کیوں فرماتے''۔اس کے جواب کے لئے مولیٰ کریم کے کلام پاک نے ہم کو آزاد کر دیا ہے۔یعنی جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو وادی مقدس میں ذات باری تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف بخشا گیا تو اس عزیز الحکیم علیم بذات الصدور نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت فرمایا:

"وَمَاتِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی قَالَ ھِیَ عَصَایَ"[طه:۱۷،۱۸]

''اور تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ؟ کہا یہ میری لاٹھی ہے۔''

تو اس سے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِکَ یہ لازم آتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کو خبر ہوتی تو کیوں دریافت فرماتے؟......اے بھائی! اس مالک کون ومکان سے خوف کرنا چاہیے کہ اس کی غیرت شمع ہر وقت جل رہی ہے مبادا تیرے پروانہ ایمان کو جلا کر راکھ نہ کر دے۔

میرے عزیز! پہلے گزر چکا ہے کہ مطابق سنت اللہ تین نوع پر منقسم ہے۔ایک ظاہری جس کا حکم

حاشیہ صفحہ سابقہ: کے ہمراہ کسی سفر میں تھے اور اثنائے سفر میں آپ گاڑی پر استراحت فرما رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آیا تو ہم نے نماز ادا کر لی اور اعلیٰ حضرت کو مطلع کرنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔لیکن جب نماز کا وقت تنگ ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا تو ہم نے قدرے بلند آواز سے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کہا۔آپ اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ''نماز تو ہم پڑھ چکے ہیں ظاہراً ادا کرنا بھی ضروری ہے۔'' چنانچہ آپ نے وضو فرما کر نماز ادا کی۔'' اب ہم اس حالی کیفیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے تاوقتیکہ صاحب حال نہ ہو جائیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ جب امت کے متاخرین میں سے ایک صاحب حال کی یہ کیفیت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان یہ ہے کہ تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَایَنَامُ قَلْبِیْ، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی کیفیت بھی اسی حال میں معلوم کر لی تو یقین ہے کہ آپ نے اپنے حال میں ضرور نماز ادا کر لی ہوگی۔لیکن چونکہ حالی کیفیات کا اظہار عوام کے سامنے منع ہے اس لئے علی الاعلان ذکر نہ فرمایا اور صاحب حال خود بخود سمجھ لیتے ہیں۔ کماذکر

ظاہر کی طرف ہے۔ دوسرا باطنی، جس کا حکم بطن کی جانب علم ہے۔ اور تیسرا جس کا حکم نہ ظاہر کی طرف ہے اور نہ باطن کی طرف اور وہ معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بس ہے۔ چونکہ اس کا حکم ظاہر کی طرف تھا اس لئے باوجود جاننے کے فرمایا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ جس سے مقصود تصدیق اور علم حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھا، نہ کہ اپنی ذات کے لئے علم، جو رفع جہالت کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اور مفاد اس کا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خوب جان لیں کہ یہ میرا عصا ہے۔ پھر حکم دیا ''اَلْقِ عَصَاکَ'' (ڈال دے عصا اپنا) جب ڈال دیا تو وہ اژدھا بن گیا اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ ڈر گئے۔ فرمایا: ''خُذْھَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی'' یعنی ڈرو نہیں بلکہ اسے پکڑلو۔ ہم اس کو اپنی اصلی حالت پر جس پر آپ کو تصدیق اور علم کروا چکے ہیں، لوٹا دیں گے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دریافت فرمانا علم غیر کے لئے تھا۔ اور مفاد اس میں یہ تھا کہ میری طرف سے حدیث ہو۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کھجور صدقہ سے ہے یا نہیں؟ اور فرمایا کہ یہ اہل بیت پر حرام ہے۔ تا کہ تفصیل کے ساتھ تا قیامت دلیل ہو۔

نیز واقعہ افک کے متعلق جو بے سمجھ اعتراض رکھتے ہیں کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوتی تو آپ اس قدر پریشان نہ ہوتے۔''

اگر ضمیر کے ترازو میں کچھ بھی ایمان وزن رکھتا ہو تو بالکل عیاں ہے کہ آپ کی پریشانی محض انتظار وحی کے لئے تھی۔ اور دوسرے اس بہتان کی وجہ سے تھی جو افتراء پردازوں نے بے دلیل غل مچا رکھا تھا۔ بلا ثبوت شور برپا کر رکھا تھا۔ جس کی نفی بعد میں بڑے غیظ وغضب سے اللہ کی طرف سے کلام پاک کی سورۂ نور کے دو رکوع میں کی گئی۔ اگر آپ کو علم کی بنا پر تسلی وتشفی نہ ہوتی تو اس بہتان کے سبب جو عوام میں محل یقین تک پہنچ چکا تھا، آپ کی غیرت فوراً طلاق کی مقتضی ہوتی لیکن بخلاف اس کے حدیث شریف میں اس طرح بیان ہے کہ:

''فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ مَنْ یَّعْذُرُنِیْ مِنْ رَجُلٍ بَلَغَنِیْ اَذَاہُ فِیْ

''فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہے یا کوئی ایسا ہے جو بدلہ لے اس آدمی سے جس نے

اَھْلِیْ فَوَاللّٰہِ مَاعَلِمْتُ فِیْ اَھْلِیْ اِلَّاخَیْرًاوَقَدْذَکَرَ رَجُلًامَاعَلِمْتُ عَلَیْہِ اِلَّاخَیْرا" (بخاری شریف، کتاب الاشھادات ،باب تعدیل النساء)	میرے اہل بیت (بیوی) کی بابت مجھے ایذادی ہے پس قسم ہے اللہ کی کہ مجھے اپنی بیوی کی بابت علم ہے کہ وہ نیک اور پاک ہے۔اور جس مرد (صفوان) کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی پاک ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیرت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ امہات المومنین کا ذرا خیال زینت دنیا کی طرف مبذول ہونے سے کیا کچھ ہوا تھا۔حتیٰ کہ آپ نے مہینہ بھر کے لئے ایلا کیا اور مشہور ہو گیا کہ شاید آپ نے طلاقیں ہی دے دی ہیں۔قرآن مجید، حدیث شریف اور کتب سیر و تاریخ سب اس پر شاہد ہیں۔

اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرِ ۱ کے طوفان میں غرق اور حقیقت سے بے بہرہ، روشنی کو اندھیرا اور اندھیرے کو روشنی سمجھنے والے، کفر کو اسلام اور اسلام کو کفر جاننے والے صاحبان قرآن مجید میں سے نفی علم غیب کی دلیل ثابت کرنے کے لئے بالخصوص سورۂ یوسف کو اپنا معیار قرار دیتے ہیں اور اپنے خیال سے تفسیر کرتے ہوئے شیطان کو اپنا معاون و مددگار پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اگر حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم غیب من اللہ ہوتا تو اتنا عرصہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہجر و فراق میں کیوں روتے رہتے۔"

افسوس! اگر انصاف کو مدنظر رکھتے اور نور ایمانی کا ایک ذرہ بھی روشن ہوتا تو حقیقت سے اندھوں کو صاف نظر آجاتا کہ یہ سورہ نفی نہیں بلکہ انبیاء کو من اللہ علم غیب ہونا ثابت کر رہی ہے۔لیکن بقول شاعر ے

ہر گز بکعبہ نرسی اے اعرابی!
کیں راہ کہ میروی بترکستان است

کے مصداق بن کر الٹ سمجھ رہے ہیں۔

۱۔ علم بہت بڑا حجاب ہے۔

مولیٰ کریم اپنا فضل و کرم فرما کر اگر ہدایت کی طرف راہنمائی فرمائیں تو شروع قصہ ہی سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیٹوں نے سوال کیا کہ یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ سیر و شکار کے لئے روانہ فرمائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو آگے چل کر وہ بہانہ کرنے والے تھے۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اشارۃً ان کو ان کے ارادہ سے مطلع فرمادیا۔ گویا آپ کا آئندہ کی خبر سے خبردار ہونا قرآن مجید سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے:۔

"قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ"

[یوسف:۱۳]

''انہوں نے کہا کہ یہ امر مجھے غمناک کر دیتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور مجھے یہ بھی خوف ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔''

چنانچہ بیٹوں نے آ کر یہی جواب دیا:

"قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَتَرَكۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ"

[یوسف:۱۷]

'' کہنے لگے کہ ابا! ہم تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو دوڑنے لگے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔''

پھر بیٹوں نے یہ بہانہ:

"وَجَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ"

''کہ ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا لہو بھی لگا لائے۔''

دیکھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ فرمایا:

"قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا"

[یوسف:۱۸]

''کہا یعقوب علیہ السلام نے بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے ایک بات بنالی ہے۔''

اب ان آیاتِ بینات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر صاحب عقل ضرور تسلیم کرے گا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو اس بات سے آگاہ کیا جو ابھی ہونے والی تھی اور پھر یوسف علیہ السلام کو بھیڑیئے کے

کھانے کی خبر سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام کا بتائی ہوئی بات جاننا من اللہ علم غیب پر مطلع ہونے کی صریح دلیل ہے۔

۲۔ برادران حضرت یوسف کا بنیامین کو بموجب حکم عزیز مصر میں لے جانا، اور وہاں چوری کے الزام میں پکڑا جانا، اور برادران یوسف علیہ السلام کا باپ کو آ کر بتانا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ (بلکہ تمہارے نفس نے تم کو کچھ حیلہ بنا دیا) فرمانا، اور بنیامین کو اس اتہام سے پاک جاننا، ہر صاحب دانش اس بات سے اندازہ کرسکتا ہے کہ سوائے علم کے پیغمبر کی زبان سے جو مسلمانوں کے عقائد کے رو سے معصوم ہیں، ایسی بات بالکل نہیں نکل سکتی۔

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ برادران یوسف تو اس مقدمہ میں بالکل بے گناہ بلکہ بے خبر تھے۔ اس لئے صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کو حضرت یوسف علیہما الصلوٰۃ والسلام کے حال سے آگاہی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تدبیر سے کوئی حجاب نہ تھا۔ اور آپ کا بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ فرمانا انہی کے حق میں تھا۔

۳۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا:

"فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِھِمْ جَمِیْعًا" [یوسف: ۸۳]

پس صبر بہتر ہے۔ شتاب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو اکٹھا۔

اور پھر:

"اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" [یوسف: ۹۶]

"میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

فرمانا۔

ان آیات قرآنی کو بنظر نور ایمانی ملاحظہ کیا جائے تو ہر ذی عقل اور صاحب حیا کو ماننا پڑے گا کہ حضور کو بعطائے الٰہی حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق پورا علم تھا۔

۴۔ حضور کا بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی تلاش کیلئے بھیجنا اور:

"یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ" [یوسف:۸۷]

''اے میرے بیٹو! جاؤ! یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔''

فرمانا۔ کیا یہ لاعلمی کی دلیل ہے؟ باوجودیکہ بیٹوں نے صاف عرض کر دیا تھا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کو بقول مخالف حضرات لاعلمی تھی تو بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور بنیامین دونوں کی جستجو میں بھیجنا چہ معنی دارد؟ اب انکار کا موقع ہر اس صاحب ایمان کو جسے کچھ خوف خدا ہے نہیں مل سکتا۔

۵۔ پھر جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو آپ نے فرمایا:

"اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ" [یوسف:۹۴]

''کہ اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے تو مجھے یوسف کی بو آ رہی ہے۔''

چنانچہ جب بشیر نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص لا کر روئے مبارک پر ڈالا تو آپ بینا ہو گئے اور فرمایا:

"قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" [یوسف:۹۶]

''کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

صاف نظر آتا ہے کہ ریح یوسف کا دور دراز مسافت سے معلوم ہونا اور آپ کا یہ برملا کہہ دینا کہ میں اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، علم کی واثق دلیل ہے۔

۶۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قمیص دے کر بشیر کو روانہ کرنا اور فرمانا:

"اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰی وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا" [یوسف:۹۳]

''یہ میرا قمیص لے جاؤ اور اسے والد (صاحب) کے منہ پر ڈال دو تو وہ بینا ہو کر آئیں گے۔''

اس آیت قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تھا کہ جب کرتہ منہ پر ڈالا جائے گا آپ بصیر ہو جائیں گے اور اس سے انکار کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔ تو ثابت ہوا کہ علم

غیب پیغمبروں اور نبیوں کو مولیٰ کریم عطا فرماتے ہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ علم غیب کی نفی کرنے والے صاحبان نبیوں اور مرسلوں کے حال کو اپنی حالت پر متصور کرتے ہوئے محض اسی ضد پر رہ کر اصل معاملہ سے امّی اور ناواقف ہیں۔ان بزرگ ہستیوں پر اپنے ضمیر کو مدنظر رکھتے ہوئے اعتراض کرتے وقت حیا سے کام نہیں لیتے۔ورنہ ہر اہل ایمان کے لئے یہ بات عیاں ہے کہ نبی اور رسول تو درکنار اولیاء اللہ بھی مامور ہوتے ہیں اور باوجود علم ہونے کے حکم خداوندی سے ایک قدم بھی باہر نہیں رکھ سکتے۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات کو ہی ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کی نسبت کوئی اشکال نہ رہ جائے گا۔ایک لحہ کے لئے فرض کرلیا جائے کہ یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی نسبت علم نہ تھا۔لیکن یوسف علیہ السلام کو تو ابا جان کی نسبت بخوبی علم تھا۔مانا کہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے غلامی کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے یا قیدی ہونے کی وجہ سے معذور تھے اور خبر نہ دے سکتے تھے۔لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی خبر تک نہ کی بلکہ جب برادران غلہ لینے کی غرض سے مصر میں تشریف لائے تو بھی اطلاع نہ دی اور نہ ہی والد صاحب (حضرت یعقوب علیہ السلام) کو کوئی پیغام بھیجا۔صرف دوبارہ آتے وقت بھائی (بنیامین) کو ہمراہ لانے کی تاکید کردی۔پھر جب حضرت بنیامین ہمراہ تشریف لائے تو پھر بھی رخصتی کے وقت بھائیوں سے یہ نہ کہا کہ بنیامین میرا بھائی ہے اسے میرے پاس رہنے دو، بلکہ ان کو اپنے پاس رکھنے کیلئے بحکم الٰہی یہ تدبیر کی کہ صواع الملک یعنی بادشاہ کا پیمانہ (پانی پینے کا پیالہ) چپکے سے ان کے رحل میں رکھ دیا۔جس کے متعلق مولیٰ کریم،عزیز الحکیم فرماتے ہیں:

"كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" [یوسف:۷٦]	''اسی طرح ہم نے یوسف کیلئے یہ تدبیر کردی ورنہ وہ اپنے بھائی کو شاہی قوانین کے لحاظ سے اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ من اللہ اظہار کی اجازت ہی نہ تھی اور جب احکم الحاکمین کی طرف سے اجازت ہوگئی تو فوراً بتا دیا کہ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا اَخِيْ، ہاں میں یوسف (علیہ السلام) ہوں اور یہ میرا

بھائی ہے۔اور فرمایا:

"وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ"

[یوسف:۹۴]

''اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔''

ان امور سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مامور من اللہ نبی مرسل اور اولیاء اللہ باوجود علم ہونے کے حکم خداوندی کے سوا اظہار نہیں کر سکتے۔تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی شان تمام انبیاء سے ارفع واعلیٰ ہے بلکہ تمام انبیاء آپ کے مقابلہ میں امتی کی حیثیت رکھتے ہیں،آپ کے علم پر گفتگو کرنا اور اعتراض کرنا کہ آپ کو علم نہ تھا،سراسر نادانی اور جہالت ہے۔

اے بھائی!انکار کا تو کوئی علاج ہی نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب پر احادیث تو درکنار نص قطعی یعنی کلام اللہ سے کافی شہادت ہے۔اگر کچھ صراط مستقیم کی ضرورت اور حق کی طلب ہے،اگر کچھ خوف خدا ہے تو ضد کو چھوڑ کر پنبۂ غفلت کو دل کے کانوں سے نکال دے اور چشم بصیرت کو کھول کر دیکھ کہ مولیٰ کریم کیا ارشاد فرما رہے ہیں:

"وَلَاتَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَائِنَةٍمِّنْهُمْ اِلَّاقَلِيْلاًمِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ"

[المائدة:۱۳]

''اور ہمیشہ رہے گا تو خبردار ہوتا ان کی خیانت سے مگر تھوڑے سے ان میں سے پس معاف کر ان سے اور درگزر کر،بے شک اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو۔''

اور فرمایا:

"يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْجَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَايُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًامِّمَّاكُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْاعَنْ كَثِيْرٍقَدْجَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌوَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ"

[المائدة:۱۵]

''اے اہل کتاب!بیشک آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا،بیان کرتا ہے واسطے تمہارے بہت اس چیز سے کہ تھے تم چھپاتے کتاب میں سے اور درگزر کرتا ہے بہت سے،بیشک آیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب بیان کرنے

والی۔''

دوسری جگہ سورۂ تحریم میں فرمایا:

"وَاِذْاَسَرَّالنَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا، فَلَمَّانَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ" [التحریم:۳]

''اور جب نبی نے چھپا کر اپنی بعض بی بی سے ایک بات کہی پھر جب اس بی بی نے خبر دی اس بات کی اور خدا نے اس حال سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا تو پیغمبر نے کچھ تو جتائی اور کچھ نہ بتائی۔''

یہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کے تمام مخفی رازوں، شرارتوں اور خیانتوں سے مطلع تو کر دیا لیکن آپ نے مناسب صورت حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ تو اظہار فرما دیا اور جو اظہار کے قابل نہ تھا اس کو مخفی ہی رکھا۔

قرآن مجید کا نزول کئی وجہ پر ہوا ہے اور کئی نوع پر منقسم ہے، ان سب صورتوں کا اجمالی بیان تین طرح پر واضح ہے جن کا عمل مختلف ہے۔[1] محکمات [2] متشابہات اور [3] مقطعات۔

1۔محکمات:

جن کے متعلق هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ فرمایا گیا ہے، اس حصہ کا حکم بظاہر احکام پر مبنی ہے یعنی اوامر و نواہی، حلال و حرام، معاملات، جزا و سزا فی الدنیا و فی الآخرہ ہے، جس کے معانی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔عمل کے میدان میں کچھ اختلاف ہے جس کا مفاد اس کے وجودی عمل کے اثبات پر ہے۔خواہ فرع آپس کی ضد کے باعث بلائے جان اور سدِ راہ ہی کیوں نہ ہو جائے اصل کے خلاف کا متقضی نہیں ہوسکتا۔

2۔متشابہات:

جن میں کئی معنوں کا احتمال ہوسکتا ہے: کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ، فَاَمَّاالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِوَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَایَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّااللّٰهُ،وَالرَّاسِخُوْنَ

''اور متشابہات بھی ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو متشابہات کے در پے ہوتے ہیں کہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں اور

فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ، کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا، وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ"
[آل عمران:۷]

مراد اصلی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں مضبوط ہیں وہ کہتے ہیں ایمان لائے ہم ساتھ اس کے، ہر ایک ہمارے رب کے پاس سے ہے اور عقل والے لوگ ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔"

3۔ مقطعات:

ان کے معانی کو سوائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خاص الخاص متبعین بندگان خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

محکمات تو عوام کیلئے ہے اور متشابہات خواص کیلئے جن پر منجانب اللہ علم کا دروازہ کھلا ہوا ہے، جیسے واقعہ معراج، حضرت آدم علیہ السلام کی جنت میں سکونت، شجرہ ممنوعہ وہبوط ومثلہا۔ لیکن مقطعات خاص الخالص مرسلین کیلئے ہے جیسے فرمایا:

"فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی" ". پس وحی کی اپنے بندے پر جو وحی کی۔"

غور کیجئے! باوجود تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ، ہونے کے یہاں اجمالاً بھی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ کتاب اللہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ، یعنی ہر ایک چیز کو بیان کرنے والی ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہے کہ سب کے لئے یکساں ہے؟ سب کیلئے مساوی تو محکمات بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ علمائے ظاہر سند حاصل کر کے، دستارِ فضیلت باندھ کر اپنے فکر کے دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد ایک دوسرے کے سخت مخالف ہو رہے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْآنِ لٰکِنْ
تُقَاصِرُ عَنْہُ اَفْھَامُ الرِّجَالِ [۱]

اے بھائی! مولیٰ کریم اپنے فضل وکرم سے تجھے صحیح فکر اور نیک سمجھ عطا فرمائیں، قرآن حکیم عوام

۱۔ تمام علوم قرآن مجید میں موجود ہیں، لیکن لوگوں کے فہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

کیلئے تو قال ہی ہے لیکن حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خاص الخاص متبعین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فائزین کیلئے صدور و حال۔ کیوں نہ ہو۔ یہ کلام اس رب العلمین کا ہے جو علیم بذات الصدور ہے۔ اس لئے اس کا شان نزول دو وجہ پر ہے۔ ایک بظاہر واقعہ کی ضرورت کو پورا کرنے کی رو سے اور دوسرا مطابق حال۔ کافروں کیلئے اور طرح، مومنوں کیلئے اور، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے اور، ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق تعلیم ہوئی۔ مناسبت حال سے مناسبت امور کا نزول فرمایا گیا۔ گویا شان نزول ہمارے حال کی عبارت سے ہے۔ اور یہ اعجاز کلام الٰہی ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ[1]

مثلاً اصحاب کہف کے قصہ میں لوگوں کے اختلاف کو رفع کرنے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا:

"وَلَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا" [الکھف: ۲۵] "اور اصحاب کہف اپنی غار میں نو اوپر تین سو سال رہے۔"

تو ساتھ ہی جواب کفار کیلئے ارشاد ہوا:

"قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا" [الکھف: ۲۶] "کہہ دو کہ جتنی مدت وہ رہے اسے خدا ہی خوب جانتا ہے۔"

بعض معترض کہہ دیں گے کہ یہ نفی علم نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کے علم کی تصدیق ہے اور یہ لایعنی اعتراض ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کیلئے تو قرآن مجید کا فرمان بس ہے۔ پھر اَللّٰہُ اَعْلَمُ سے کیا فائدہ؟ اور ساتھ قُلْ اس امر کا شاہد ہے کہ یہ رد کفار کیلئے جواب تھا۔ ورنہ قُلْ کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح قرآن شریف میں جتنے قُل نفی علم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وارد ہیں سب کے سب جواب کفار میں ہیں۔

ایک صاحب اعتقاد نے ان سب کو کسر نفسی پر محمول کیا ہے۔ جس پر مخالف نے اعتراض کیا ہے کہ کیا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ نبی نے جھوٹ کہا ہے، اور مولیٰ کریم نے جھوٹ سکھایا ہے؟ کیا اس کتاب میں جھوٹ کا بھی دخل ہو سکتا ہے؟ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ۔

۱۔ اور لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

گو کسرِ نفسی کے طور پر ایسا جواب کسی حد تک درست ہے جیسے سورۂ یوسف میں ہے کہ جب شاہ مصر نے حکم دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید سے آزاد کر کے میرے پاس لے آؤ تو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیغام سن کر فرمایا کہ پہلے جا کر میرے متعلق ان عورتوں سے دریافت کر دیکھو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ چنانچہ جب ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا:

"قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ، قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ" [یوسف: ۵۱]

''بادشاہ نے (عورتوں سے) پوچھا کہ بھلا اس وقت کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف سے (ناجائز طور پر) اپنی کاربرآری چاہی؟ بول اٹھیں کہ حاشاللہ! ہم نے اس میں کوئی برائی معلوم نہیں کی۔''

ظاہر ہے کہ آپ کا یہ اقدام سراسر اپنی بریت پر مبنی تھا لیکن چونکہ اپنے آپ کو پاک کہنا ایک عیب ہے اس لئے اپنی زبان مبارک سے یوں فرمایا:

"وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ" [یوسف: ۵۳]

اور میں اپنے نفس کو پاک صاف نہیں کہتا۔ بیشک نفس برائی کی طرف حکم کرنے والا ہے۔

بالکل اسی اسلوب اور اسی نہج پر یہ آیات مبارکہ ہیں۔ مثلاً:

"قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ" [الانعام: ۵۰]

کہہ دو، میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس خزانے خدا کے ہیں اور نہ میں جانتا ہوں غیب کو اور نہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔

لیکن جن آیات کے شروع میں لفظ قُلْ ہے ان کو نہ تو کسرِ نفسی پر تاویل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور حیلہ کی حاجت، جھوٹ کہنا تو سراسر نادانی اور جہالت ہے کیونکہ یہ شریعت غرا پر الزام کے مطابق ہے اور شرع شریف حکم کے تابع ہے جس کے وجود کیلئے کئی لباس حرام سے حلال اور حلال سے حرام کی صورت میں تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بموجب حکم خدا جل

وعلاٱلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ [1] اسی کو مکمل کر دینے والی ہوئی۔ تاہم انبیاء ومرسلین کی شریعت عوام سے مرفوع ہی ہے۔ مثلاً مہر کا ادا کرنا، چار سے زیادہ نکاح اور تہجد کی فرضیت اس امر پر واضح دلائل ہیں۔

اس مقدمہ میں ایک امر غور طلب ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی شریعت میں ناحق قتل، جھوٹ، اور بہتان کبھی جائز نہیں ہوا اور نہ ہی آئندہ ہوگا۔ فرمایا ہے:

"مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا"

[النساء: ۹۳]

"جو کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے پس بدلہ اس کا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور غضب ناک ہوا اللہ اوپر اس کے لعنت کی اس کو اور تیار کیا واسطے اس کے بڑا عذاب۔"

"وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا"

[النساء: ۱۱۲]

"اور جو کوئی کمائے کچھ خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے ساتھ اس کے بے گناہ کو پس بیشک اٹھالی اس نے بہتان اور گناہ ظاہر۔"

لیکن جب باری تعالیٰ کی اس حکمت کاملہ نے کسی مصلحت کے پیش نظر کوئی امر ظاہر شریعت کے خلاف مقرر کر دیا تو اس کے لئے وہ حکم جائز اور جاری ہوگیا۔ جیسے حضرت یوسف اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعات سے ظاہر ہے۔

۱۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ"

[یوسف: ۷۰]

"تو جب ان کا اسباب تیار کر دیا تو اپنے بھائی کے شلیتے میں پیانہ (پیالہ) رکھوا دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو! یقیناً تم چور ہو۔"

۲۔ "فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ

"پس دونوں (حضرت موسیٰ اور خضر) چل پڑے حتیٰ کہ کشتی میں سوار ہوئے تو خضر علیہ

۱۔ آج کے دن کامل کر دیا میں نے تمہارے لئے دین تمہارا۔

شَیْئًا اِمْرًا"

[الکہف: ۷۱]

السلام نے کشتی کو پھاڑ ڈالا موسیٰ نے کہا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ اس کے سواروں کو غرق کردیں یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات کی"

"فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّةً بِغَیْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّکْرًا"

[الکہف: ۷۴]

"پھر دونوں چلے حتیٰ کہ رستے میں ایک لڑکا ملا تو خضر نے اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ نے کہا کہ آپ نے ایک بے گناہ شخص کو ناحق بغیر قصاص کے مار ڈالا یہ تو آپ نے بری بات کی۔"

یہ امر مسلم ہے کہ نزول قرآن شریف خاص واقع ہوا ہے اور حکم عام۔ اور یہ مناسبت حال کی رو سے ہے مثلاً:

"وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ عَرْضًا ۙ الَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ وَ کَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا"

[الکہف: ۱۰۰، ۱۰۱]

"اور روبرو لائیں گئے ہم دوزخ کو اس دن واسطے کافروں کے روبرو لانا۔ وہ لوگ کہ تھیں آنکھیں ان کی بیچ پردے کے یاد میری سے اور نہیں تھے سن سکتے۔"

کا شان نزول خاص کفار کے لئے ہے اور حکم مناسبت رکھنے والوں کے لئے عام۔ مناسبت کے لحاظ سے مومن ہو یا کافر، سب برابر ہیں۔ بلکہ باوجود ایمان رکھنے کے اس نسبت کا ہونا زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ کافر کے متعلق احتمال ہے کہ وہ نور ایمانی کے ذریعے اس اعمیت سے خلاصی پائے۔ لیکن جو ایمان رکھنے کے باوجود اس سے مناسبت رکھتا ہو اس کا اس بلا سے نجات پانا دشوار ہے۔ جب تک وہ اعتقاد کی درستی اور رجوع نہ کرے۔ لہٰذا اس امر سے خوف رکھنا چاہیے کہ کلمات بحکم خدا جواب کفار میں ان کی طرف منسوب ہیں کہیں مومن ان سے مناسبت نہ رکھے اور جو باری تعالیٰ کے غیظ وغضب کی رو سے حجت ختم کرنے کیلئے وارد ہوا ہے اس پر اعتقاد رکھ لینے کے سبب سے نور ایمانی کو نہ کھودے۔

قرآن کریم کا نزول واقعات کے سوا ایک ایک لفظ حال کے مطابق تطبیق کرنے والا ہے۔ ذرا چشم

بصیرت سے غور وفکر کے ترازو میں ایقان کے اوزان سے موازنہ کرکہ توحید کا یا فعل کا بیان کرتے ہوئے هُوَ الَّذِیْ سے ارشاد ہوتا ہے۔ جو ہمارے حال یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے موافق ہے۔ بعض غیر مسلم خصوصا آریہ اور عیسائی جہالت کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ خدا کا کلام نہیں ورنہ اِنِّیْ یا اَنَــا کا لفظ ہوتا۔ جو ذات سے اتصال رکھتا ہے۔ اور ھُـــــوَ کی نسبت غیر کیطرف ہے۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ کلام الملوک ملوک الکلام کے مطابق هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِـرُوَ الظَّـاهِـرُوَ الْبَـاطِنُ کا کلام جو سراسر حال اور ہمارے حال کے مترادف ہے پر اسرار واقع ہوا ہے۔ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ مشیت ایزدی سے وادی مقدس میں قدمزن ہوئے تو ارشاد ہوا:

"اِنِّیْ اَنَارَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ" [طٰہٰ:۱۲] "بیشک میں ہی ہوں رب تیرا پس اتار لے جوتے اپنے۔"

چونکہ اس وقت تجلیات کا ظہور تھا اس لئے مطابق حال اور ورود ویسا ہی ارشاد فرمایا۔ یوں تو آلٓمٓ سے لیکر وَ النَّاس تک سارا کلام الٰہی ہے، خواہ وہ قصص کی رو سے غیر کا کلام ہو یا حال وکلام وکفار۔ گو قرات کے لحاظ سے خواہ نماز میں ہی کیوں نہ ہو، پڑھنا اور سننا ثواب بلکہ فرض ہے۔ لیکن عمل میں از حد اختلاف ہے۔ مثلاً فرعون کی زبان سے اَنَــا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی [۱] کلام الٰہی تو ہے لیکن عمل کے میدان میں کفر ہے اور اس کا عامل واجب القتل۔ التحیات یعنی قعدہ نماز میں رَبَّنَــا اغْـفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ [۲] دعائے قرآنی کا پڑھنا جائز اور مروج ہے۔ لیکن جس کے والدین کا خاتمہ کفر پر ہوا ہو، اسے تلاوت اور قرات کے بغیر دعا کے طور پر پڑھنا بحکم خدا ممنوع ہے۔ اسی طرح جس آیت قرآن شریف کا شان نزول کفار کے حق میں ہو اس پر مومنین کا عمل حرام ہے۔ اور جن آیات کے ساتھ قُـلْ جو حکم خدا کا مقتضی ہے اس پر عقیدہ یا عمل مطلق گمراہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اکثر قُـلْ جیسے قُـلْ هُوَ اللّٰـهُ اَحَـدٌ محض سوال کفار کا تعلیما جواب ہیں ان کو اسی پر معیار کرنا نادانی ہے۔ یہ صرف اس موقع ومحل پر واقع ہوا ہے جن کے انکار کی وجہ سے وعید اور بیان انکار اور وعدہ عذاب کی

۱۔ میں تمہارا سب سے اعلیٰ رب ہوں۔

۲۔ اے ہمارے رب! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش۔

تفصیل درج ہے جن کے لئے بات پوری ہو چکی کچھ تو مِثْلُکُمْ کی وجہ پر بیان ہو چکے جن کو دوبارہ درج کرنا بے سود ہے۔ باقی سب کے سب ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ یہ اشکال پوری تکمیل کے ساتھ حل ہو جائے۔ وَمَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّابِاللّٰہ![1]

تو اس علیم خبیر نے پہلے ان مشوروں کی خبر دی کہ:

"وَاَسَرُّوْاالنَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْاھَلْ ھٰذَااِلَّابَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" ''اور چھپ چھپ کر مشورہ کیا ان لوگوں نے کہ ظالم ہیں کہ نہیں یہ مگر بشر ہے مثل تمہاری۔''

پھر جواب کفار میں حضور کو حکم ہو رہا ہے:

"قُلْ اِنَّمَااَنَابَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" ''آپ کہہ دیجئے کہ ہاں میں تمہارے ہی جیسا آدمی ہوں۔ جو ان کے حال کے مناسب تھا۔''

[حم السجدۃ:٦]

اب نہایت ادب کے ساتھ التجا بلکہ استغاثہ ہے کہ اس سلطنت قرآنی کی حکومت میں سیر کریں، ہر بازار اور گلی کوچے میں تجسس کر کے دیکھیں، ہر محل اور ہر موقع میں چراغ ایمان کی روشنی سے متلاشی ہوں، ہر شجر کی ٹہنیوں اور پتوں کے رگ وریشہ سے معلوم کریں، ہر وادی میں سیر گردانی کریں، ہر گلستاں کی ہر بہار کے پھولوں کی خوشبو سونگھیں، اس میں آفتاب کے تصرفات کو دریافت کریں، اس کی رات کے ماہتاب اور ستاروں سیاروں کی حرکات وسکنات کا ملاحظہ فرمائیں کہ کہیں مومنین کے شان یا ان کے جواب میں یا ان کے اعتقادات کی بناء پر انکو مطلع کرنے لئے، حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے بھی ایسا بیان ہوا ہے۔ یعنی ارشاد باری تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ مومنوں سے کہہ دو جو قُلْ جواب کفار کی مثل اور مانند ہوں؟ ایک کلمہ تو درکنار ایک حرف بھی میدان قرطاس میں کلام الٰہی سے اس قسم کا نہیں ملے گا۔

ہاں! بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ[2] حکمت سکھانے والا حکیم، رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ[3] مطابق اِنَّ رَحْمَةَ

١۔ اور مجھ میں توفیق نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ۔

٢۔ مومنوں کے ساتھ شفقت کرنے والے مہربان۔

٣۔ تمام جہانوں کیلئے رحمت۔

اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ [1] معلم ومزکی، مبشر ونذیر، سراج منیر۔

نزول قرآن حکیم کے مطابق مولیٰ کریم کا معاملہ کفار کے ساتھ ان کے اعتقادات اور انکار واعمال کی وجہ پر ان کے حال کے مناسب ہے، اور مومنین کے ساتھ ان کے اعتقادات اور تسلیم واعمال کی بناء پر ان کے حال کے مناسب ہے۔ مثلاً شَدِیْدُ الْعِقَاب [2] کفار کیلئے ہے تو غَفُوْرٌ رَّحِیْم [3] مومنین کے لئے۔ عمل کے میدان میں خدا کا تصرف بالکل عیاں ہے۔ جو فرمان نازل فرمائے ہیں، ملاحظہ ہوں:

"لَاتَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا" [النور: ٦٣]

"مت مقرر کرو پکارنا پیغمبر کا درمیان اپنے جیسا پکارنا بعضے تمہارے کا ہے بعضوں کو۔"

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ، یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ، اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ" [الحجرات: ١ تا ٣]

"اے اہل ایمان! خدا اور رسول سے پہلے بات نہ کیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا سنتا جانتا ہے۔ اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو۔ اور جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزمائے ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔"

١۔ بے شک رحمت اللہ تعالیٰ کی قریب ہے نیکو کاروں سے۔

٢۔ نہایت سخت عذاب والا۔

٣۔ بے حد بخشش کرنے والا نہایت مہربان۔

پھر فرماتے ہیں:

"وَذَرۡنِىۡ وَالۡمُكَذِّبِيۡنَ اُولِى النَّعۡمَةِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِيۡلًا" [المزمل: ۱۱]

''اور چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں صاحبوں آرام کے کو اور ڈھیل دے ان کو تھوڑی سی۔''

"قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ، لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ"[الکفرون: ۱،۲]

''کہ اے کافرو! نہیں عبادت کرتا میں اس چیز کی کہ عبادت کرتے ہو تم۔''

دیکھیے! متذکرہ بالا آیات جو مومنین کے حق میں ہیں کافروں کے بالکل برخلاف ہیں۔ اور جو کافروں کے حق میں ہیں، مومنوں کے خلاف ہیں۔ اسی طرح یہ قُلۡ جو بالکل حکم خدا کے مترادف ہے، اہل ایمان کیلئے سمجھنا سراسر گمراہی ہے۔ کیونکہ یہ محض کفار کیلئے ہے اور انہی کے مناسبت حال کی رو سے ہے۔ اور جو مومنوں کے لئے ہیں اس پر ایمان رکھنا اہل ایمان کے لئے اکسیر ہدایت اور سبیل رشد اور دو جہاں کی کامیابی ہے۔ ورنہ باوجود مومن ہونے کے اعمیت اور ہدایت سے محرومیت کا باعث ہے۔ اور وہ اس لئے کہ جس چیز پر اعتقاد نہ ہو اس سے حصول ناممکن ہوتا ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰىنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ" [ھود: ۲۸]

''انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! کیا دیکھا تم نے اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی ہو جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہو تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے باندھ سکتے ہیں اور تم اس سے بیزار ہو۔''

تو ان ہر دو قسم کی آیات میں جو ایک دوسری کی ضد ہیں، سخت اختلاف ہے۔ صاحب اعتقاد ان کو دلیل پکڑیں گئے، اور نہ ماننے والے ان کو دلیل بنائیں گئے۔ لیکن اس صورت میں بموجب فرمان ایزد متعال:

"اَفَلا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْافِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا" [النساء: ۸۲]

"بھلا یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔"

وحدانیت اور کلام الٰہی میں سخت فرق لاحق ہوگا۔جس سے نور ایمانی کے ضائع ہونے کا احتمال ہے۔اس لئے اس تطبیق کے سوا چارہ نہیں ہے۔اور دلائل کی رو سے ماننا ہی پڑے گا کہ جواب کفار منکرین کے لئے ہے اور اثبات علم مومنین کے لئے۔تو نے نہیں دیکھا کہ کس وضاحت سے مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۱؎ فرمایا ہے۔

اس موقع پر آج کل کے عالم حجاب اکبر کے بحر میں غوطہ لگانے کے بعد ضرور کہ دیں گئے کہ تمہارا اور پیغمبر کا فرق صرف وحی کا ہے۔ورنہ مثلنا میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔اور وحی پر ہمارا ایمان ہے۔" معلوم ہوتا ہے کہ شاید وحی کو انہوں نے اس رقعہ یا پروانہ کی مانند سمجھ رکھا ہے جو ایک دوسرے کی طرف بھیجا جاتا ہے اور انہیں یہ نہیں معلوم کہ وحی ایک ایسی حالت ہے جس کا برگزیدہ ہستیوں کے سوا کوئی متحمل نہیں ہوسکتا۔ اگر کچھ نظر عمیق ہے تو دیکھو مولیٰ کریم ان کفار کے جواب میں کیا ارشاد فرمارہے ہیں جن کو نبوت کی ہوس تھی:

"اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ" [الانعام: ۱۲۴]

"اللہ خوب جانتا ہے کہ کس جگہ رکھے رسالت اپنی کو۔"

یہاں ایک لفظ اظہار کے قابل ہے کہ مثلنا تو فعل اور اعتقاد کفار ہے۔روف ورحیم اس سے مومنوں کو بچائے رکھے۔رہا یہ کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کے ذریعے احکام الٰہی ہم کو پہنچیں ان پر عمل کرنا ہی مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۱؎ ہے اور بس۔لیکن اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ ۲؎ جو اصل ایمان اور نور ایقان ہے، فَاتَّبِعُوْنِیْ ۳؎ کے سوا محال ہے۔گو

۱۔جس نے اطاعت کی رسول کی پس بے شک اطاعت کی اللہ کی۔

۲۔اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو۔

۳۔پیروی کرو میری۔

اطاعت اور اتباع

کے معنی ایک ہی سمجھے جاتے ہیں۔لیکن ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔اطاعت حکم کی تعمیل ہے جو بے گانگی ہے اور اتباع یگانگی۔حکم ماننا اور اس پر عمل کرنا اطاعت ہے۔اور اتباع قدم بقدم چلنا مطابقت ہے۔بعض احکام عنایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کی طرح تھے۔مثلاً نماز تہجد۔اور عام مسلمانوں پر یہ فرض نہیں کی گئی۔لیکن اتباع کے میدان میں یہ فرض ہی کی حیثیت رکھے گئی۔جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حکم ہو رہا ہے:

"ثُمَّ اَوْحَیْنَـا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِـعْ مِلَّةَ اِبْـرَاهِیْمَ حَنِیْفًا"[النحل:۱۲۳]　　"پھر وحی بھیجی ہم نے طرف تیری یہ کہ پیروی کر دین ابراہیم (علیہ السلام) حنیف کی۔"

تو اس میں اطاعت کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اتباع حنیف کا حکم ہے کہ جیسے یکسوئی والے اور خلیل ابراہیم علیہ السلام تھے، ویسے ہی تم بھی ہو جاؤ تو یہ اشارہ حال سے ہے۔اسی طرح مومنوں کو مطلع فرمایا ہے:

"قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ" [آل عمران: ۳۱]　　"کہ دو میرے حبیب! اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو یا رکھنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، محبت کرے تم سے اللہ تعالیٰ۔"

کیونکہ جب تک اتباع نہ کرو گے کبھی محبت کو نہ پہنچ سکو گے۔اطاعت جوارح کے فعل سے ہے اور اتباع قلب کے جذب سے، اور محبت کا تعلق دل سے ہی ہے۔اسی لئے اس لفظ کو محبت کے لئے مخصوص کیا ہے اور اطاعت سے محبت تک پہنچنا دشوار ہے۔گو اطاعت مجاہدہ کی رو سے سبب یافت و یاب ہے لیکن حال کی علت نہیں ہے۔کیونکہ حال کی تقلید بغیر حال کے کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ہم لوگ صرف اعتقاد کی شمع اور روشنی سے اس کے فضل کی امید پر ساعی ہیں۔

محققین اہل سنت و جماعت کے نزدیک ولی کا وجود عوام کے روح کی مانند ہوتا ہے اور نبی کا وجود ولی کی روح کی مانند۔گو اس روح سے بطن یا روحانیت مراد ہے لیکن مراتب اور حال کے لحاظ سے یہ کہ دینا ہی موزون ہوگا۔کیونکہ عام مومن اس حال میں جبکہ اس کے حواس خمسہ نیند میں مستغرق ہوں، اور روح بطن

کی طرف متوجہ ہو تو گاہے عینی خواب دیکھتا ہے۔ اور ولی بے داری میں وجود کی آفت سے چھوٹا ہوا ان معنوں کو پانے والا ہوتا ہے۔ تاہم سر اور حقیقت کی رویت کے لئے غنودگی یا استغراق لازم ہوتا ہے۔ لیکن نبی کے لئے بالکل بظاہر بے داری میں عام حالت کی مانند یہ عبارت نمود پکڑتی ہے۔ ولی کو بھید میں الہام سے اطلاع دی جاتی ہے اور نبی کو ظاہر وحی سے۔ کرامت ولی کے لئے ہوا کرتی ہے اور معجزہ نبی کے لئے عام پر ظاہر کرنے کے واسطے۔ ولایت کی انتہاء نبوت کی ابتداء ہوتی ہے۔ ولی طلب میں جانے والا ہوتا ہے اور نبی مقصود کو پائے ہوئے واپس الی الخلق آنے والا ہے۔ ولی ولایت کے اظہار سے معطل ہوتا ہے اور نبی دعوائے نبوت سے تصدیق کو پہنچنے والا۔ خواہ آج مسلمان کہلانے والے مشلنا کے حجاب میں انتہاء کو پہنچ گئے ہوں، مراتب اور مدارج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کے گناہ دوسرے کے ثواب ہیں۔ بلکہ ہم کو تو نبیوں اور رسولوں کے گناہ بھی نصیب نہیں ہیں۔ مثلاً حضرت یونس علیہ السلام سے جو قصور سرزد ہوا وہ محض غیرت اسلام اور کفر سے بیزاری تھا۔ لیکن عتاب میں گرفتار ہوئے اور فرمایا کہ اگر یونس معافی نہ مانگتے اور اپنے رب کی تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتے۔ لیکن ادھر اگر آج کسی کو وہ غیرت نصیب ہو تو بلا شبہ وہ ولی اللہ ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

"حَسَنٰتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ وَحَسَنٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ سَیِّئٰتُ الْعَاشِقِیْنَ وَحَسَنٰتُ الْعَاشِقِیْنَ سَیِّئٰتُ الْوَاصِلِیْنَ"

"ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں اور مقربین کی نیکیاں عاشقین کی برائیاں ہیں اور عاشقین کی نیکیاں واصلین کی برائیاں ہیں۔"

عوام کے نزدیک یہ بات عجیب ہے۔ کیونکہ گناہ اور ثواب دو متضاد فعل ہیں۔ تو پھر ایک کے گناہ دوسرے کے لئے ثواب کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اے عزیز! خداوند تجھے نیک سمجھ عطاء فرمائے اور تیرے علم کو زیادہ کرے۔ یہ گناہ و ثواب حال کے تغیر سے ہے فعل کے صادر ہونے سے نہیں۔ جب واصل کا کسی خطاء سے تنزل ہوتا ہے تو وہ اپنے مقام وصل یعنی اس حال سے جس میں اسے مشاہدہ اور لقاء سے اطمینان تھا، گرایا جاتا ہے تو وہ وصل کے لئے درد فرقت میں بے قرار ہوتا ہے۔ اور عاشق اپنے مقام درد اور محبت میں خوش ہوتا ہے۔ تو گویا واصل کا حال تنزل کی

صورت میں عاشق کی مانند ہوتا ہے۔ اور جب عاشق کسی وجہ سے اپنے مقام سے گرتا ہے تو مقرب کے مقام میں آتا ہے اور اس عشق ومحبت کے لئے بے قرار ہوتا ہے جو اسے حاصل تھا۔ اور مقرب گاہے درد والفت کی ہوا سے لینت قلب سے سرور پاتا اور خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح مقرب کسی غفلت سے چارونا چار ابرار ہوتا ہے۔

تو جب بندگانِ خدا اور مردانِ اللہ کے حال کے علم سے ہماری عقلیں عاجز ہیں تو نبیوں اور مرسلوں کے حال کے علم سے تو کلام ہی کیا۔ بلکہ جو کچھ بھی ہم نعمت کی رو سے نبیوں اور مرسلوں کی نسبت جانیں یا کہیں وہ ہم آپ ہی ہوں گے۔ ان کے حال سے تو کسی ولی کو بھی حصہ نہیں ہے مگر بہت کم۔ اور عوام تو اس میں از حد عاجز ہیں اور یہی باعث انکار ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کی حقیقت سے عارف اور شناسا نہ ہو سکے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے۔ مطابق فرمان:

"بَلْ كَذَّبُوْا بِمَالَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ" [یونس: ۳۹]	''حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر قابو نہ پایا جا سکے اس کو نادانی سے جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت ان تک آئی ہی نہیں۔''

اور سورہ مومنوں میں فرمایا:

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ" [المومنون: ٦٩]	''یا نہیں پہچانا انہوں نے رسول اپنے کو پس وہ واسطے اس کے انکار کرنے والے ہیں۔''

لغت میں منکر کے معنی ناشناس کے بھی ہیں۔ دیکھو! سورہ یوسف میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَجَاءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ" [یوسف: ۵۸]	''اور آئے بھائی یوسف کے پس داخل ہوئے پاس اس کے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ پہچان سکے۔''

تو یہاں منکرین کے معنی ناشناس کے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے باوجود تسلیم کر لینے کے یہ انکار باعث جہالت ابدی اور مقصود سے نامرادی اور حقیقت سے اعمیت ہے، کیونکہ یہ سوء اعتقادی ہے۔ جب بنیادی

حقیقت کے خلاف ہو تو عمارت کی استقامت حق پر محال ہے۔ اور اس محل میں لقائے الٰہی اور سیر الی اللہ کا مشاہدہ ناممکن۔ اس واسطے کہ جس چیز پر یقین ہی نہ ہو اس کے لئے سعی کے قدم کٹ جاتے ہیں۔ تو پھر سب اعمال اور اجر الٹے ہو جاتے ہیں۔ جن مسلمانوں کو مولیٰ کریم نے اپنے فضل و کرم سے اس گمراہی کے گڑھے سے بچا لیا ہے، گو وہ حقیقت تک نہ ہی پہنچ سکیں تاہم صراط المستقیم پر حسن اعتقاد کے سہارے چل رہے ہیں۔ اور بخشش و نعمت کے مستحق ہیں۔ لیکن جو سوء اعتقادی کے دریا میں غرق ہو رہے ہیں، کنارہ نجات ان کے لئے عنقاء ہو گیا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا [1]

تو افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مثل خیال کرتے ہیں اور آیت رشد کو ظاہری اسباب پر ہی جانچ رہے ہیں۔ گویا وہ دین کی حقیقت اور نور ایمانی کو ظلمات کے حجاب میں مستور کر رہے ہیں۔ تو حسرت سے کہنا ہی پڑے گا کہ پھر ان کفار میں جن کے حق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہو رہا ہے:

"وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ" [یونس: ۴۳]

"اور بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم ایسے اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے اگر چہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں۔"

اور ان مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود نور ہدایت کے اور حضور کی طرف دیکھنا ہی سبیل رشد ہے۔ لیکن بظاہر صورت جو ایک دوسرے کے مثل ہے، اسکی نفی فرمائی ہے کہ "میرے حبیب! آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف دیکھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں دیکھتے تو کیا ایسے اندھوں کو جن کی نظریں آپ کے ظاہر ہی پر رہ گئیں اور حقیقت سے ناشناس ہیں، راستہ دکھائیں گے؟ جس حال میں کہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں" تو وہ نور جو بشریت کے لباس میں مستور تھا، وہ ہدایت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں پوشیدہ تھی، وہ کیفیت جو چشم حبیب خدا سے ہویدا تھی، وہ شمع جو دونوں جہان کی روشنی کا موجب ہے اس سے اندھے رہ کر گمراہ ہوئے تو بظاہر دیکھنا ان کے لئے بجائے نفع

۱۔ پناہ پکڑتے ہیں ہم ساتھ اللہ تعالیٰ کے نفسوں کی برائیوں سے اور اپنے برے عملوں سے۔

کے نقصان کا باعث ہوا۔ تو آج مدعیان اسلام بھی اس حقیقت نور اور ہدایت سے ناشناس اور منکر ہو رہے ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ اس پر مصر ہیں۔ تو گویا جہالت کو علم، تاریکی کو روشنی، اور گمراہی کو راستہ سمجھ رہے ہیں ورنہ زمانہ کے صدیق اکبر حقیقت سے ماہر، معنوں کو پائے ہوئے، صحابہ میں سے برگزیدہ نے کیا ہی حق فرمایا ہے:

"حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَاثَلٰثٌ النَّظَرُ اِلٰی وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاِنْفَاقُ مَالِیْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَنْ تَكُوْنَ ابْنَتِیْ تَحْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ

[منبهات ابن حجر]

"پسند ہیں مجھ کو دنیا کی تین چیزیں۔ دیکھنا طرف رسول اللہ کے، اور خرچ کرنا اپنے مال کو رسول اللہ پر اور میری بیٹی بی بی رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔"

قرآن حکیم میں فکر و تدبر سے دیکھیں تو اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ [1] کا مفاد اس بات پر دال ہے کہ اس شخص کو جو دل کی آنکھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھتا وہ ہدایت سے اندھا اور محروم ہے۔ گو دعوت عام اور ہدایت خاص ہے جس میں ارادہ حضور کو خاص حصہ ہے۔ لیکن اس بد بخت کیلئے جس نے اپنے باطن کی آنکھ کو کج فہمی اور سوء اعتقادی سے اندھا رکھا نفی فرمائی ہے کہ "تم کس طرح ہدایت دے سکتے ہو اس بے نصیب کو جو آپ کو باوجود نظر کرنے کے نہیں دیکھتا۔ لیکن جنہوں نے دیکھا اور نور پایا، خوب جانتے ہیں، بلکہ یاب کے دامن کو حسرت کے ہاتھوں جھاڑتے ہوئے حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہ قطب زمان فرماتے ہیں کہ "تین چیزوں کی کنہ کو میں نہیں پہنچ سکا: (۱) معرفت الٰہی (۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات (۳) نفس کی شرارت

درحریم سر تعظیم تو کس را راہ نیست
وز کمال احتشامش ہیچ کس آگاہ نیست

اور یہ اس طرح ہے جیسے فرمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ لیکن یہ کمال معرفت اور عبادت کی دلیل ہے۔ کیونکہ حَقَّ عَبَادَتِکَ

۱۔ کیا پس تو اندھے کو راستہ دکھاتا ہے۔

اور حَقَّ مَعْرِفَتِک کے الفاظ سے عرف اور اس کی حقیقت سے علم ثابت ہوتا ہے، اور یہ عبارت حال کے دوام اور کنہ سے ہے، جہالت سے نہیں۔ اور

انسان کی علم وعرف میں سیر

اس کے مدارج ومنازل تک محدود ہوا کرتی ہے۔ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہ اپنے مکتوبات شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے چھ منزلیں ہیں (۱) عالم ارواح سے پشت والد (۲) بطن مادر (۳) میدان دنیا (۴) قبر یعنی عالم برزخ (۵) میدان قیامت (۶) دوزخ یا بہشت۔

ہر چند پیدائش سے قبل وما بعد کا کوئی علم نہیں۔ ہوش سنبھالا تو میدان دنیا ہی میں، علم کے حصول کے بعد ماضی، حال اور مستقبل سے معلومات ومحسوسات میں جذب ہوئے۔ اس سے پہلے نہ خدا کا پتہ نہ دین اسلام کی خبر، نہ اپنے سے جان پہچان نہ عیب سے علم، نہ صواب سے عرف۔ محض یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ پر دارو مدار۔ پھر علم یقین بلکہ حق الیقین کی یہی جگہ، سعی وحصول کا قیمتی وقت، جنت اور دوزخ خریدنے کی تجارت گاہ، معرفت خداوندی حاصل کرنے کا مقام، مومن وکافر۔ فاسق ومنافق، جاہل وعالم بننے کا محل، حرص و طول امل کا بے انتہا شجر، تفاخر اور خودغرضی کی ناؤ، سود کا قاعدہ، اندھا دھند معشوق بے وفا، جاہلیت کا مرکز، غفلت کی زندگی، مومن کا قید خانہ، دوست کیلئے بلا، بوڑھی دلہن لباس مکر سے آراستہ، خوبصورت منقش سانپ، مہلک بیداد، عبث مایہ، مصائب اور آفات کا سمندر پرخون، یافت وحصول مطعون، اَلدُّنْیَامَلْعُوْنٌ وَمَافِیْهَامَلْعُوْنٌ ظلمت بے نور، اَلدُّنْیَامَتَاعُ الْغُرُوْر صبح جس کو نوازتی ہے شام کو گرادیتی ہے۔ اس کا فائدہ نقصان اور نقصان فائدہ۔ اس الٹ بیان کا کیا ٹھکانا، بس دھوکہ اور فریب ہے اس سے دل لگانا۔

انسان نے یہاں آکر پرورش پائی، اسی جگہ عقل آئی، میدان دنیا ہی میں حیاتی پائی، اور پھر اسی جگہ ہی موت کا شکار ہوا۔ بے نام ونشان ہوا، اور پھر یہاں سے ہی اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ لیکن کہاں کا اٹھنا اور کیسی موت! جب تک زندہ ہے کچھ یاد نہیں:

''اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَلِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا''[الملک:۲]	''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ آزمائے تم کو کہ تم میں سے کون اچھا ہے۔''

سے بے خبر آزمائش کے میدان میں حرص وحظ کے بستر پر طول امل کا تکیہ لگائے، غفلت کی چادر اوڑھے، بے فکری کی نیند میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ وہ سعی اور کوشش جو مولیٰ کریم نے صراط المستقیم پر چلنے اور عین حقیقت کو پہچاننے کیلئے عنایت فرمائی تھی، بے راہ اور بے محل میں صرف کر رہا ہے اور اپنی دانست میں بہت اچھا کر رہا ہے۔

اسی خسارہ اور نقصان سے بچانے کیلئے اور صراط المستقیم اور مقصود کو پانے کیلئے مولیٰ کریم اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ارشاد فرما رہے ہیں۔ گویا دعوت دے کر علم حق سے متنبہ فرما رہے ہیں۔

"قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا، اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا"

[الکھف: ۱۰۳، ۱۰۴]

کہو (میرے حبیب!) کیا ہم تم کو بتائیں کہ عملوں کے لحاظ سے خسارہ میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی سعی حیاتی دنیا میں صرف ہوگئی اور وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

سعی کو تو آخرت کی راہ پر لگنا لگانا تھا، سو اس طرف سے تو بالکل بے توجہی رہی، اور دنیا کے سامان عیش وعشرت اور حظوظ نفسانی کیلئے خون جگر پی پی کر نہایت اخلاص سے طالب اور تمام عمر کوشاں رہے اور اسی کو مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔

اے عزیز! یہ دو حصوں پر منقسم ہے: ایک بظاہر، دوسرے بباطن۔ بظاہر طاقت سے عمل ظہور پکڑتے ہیں اور بباطن ہمت ہے۔ اور ہمت قدرت سے اور قدرت ہستی سے وابستہ ہے۔ گو بظاہر طاقت بھی ہمت کے سوا متحرک نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ جب تک انسان کسی امر (بد یا نیک) کیلئے مرید نہیں ہوتا، جوارح کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جو ارادہ یا خیال طاقت کی طرف رخ کرتا ہے گویا حاکم اپنے محکوم کی طرف حکم فرماتا ہے، وہ بجا لاتے ہیں۔ اور جونسی قوت ارادی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتی اور اپنے فکر وغور میں منہمک رہتی ہے وہ ہمت ہے اَلْهِمَّةُ اِسْمُ الْاَعْظَم!!

یہ تو ہر انسان سمجھدار پر روشن ہے کہ جب یہ اپنے ارادوں سے کوئی کام کرنے لگتا ہے تو صرف چند

لمحوں کیلئے جب تک فکر اس سے وابستہ ہو، ہمت اور طاقت جمع ہو جاتی ہے۔لیکن جہاں کام شروع ہو گیا،خواہ وہ تحریر اور حساب ہی کیوں نہ ہوں،اس کی ہمت اس کام پر جمع اور مقید ومحدود نہیں رہتی بلکہ کسی مطلوب اور مرغوب مقصود کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔تو گویا یہی حقیقی انسان ہی صوری اور معنوی صورت میں دوڑا پھرتا ہے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک یہ دوسرا وجود ہے جو ملکی صورت کہلانے کا مستحق ہے بعض ہستیوں کی ہمت اس قدر بلند اور طاقتور ہو جاتی ہے کہ ان سے نہایت عجیب وغریب واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اور چونکہ بظاہر اعضائے عناصر کی طرف ان کی اکثر توجہ نہیں ہوتی اور ساری ہمت باطن ہی میں متصرف رہتی ہے اس لئے ان کی بھی ہمت بالکل کمزور ہو جاتی ہے،اور یہاں تک ترقی کر جاتے ہیں کہ ہوا میں اڑ جاتے ہیں، پانی پر زمین کی طرح چل سکتے ہیں، ہزار ہا کوس کی مسافت چند قدم میں طے کر لیتے ہیں۔اور ان کے ارادوں سے کئی ایک ایسے خرق عادت واقعات سرزد ہونے لگتے ہیں کہ عوام الناس کی عقلوں پر دیکھ لینے اور مان لینے کے بعد بھی تنگی واقع ہوتی ہے، کہ روحانیت اس جسم کی (باوجود ثقل کے) طرح کس طرح متحمل ہو سکتی ہے؟ نہ معلوم کہ ان بندگان خدا کا وجود مثل لباس کے ہو جاتا ہے۔اگر انسان اپنی طاقت سے لباس بے جان کو ساتھ لئے پھرتا ہے تو یہ وجود بھی ان مقدس ہستیوں کیلئے گراں نہیں ہوسکتا۔

لیکن ان بندگان خدا کا مقصود خرق عادت نہیں ہوتا۔عوام الناس کے نزدیک تو یہی ولایت اور کمال فقر ہے، حالانکہ یہ راستہ کا کھیل اور تماشہ ہیں، نہ منزل مقصود۔اسی لئے کوتاہ بین مسمریزم کی شعبدہ بازی کو بھی اس کی مثل خیال کرنے لگتے ہیں۔

گو مسمریزم بھی ایک طاقت خیال ہے جو مدت کی تنہائی میں مشق کا نتیجہ ہے لیکن ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔کبھی کسی مسمریزم کے عامل سے ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا اور ہزار ہا کوس پر فوراً پہنچنا یا پہنچا دینا سرزد ہوا نہ ہوسکتا ہے۔کیونکہ ان کی طاقت محض دماغی اثر ہے جو کسی آدمی پر پڑ کر اس کو بے ہوش کردے یا کسی چیز کو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اٹھا کر دیوار سے ٹکرا دے یا توڑ دے، یعنی جس قوت ارادی سے اعضا کے وسیلہ سے کام کرنا تھا، بلا جوارح کر دیا، کئی ایسے تماشے دکھا سکتے ہیں اور عوام کو حیرت میں ڈال

دیتے ہیں۔ جب کسی آدمی کو سامنے بٹھا کر اثر ڈالتے ہیں تو بے ہوش کر دیتے ہیں۔لیکن وہ ان کے بلانے سے بولتا ہے، جو کچھ پوچھتے ہیں، بتاتا ہے، کچھ پوشیدہ اشیاء سے خبر دیتا ہے وغیرہ۔تو یہ بے ہوشی اصل بے ہوشی کی مانند نہیں ہوتی، کیونکہ محض ان کی دماغی توجہ کا اثر اس طاقت پر (جس کو ہمت کہنا روا ہے) پڑ کر کشش کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جوارح سے بے توجہ ہو کر جمع ہو جاتی ہے اور وہ آدمی چند منٹ کیلئے بے ہوش کی طرح ہو جاتا ہے۔لیکن بعد میں خود بخود ہوش میں آجاتا ہے اور کوئی اثر باقی نہیں رہتا

بعض جاہل لوگ اس کو بھی ولایت ربانی سے مشابہ سمجھنے لگتے ہیں۔یا فقرا اور اہل دین الحق کی کرامات کو اسی پر خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ مسمریزم ہے اور کچھ بھی نہیں۔اور یہ سراسر دھوکا اور خطا ہے۔ کیونکہ ولایت دوستی اور محبت کو کہتے ہیں جو محض عنایات الٰہیہ پر منحصر ہے۔اور ان کی ہمت کا رخ ہمت کی طرف اور توجہ روح کی جانب اور دوسرے وجود کے اثبات پر بلکہ اس سے بھی ورابے انتہاء دنیا و مافیہا سے اعراض کئے ہوئے آخرت کی حیاتی کے حصول پر متصرف ہوتی ہے۔اور مسمریزم والوں کی توجہ اس کے برعکس حصول دنیا اور عجیب وغریب تماشا دکھانے کی طرف ہوتی ہے۔

چہ نسبت خاک را باعالم پاک

اور ایک بہت بڑا قابل غور فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام کا معاملہ قلب سے وابستہ ہے جو کسی کسب سے حاصل نہیں ہوتا۔مطلق ورودِالٰہی اور ارادۂ الٰہی پر منحصر ہے۔اور یہ سراسر کسب کا نتیجہ ہے جو چاہے حاصل کرے۔اور محض دماغی اثر ہے جس کا ثبات اور پائیدار ہونا محال ہے۔

بندگانِ خدا کی توجہ کا اثر قلب پر ہوتا ہے،اس کی تاثیر اور نور سے یکسوئی بلاکسب پیدا ہوتی ہے۔تڑپا دیتی ہے، حالت کو بدل دیتی ہے، روحانیت کو بڑھا دیتی ہے اور بہیمیت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہونے دیتی، بلکہ اتحادی توجہ سے تو بالکل صورت وسیرت ظاہر و باطن میں یکساں ہو جاتا ہے۔

جب حضرت باقی باللہ قدس سرہٗ نے نان بائی کو توجہ دی اور حجرہ سے باہر آئے تو ارادت مندوں پر مشکل واقع ہوئی کہ اب آداب وسلام کس کا بجالائیں، کیونکہ حضرت صاحب اور نان بائی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا۔لیکن جلد ہی تفاوت نمایاں ہوگیا، کیونکہ آپ تو اپنے حسب معمول کاروبار میں مشغول

ہوئے اور نان بائی گم صم بے ہوش پڑا تھا۔ نا استعدادی کے باعث ہوش وحواس بجانہ رہے اور تیسرے دن مرگیا۔ اسی لئے تو آپ نے اس کے حسبِ اشتیاق فرمایا تھا کہ میرے جیسا ہو جائے گا۔ مگر اس نے نہ مانا اوا اسی وقت ہونا چاہا۔ عرض کیا کہ حضرت! اگر ہونا ہے تو ابھی ہو۔ ہر چند سمجھایا گیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دفعتاً توجہ سے یہ انجام ہوا۔ اگر آہستہ آہستہ تعلیم ہوتی تو برداشت ہو جاتی۔

ہزار ہا ایسے واقعات بزرگان دین سے سرزد ہوئے ہیں لیکن میرا اس کتاب میں یہ تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ بہرکیف ان ہستیوں سے بحالت اضطراری اور اختیاری دونوں طرح سے خرق عادت واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ محض محبت کے پھول ہوتے ہیں، جو مومن کی صفت ہے۔ غیر ومتعلقاتِ غیر، دنیا و مافیہا کو اپنے قلب میں جگہ دنیا گناہ سمجھتے ہیں۔ اسی نشۂ توحید میں سرشار اور مستغرق رہتے ہیں۔

کشف کیا چیز، کرامت کیا ہے؟
استقامت ہے ولایت ساری

کشف وکرامت کو بندگانِ خدا نے حیض ونفاس سے تعبیر کیا ہے، لیکن اس کے معنی صرف حقیر اور ناپاک چیز نہیں بلکہ آثار بلوغت بھی ہیں، لیکن عوام کو سوائے امور (کرامت، دعا، دم وغیرہ) کے باطن سے کچھ علم وحصول نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اسی کو معراج کمال تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ متقدمین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کرامت کا ظہور بہت کم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا حوصلہ اور استعداد نہایت قوی اور بالاتر تھے۔

سوال:

چاہیے تھا کہ جس قدر استعداد اور قابلیت زیادہ ہو اسی قدر خرق عادت بھی زیادہ ہو؟

جواب:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، لیکن کرامت اضطراری اور اختیاری دو صورتوں پر ظاہر ہوتی ہے، تو جس قدر حوصلہ فراخ ہوگا۔ مطابق: لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اضطرار نہ ہوگا۔ اور اختیاری کو وہ پسند نہ

کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پائے ہوئے تھے، ان کا حال ان خوارق عادات سے بالاتر تھا، اوراس وجہ پر جو کچھ ان سے ظاہر ہوا وہ ان کے معاملہ کی صحت سے ہے، اور وہ اس کو کرامت نہیں جانتے۔ مثلاً:

جب ایک عجمی شخص برے ارادے سے مدینہ شریف میں آیا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خرابہ میں تازیانہ سر کے نیچے رکھے سوئے ہوئے پایا تو کہا: اس شخص سے جہان میں اس قدر فتنہ ہے؟ اور دل میں امیر المومنین کو مار ڈالنے کو آسان سمجھ کر تلوار کھینچی تو دو شیر ظاہر ہوئے، جو اس پر حملہ کرنے کو تھے، چیخا، اور اس کی آواز سے امیر المومنین جاگ اٹھے، اور وہ اسلام لے آیا۔

یہ کرامت تھی جو نہ اضطراری ہے نہ اختیاری، محض حفاظت من اللہ تھی اور مولیٰ کریم سے حال کی صحت۔

۲۔ ایک صحابی فوج اسلام کے سپاہی بن کر قاصد کی حیثیت سے دشمن کی طرف جنگل میں جا رہے تھے، راستے میں شیر ملا اور حملہ کا ارادہ کیا۔ آپ نے جلدی سے پروانہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا اور فرمایا کہ اے شیر! اگر خداوند کریم کی طرف سے تجھے کھانے کا حکم ہو تو میں تیری خوراک ہوں، لیکن میں اس کام کیلئے بھیجا گیا ہوں جس کا حرج اسلام کا نقصان ہے، شیر متواضع ہوا اور سر نیچا کر دیا، وہ صاحب اس پر سوار ہو کر فوج مخالف کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دشمن نے یہ صورت حال معائنہ کی تو صلح کر لی اور جنگ سے باز رہے۔

بہر کیف اصحاب خیر القرون میں بھی کرامات کا وقوع اس کثرت سے مذکور ہے کہ ان کے اندراج کیلئے یہاں گنجائش نہیں اور نہ ہی میرا یہ مقصود ہے۔ غرض اس سے صرف یہ ہے کہ جب انسان اپنے پروردگار کا فرماں بردار ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس کی نافرمان نہیں رہتی۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

لیکن ان کا مقصود حصول دنیا نہیں بلکہ آخرت ہوتا ہے، دنیا و مافیہا سے منہ پھیرے ہوئے ہمہ تن

ہمت اور طاقت سے اپنے مقصود ومطلوب کے حصول میں ساعی ہوتے ہیں۔اور فرمان ذوالجلال والاکرام ہے:

''اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی'' [النجم:۳۹]

''یہ کہ نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جس میں وہ کوشش کرے۔''

توان کے نزدیک حیات دنیا کوئی چیز نہ تھی،اوراگرتھی تو آخرت کی حیاتی کیلئے،ان کا مقصود آخرت اور مطلوب مولیٰ کریم۔

آج اسلام اورایمان کے معانی اور مفاد دریائے حرص وہوا میں غرق ہورہے ہیں۔اور وَمَاهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّالَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۱؎ کو طاق نسیان میں رکھ کراسی کے فریفتہ اور شیدا وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۲؎ سے اعراض کئے ہوئے :لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۳؎ سے جاہل ہورہے ہیں تو علم الیقین نے ان کو کیا نفع دیا۔

تونے نہیں دیکھا جب جادوگر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آئے تو فرعون سے وعدہ کے طلب گار ہوئے کہ'' اگر ہم غالب رہے تو ہمیں انعام ملے گا۔'' فرعون بولا:''ہاں بلکہ تمہیں مقرب بنالیا جائے گا۔'' آخر جب مقابلہ میں حق ظاہر ہوا اور وہ مغلوب ہوگئے تو بے ساختہ :اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ،رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ کا نعرہ بلند کر کے سجدہ میں گر گئے اور ایمان والوں میں شامل ہوگئے،فرعون یہ دیکھ کر غیظ وغضب میں بھر گیا اور بولا:

"قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ، فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَا اَشَدُّ عَذَابًا

''فرعون بولا کہ پیشتر اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں تم اس پر ایمان لے آئے،بیشک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد) ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے،تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں جانب خلاف سے کٹوا

۱۔اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور تماشا۔ ۲۔اور آخرت کا گھر وہی زندگی ہے۔
۳۔ کاش کہ وہ جانتے ہوتے۔

وَّاَبْقٰی، قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَاءَ نَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا، اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَکْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ، وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی"

[طه: ۷۱تا۷۳]

دوں گا اور کھجور کے پتوں پر سولی چڑھادوں گا، اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر تک رہنے والا ہے، انہوں نے کہا کہ جو دلائل ہمارے پاس آگئے ہیں ان پر اور جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اس پر ہم تجھ کو ہرگز ترجیح نہیں دیں گے، تو جو تجھے کرنا ہے کر چک، اور تو جو حکم دے سکتا ہے تو صرف اس دنیا کی زندگی میں، ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور اسے بھی جو تم نے ہم سے زبردستی جادو کروایا ہے۔ اور خدا بہتر باقی رہنے والا ہے۔"

نہایت قابل غور، سبق آموز بصیرت افروز ہے کہ جب جادوگر مغلوب ہوئے اور دیکھا کہ ہمارے بنائے ہوئے سانپوں کو ایک اژدہا جس کا اصل عصا تھا، کھا گیا ہے تو انہیں کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ لوگوں کی نظروں میں نظر بندی کر کے لکڑیوں اور رسیوں کے سانپ متحرک بنا دکھانا تو جادو کا فعل ہے۔ بمصداق کلام الٰہی:

"فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی"

[طه: ٦٦]

"پس ناگہاں رسیاں ان کی اور لاٹھیاں ان کی خیال بندھا تھا طرف اس کی جادو ان کے سے یہ کہ وہ دوڑتے ہیں۔"

لیکن ایک لکڑی کا بحکم خدا سانپ بن کر ان رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل جانا جادو نہیں ہوسکتا، تب ان کو حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور ہارون علیہما السلام کی صداقت کا یقین ہوگیا۔ سجدہ میں گر پڑے اور رب موسیٰ وہارون کا اقرار کرلیا۔ لیکن بعد از ایمان جب عنایت الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور معانی ان پر ظاہر

ہوئے تو نور ایمانی سے دل زندہ ہو گئے، تب حیات الدنیا کو ہیچ سمجھے اور جذبہ حقانی سے مست ہو کر:۔

خوردہ یک جرعہ از کفِ ساقی ہر چہ فانی سب کردہ باقی

دامن از فکر غیر افشاند لَیْسَ فِیْ الدَّارِ غَیْرُہ خواند[1]

فرعون کو صاف جواب دیا کہ تو کیا کر سکتا ہے؟ بہت ہوگا تو حیات الدنیا میں ایذا دے گا یا قتل کرے گا تو اس کی ہمیں کچھ فکر نہیں اور نہ ہی ہمارا کوئی نقصان ہے۔ ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ[2] دانش مند کے لئے ان آیات میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ پہلا اقرار اور ایمان دلائل کی رو سے رَبِّ مُوْسٰی وَھَارُوْنَ اسلام کی مانند تسلیم کرنا تھا۔ لیکن جب انوار الٰہی کی بارش سے قلب سیراب ہوئے اور رویت کی روئیدگی سے عین الیقین حاصل ہوا تو اٰمَنَّا بِرَبِّنَا کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔

دلائل تو فرعون تک بھی ایسے ہی پہنچے تھے جیسے جادوگروں کو۔ بلکہ اس کی دعوت کے لئے مولیٰ کریم کی طرف سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو بالخصوص فرمان تھا کہ ''ان نشانات اور دلائل کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ، شاید وہ غور کرے۔'' بلکہ جادوگروں سے زیادہ نشانات اس نے دیکھے تھے۔ مطابق فرمان: ''فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِہٖ'' یعنی نو نشانات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف داعی ہوئے۔ فرق یہ تھا کہ ید بیضا اور عصا بڑی نشانیاں تھیں، اور فرعون بلکہ اس کے اراکین کے دلوں میں یقین ہو چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق لے کر آئے ہیں اور یہ ید بیضا اور عصا جادو نہیں ہے، معجزہ ہے چنانچہ فرمایا:

''وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَا اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا'' [نمل: ۱۴] ''دلوں نے تو ان کا یقین کر لیا تھا مگر انہوں نے بے انصافی اور غرور سے انکار کیا۔''

لیکن جب فرعون نے اپنی طرف دیکھا تو اس کو اپنی خدائی اور شاہی نے راہ راست پر نہ آنے دیا اور حق سے باز رکھا۔ اور اس کو تکبر میں ملبوس کر دیا۔ اس نعمت عظمیٰ اور حیات جاودانی سے جس کو کبھی زوال نہیں آ سکتا، بے نصیب کر دیا اور جان بوجھ کر دنیا کی حقیر زندگی اور ناپائدار زینت وجاہ وحشمت پر ہی

۱۔ ساقی کی ہتھیلی سے ایک گھونٹ نے ہر فانی چیز کو باقی کر دیا اور غیر کے فکر سے دامن کو جھاڑ دیا اور ''نہیں ہے کوئی گھر میں اس کے سوا'' کا سبق پڑھا دیا۔ ۲۔ پاک ہے اللہ اپنی تعریف کے ساتھ۔

رہ گیا۔ جب غرق ہونے لگا تب ایمان لانا بھلا معلوم ہوا، بولا:

"اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآاِلٰهَ اِلَّاالَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓاِسْرَآءِیْلَ وَاَنَامِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" [یونس: ۹۰]

''ایمان لایا میں یہ کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ کہ ایمان لائے ہیں ساتھ اس کے بنی اسرائیل اور میں فرماں برداروں سے ہوں۔''

مگر بے سود، کیونکہ مہلت دنیا کے گزر جانے اور وعدۂ الٰہی آجانے اور عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لانا کام نہیں دیتا۔

آج ہماری تصدیق بھی فرعونی تصدیق سے بڑھی ہوئی نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہماری نفسانیت اس سے کسی طرح کم ہے۔

نفس ما را کمتر از فرعون نیست لیک او را عون، ما را عون نیست

کیونکہ آج نام نہاد مسلمان بھی جان بوجھ کر لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ۱ کو طاق نسیان میں رکھ کر اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِالدُّنْیَا ۲ کے نشہ میں مخمور اِنَّمَآاَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ ۳ سے جاہل مَاالْحَیٰوةُالدُّنْیَآاِلَّامَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۴ کے دھوکا میں ایسے گرفتار ہوئے ہیں کہ نقصان کو فائدہ اور نفع کو نقصان، میدان کو کھنڈر اور کھنڈر کو میدان سمجھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے اپنی تمام ہمت اور طاقت سے فکر و کوشش حیات الدنیا ہی پر خرچ کیے جاتے ہیں اور ظاہر و باطن باخلاص تمام جان و مال سے فریفتہ ہوئے جاتے ہیں۔ کَلَّابَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَوَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۵ کے مرتکب ہو کر دنیا و مافیہا سے محبت رکھنے والے اور آخرت سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ انجام سے بے خبر اور موت کے شکار، غفلت کے میدان میں نفس کے رہوار پر سوار حرص و ہوا کا چابک ہاتھ میں لئے حجاب کے عذاب کیلئے جلدی کر رہے ہیں۔ جس حیاتی یعنی

۱۔ تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا ہے عمل میں۔ ۲۔ مال اور بیٹے زندگانی کی زینت ہیں۔

۳۔ سوائے اس کے نہیں کہ تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں۔

۴۔ نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر پونجی دھوکے کی۔

۵۔ ہرگز نہیں، بلکہ پسند کیا تم نے دنیا کو اور بھلا دیا تم نے آخرت کو۔

وقت معین میں حصول آخرت اور حیات جاودانی مقصود تھا اور جس میں قوت سے سامان معیشت اور ہمت سے رجوع الی اللہ ادنی درجہ تھا وہ سب کا سب دنیا و مافیہا ہی میں صرف ہوگیا۔ عبادت و ریاضت، فکروغم جو تمام تر سرمایہ آخرت کا موجب تھا، اس کا تو ذکر ہی کیا۔ اگر ہوا بھی مقصود دنیا اور مافیہا۔ ہمارے رکوع وسجود اور قیام وقعود سب اغراض دنیا سے ملبوس اور ہماری دعا ومناجات ہماری خواہشات سے ملوث:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

[هود: ١٥، ١٦]

''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب وزینت کے طالب ہوں ہم دنیا ہی میں ان کے اعمال کا بدلہ دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو کچھ اعمال انہوں نے اس میں کئے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے رہے سب ضائع۔''

دنیا چند روزہ زندگی ہے اور انسان غفلت کی نیند میں مستغرق، اور ایسا جاہل کہ جس کیلئے مولیٰ کریم نے وعدہ فرمایا کہ:

"مَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا"

[هود: ٦]

''نہیں کوئی چلنے والا زمین میں مگر اللہ کے ذمے ہے رزق اس کا۔''

اس کی طلب میں مارا مارا پھرتا ہے، خونِ جگر پیتا ہے، بے قرار ہو ہو جاتا ہے اور جس کام کے لئے جس مدعا کے واسطے اس کو پیدا کیا گیا ہے، جس فائدہ کیلئے اس کو عالم امر سے عالم شہود میں لایا گیا ہے، جس غرض کیلئے مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ کی میعاد سے مطلع کر کے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (اَیْ لِيَعْرِفُوْنِ) [1] فرمایا ہے ادھر رجوع ہی نہیں ہے۔ خوابِ خرگوش کی مانند بے ہوش ہو رہا ہے۔ لیکن موت کے بعد جب اس وجود سے انتقال کرتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے کہ آہ! جس کی طلب میں رات دن میں جان ودل

١۔ نہیں پیدا کیا میں نے جنوں کو اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ عبادت کریں یعنی اپنے معبود کو پہچانیں۔

سے عاشق تھا وہ میرے کام نہ آسکی اور آخرت کا میدان خالی رہ گیا۔جس میں بے سروسامان بلکہ گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے داخل ہونا پڑا،مثل خواب حیات الدنیا میں اصل مقصود کو بھول کر محض لہو ولعب ہی میں نایاب وقت کو کھو بیٹھا۔اور آج حسرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

کاش! آج اس وقت کی جو ہوا سے تیز جا رہا ہے،قدر ہوتی۔اپنی سعی کو گمراہ نہ کرتے،اور اس بے بہا دولتِ ہمت کو راہ پر صرف کر کے ابدی فلاح حاصل کرتے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ہمت باطنی ارادہ،قدرت اور فکر ہے۔ظاہر و باطن کے سب کام انہی سے وابستہ اور انہی پر منحصر ہیں۔ہر ایک امر کیلئے پہلے خیال کا ہونا معروف ہے اور خیال سے فکر قوت پکڑتا ہے تو ارادہ پیدا ہوتا ہے۔اور سب ارادے اس کی قدرت کے محتاج ہیں اور ہر طرح کی قدرت روح سے ہے۔تو جس وجود کی روح کا میلان جسمانیت (بشریت) کی طرف ہو،یعنی جس انسان کا رخ طبیعت کی طرف ہو اس شخص سے متعلقات جسم یعنی دنیا و مافیہا کی طلب کے سوا اور کچھ سرزد نہیں ہوتا ہے۔اور اس کا مقصود دنیا کی زندگی اور اس کا مطلوب سامان عیش و آرام وغیرہ ہی ہوتا ہے اور یہی اصل گمراہی ہے۔خواہ نمازیں پڑھے اور حج ادا کرے۔کیونکہ یہ جو کچھ بھی بظاہر کرتا ہے اگر اس سے اس کے باطن میں کوئی اثر پیدا نہ ہو تو بے سود ہے۔بلکہ درجہ ایمان میں جو شخص زبان سے بظاہر اسلام کا اقرار کرے اور دل میں تصدیق نہ رکھتا ہو وہ عنداللہ منافق ہے جو اس کافر سے جو کسی شبہہ کی بنا پر یا تصدیق نہ ہونے کی وجہ سے انکار کرتا ہو،بدرجہا برا ہے۔کیونکہ اس کی نسبت امکان اور گمان ہے کہ تصدیق کے بعد مومن ہو جائے۔لیکن منافق باوجود مسلمان ہونے کے انکار رکھنے والا (یعنی کافر) ہے۔اسی لئے ان کے حق میں وعید فرمائی ہے کہ:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَلَهُمْ نَصِيْرًا" [النساء:١٤٥]	"بیشک منافق آگ کے سب سے نیچے کے درجے میں ہیں اور تو ان کیلئے ہرگز کوئی مددگار نہ پائے گا۔"

اور یہ نہ ٹلنے والی گمراہی اور نہ ہٹنے والا اندھیرا ہے،جس کیلئے کوئی چراغ نہیں،کیونکہ راستہ پر جس کا رخ الٹ جائے اور روشنی سے جس کو اندھیرا ہو،نور سے ظلمت نصیب ہو،دین کی آڑ میں دنیا کمانے والا،

اسلام کے لباس میں کفر چھپانے والا کس بات پر ایمان لائیگا۔ جب کہ عین بصارت سے اندھا رہنا پسند کرے؟

"مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا" [بنی اسرائیل: ۷۲]

"جوشخص اس (دنیا) میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے سخت بھٹکا ہوا ہے۔"

اس اعمیت سے مراد باطن کی آنکھ کا اندھا ہونا ہے۔ نہ بظاہر کا جو کسی عارضہ سے اندھی ہوگئی ہو، کیونکہ اگر اسی ظاہری آنکھ سے مراد لی جائے تو ضرور ہے کہ سب اندھے بیگناہ آخرت میں اندھے ہوں، اور یہ محال ہے۔ اسی لئے مولیٰ کریم نے دوسرے مقام پر اس کی توضیح فرمادی ہے:

"فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ" [الحج: ۴۶]

"پس بیشک وہ نہیں اندھی ہوتیں آنکھیں ولیکن اندھے ہوجاتے ہیں دل جو کہ سینوں کے اندر ہیں۔"

دل کا اندھا ہونا انکار کے اندھیرے اور ایمان کی ضیا سے بے بصر ہونے کی وجہ سے ہے۔ مگر یاد رہے کہ وہ بصیرت ایمانی اور نور ایقانی جو دل کی آنکھ کے متعلق ہے اس کا ماخذ بھی یہی آنکھیں ہیں اور اسی آلہ اور اسی راستہ ہی سے بقاء ربانی اور مشاہدۂ یزدانی اور نور سبحانی سے معرفت کا ہونا قرار پاتا ہے، خواہ بظاہر آلہ بگڑ کر بند ہوگیا ہو تاہم باطن کی روشنی کے منافی نہیں ہے۔ جیسے الہام اور وحی کیلئے کان ہی مخصوص ہیں اور کان کا بند ہونا اس کے منافی نہیں ہے، اے عزیز! دیکھ سورہ کہف میں کیا تصریح ہو رہی ہے:

"وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ عَرْضًا الَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ وَکَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا" [الکهف: ۱۰۰ تا ۱۰۱]

"اور اس روز دوزخ کو ہم کافروں کے سامنے لائیں گے جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔"

زبان سے ذکر کرنا تو عوام کو معلوم ہے اور دل میں یاد کرنے کو بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن آنکھوں کا ذکر پایا

وجود یدار اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے نہیں سمجھ سکتے، اور یہ بصیرت قلبی ہے، بقول شخصے: ذِكْــرُ الـلِّسَــانِ لَكْلَكَةٌ وَذِكْرُ الْقَلْبِ وَسْوَسَةٌ وَذِكْرُ الرُّوْحِ رَاحَةٌ [1] اور قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر عضو کی عبادت اس کے فعل سے وابستہ ہوتی ہے اور مطابق فرمان ایزدمتعال: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ [2] کے طریقہ اور سنت الٰہی پر عمل ہوا کرتا ہے، جیسے ہاتھوں کی عبادت سخاوت کرنا، جہاد فی سبیل اللہ میں تلوار چلانا اور طاقت کا خرچ کرنا ہوتا ہے، پاؤں کی عبادت سوائے قیام اور چلنے کے اور نہیں ہوتی، اسی طرح کان کی عبادت سننے اور زبان کی عبادت پڑھنے یا بولنے یا ذکر کرنے کے سوا نہیں ہے، اسی طریقہ پر آنکھ کی عبادت سوائے دیکھنے کے محال ہے ...... کہا جاسکتا ہے کہ آنکھوں کی عبادت قرآن مجید کا پڑھنا اور دیکھنا یا قدرت خدا پر نظر کرنا ہے، لیکن اس صورت میں امی یا اندھا اس سے محروم ہوگا اور یہ بعید از انصاف ہے، جو محال ہے، گو معانی بظاہر آنکھ کے عمل پر مبنی ہیں لیکن حقیقت بصارت قلبی سے وابستہ ہے کیونکہ اندھا رہنا بموجب قرآن شریف: لَاتَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ [3] قلب کے اندھا ہونے کے سوا نہیں ہے، اور یہ بالکل عیاں ہے کہ کافر بظاہر اندھے نہیں ہوا کرتے، گو بصارت قلبی بھی انہی بظاہر راستوں کی مقید ہے یعنی اپنے محل پر ہی سے اس کا عمل درآمد ہوا کرتا ہے، لیکن بظاہر آلہ کی محتاج نہیں خواہ وہ بگڑ کر بیکار ہو جائے جیسے کہ اوپر گزر چکا ہے۔

بظاہر آنکھ سے قدرت کا معائنہ بغیر رویت گو کسی قدر عبارت میں داخل ہوسکتا ہے، لیکن حقیقت کے یہ بھی خلاف ہے کیونکہ مومن کی نظر میں خدا کی قدرت کا معائنہ اس کی صنعت پر دلیل ہوتا ہے اور کافر کی نظر میں صرف عجائبات کی ملاحظہ یا اشیاء کی حقیقت یا نشوونما کی ابتدا و انتہا اور بس: كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ:

۱۔ زبان کا ذکر ہے اور دل کا ذکر وسوسہ ہے اور روح کا ذکر راحت ہے۔

۲۔ کہو ہر ایک اپنی شکل پر عمل کرتا ہے۔

۳۔ پس بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن اندھے ہو جاتے ہیں دل جو کہ سینوں کے اندر ہیں۔

"قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ" "کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا مال ہے؟ جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا۔"
[المومنون:٨٤،٨٥]

چونکہ یہاں ذکر سے مراد آنکھ کا مشاہدہ ہے اس لئے یہ معنی درست نہیں ہو سکتے ہیں، جو عوام مومن وکافر میں یکساں پائے جائیں، بظاہر آنکھ کا مشاہدہ موجودات تک محدود ہے لیکن بصارت قلبی جس کا انحصار حجاب کے دور ہونے کے سوا روا نہیں ہے، حقیقت سے وابستہ ہے، جب حجابِ قلب دور ہو جاتے ہیں تو ایسے شخص کی نظر بصارت میں ہر شے کے حجاب کی نفی ہو جاتی ہے اور اس کا مشاہدہ حق پر ہو جاتا ہے، اور موجودات کے وجود کا حجاب اس کی نظر میں نہیں رہتا ہے، جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درجۂ احسان کی تعریف میں فرمایا ہے، درجۂ احسان میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ گویا تو مولیٰ کریم کو دیکھ رہا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ کہ تو جانے کہ بہرحال تجھے مولیٰ کریم دیکھ رہے ہیں، درجۂ اول کا انحصار رویت پر ہے اور درجۂ ثانی کا مدار علم پر، اور علم الیقین کا حصول سماعت سے تعلق رکھتا ہے اور علم رویت بصارت سے، اسی لئے فرمایا ہے کہ "ان کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں تھیں اور وہ (اس لئے کہ) وہ سننے کی قوت نہ رکھتے تھے یا دوسرے معنوں میں وہ سنتے ہی نہ تھے یعنی وہ ہدایت کی طرف آنا نہیں چاہتے تھے، ورنہ کچھ سنتے جانتے۔

"وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ" "اگر اللہ جانتا ان میں نیکی تو ان کو سننے کی توفیق دیتا۔"
[الانفال:٢٣]

حواس خمسہ میں سب سے زیادہ موثر سماعت اور بصارت ہے، انہی کے ذریعہ سے سماعت دماغی اور قلبی ہوتی ہے، کسی علم کا حصول ان دونوں قوتوں کے بغیر نہیں: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ بچپن سے آخر تک اسی سلسلہ سے نیک وبد اور خیر وشر کا وصول ہے، جب بچہ استاد سے الف پڑھتا ہے تو جب تک اسے الف کی شکل (ا) سے عارف نہ کر دیا جائے، رویت الف سے جاہل رہتا ہے، ایسے ہی تمام حروف کا صرف وجود دیکھنے سے علم محال ہے جب تک سماعت سے حرف کا نام قوت حافظہ کے سپرد نہ کیا جائے، اسی لئے پہلے دعوت کیلئے سماعت کارآمد ہوتی ہے لیکن بعد میں حقیقت کا انحصار رویت ہی پر ہے، جیسے اندھا حافظ بن

سکتا ہے، پڑھ بھی سکتا ہے لیکن حروف والفاظ کی شکل سے عارف نہیں ہوسکتا، لیکن جودل کا اندھا ہووہ باوجود آنکھ رکھنے کے اندھا ہے، فرمان ہے:

"وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا، اُولٰٓئِکَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ"

[الاعراف:۱۷۹]

''اور ہم نے بہت سے آدمی اور جن دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں، ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اوران کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اوران کے کان ہیں مگران سے سنتے نہیں، یہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بے راہ، یہ وہی ہیں جوغفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

صاف ظاہر ہے کہ باوجود بظاہر دیکھنے، سننے اور سمجھ رکھنے کے اندھے، بہرے اور بے سمجھ ہیں، یعنی وہ نورایمان جودل میں روشن ہواوراس سے ہدایت پائیں، اس سے دل خالی ہیں، گومنافق عبادت کرے مگراس کی عبادت بےنوراورارادہ باطن اس سے دور ہے، مطابق کلام الٰہی:

"لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى" ''نہیں آتے نماز کومگروہ کاہلی کرتے ہیں۔''

منافق کے علاوہ فاسق بھی اگرچہ شریعت کے حکم سے مومن ہے لیکن وہ بھی اس نور سے بےنصیب ہے جس سے ہدایت یاب ہو:

"وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ"[التوبۃ:۲۴] ''اوراللہ تعالیٰ نہیں ہدایت کرتا فاسقوں کی قوم کو۔''

منافق اور فاسق کا فرق صرف اتنا ہے کہ منافق تصدیق قلبی سے محروم ہے اور فاسق باوجود تصدیق قلبی کے بےنصیب ہے اور باوجود راہ راست پر ہونے کے رجوع سے کاہل ہے اور ہدایت کی طرف نہیں آتا، یعنی جوارح سے احکام خداوندی کی فرماں برداری نہیں کرتا، سعی نہیں کرتا، تو جب تک انسان مولیٰ کریم سے طالب نہ ہو، التجا نہ کرے، وہ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ بھی اس کی پروہ نہیں کرتے ہیں، بلکہ من دون اللہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا ہے، کچھ مانگتا ہے تووہ اعراض کرتا ہے اور بار بار سوال کرنے سے سخت ناراض

ہوتا ہے، رد کرتا ہے، حتیٰ کہ دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے، برعکس اس کے مولیٰ کریم سوال کرنے والے پرخوش ہوتے ہیں، رد نہیں کرتے، حتیٰ کہ بار بار التجا پر زیادہ خوش ہوتے ہیں اور قبول فرماتے ہیں اور نہ مانگنے والے کی صرف یہ نہیں کہ پرواہ نہیں کرتے بلکہ ناراض ہوتے ہیں، چنانچہ فرمایا ہے:

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّىْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا" [الفرقان:۷۷]

''کہہ دو میرے حبیب کہ اگر تم خدا سے التجا نہ کرو تو میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں کرتا تو تم نے تکذیب کی سو اس کی سزا تمہارے لئے لازم ہوگئی۔

منعم حقیقی سے نہ مانگنے میں دو نقصان ہیں: ایک تو دعا عبادت کی ایک قسم ہے، جس سے التجا نہ کرنے والا محروم ہے، دوسرا دین و دنیا اور آخرت میں اس کے سوا کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے، اور وہ ایسا کریم ہے کہ مانگنے والا اس کے دروازہ پر صاحبِ وصول اور عزت والا ہے تو وہ اس نعمت ابدی سے بے نصیب ہو رہا ہے اور یہ اس کی بے توجہی کا ثمرہ اور سزا ہے کہ مالک حقیقی اس کے حال پر عنایت کرنے سے لاپرواہ ہیں، جو سخت گمراہی کا موجب ہے۔

لیکن ''اس نے تکذیب کی اور اس تکذیب کی وجہ سے اس پر سزا لازم ہوگئی۔'' میں عجیب نکتہ ہے، عوام کا قاعدہ اور فاسق کا دستور ہے کہ جب کسی کتاب سے یا کسی واعظ سے کوئی نصیحت سنتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ''جی درست ہے، سب حق اور سچ ہے، ہماری بدنصیبی ہے۔'' یا کہتا ہے کہ ''جی دعا کرو! خداوند کریم مجھے بھی ہدایت دے۔'' لیکن یہ ایسا انکار ہے جو اقرار کے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے، بعض کفار بھی ایسا کہتے کہ اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ہدایت یاب ہو جاتے، اور یہ رب العلمین پر سخت الزام ہے کہ وہ ہدایت نہیں دیتے، کیونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور وہ اس قول میں کاذب ہیں، چنانچہ مولیٰ کریم صاف ارشاد فرما رہے ہیں کہ جو شخص دل سے رجوع کرتا ہے اس کو ہدایت دینا ہمارے ذمہ ہے: يَهْدِىْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۱ یا فرمایا: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۲ دوسری جگہ زیادہ تصریح کے ساتھ فرمایا ہے:

۱۔ راہ دکھاتا ہے طرف اپنی اس شخص کو جو جھکتا ہے۔ ۲۔ یقیناً ہمارے ذمے ہے ہدایت دینا۔

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" [العنکبوت: ۶۹]

''اور جن لوگوں نے محنت کی بیچ راہ ہماری کے البتہ دکھائیں گے ہم ان کو راہ اپنی۔''

جب حضرت آدم علیہ السلام کولغزش کی وجہ سے دنیا میں بھیجا تو فرمایا کہ تم اور تمہاری اولاد ایک مدت معینہ تک اسی جگہ رہا کرو گے، اور ساتھ ہی ارشاد ہوا:

"فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ٥ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى" [طه: ۱۲۳، ۱۲۴]

''پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا، اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی تنگ ہوجائیگی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''

پھر سمجھ نہیں آتی کہ وہ ذات رحیم جو خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ میں نے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اپنے نفس پر رحمت کو لازم کر رکھا ہے تو کیسے ہدایت نہیں دیتے ہیں۔ بوجہ نادانی کے خود ہدایت سے گریز کر کے اپنے پر ظلم کر رہے ہیں۔ مولیٰ کریم مطابق فرمان خود وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا [1] کسی پر ظلم نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ماں باپ سے زیادہ شفیق ہر رفیق سے بڑھ کر رفیق ہمارے وہم وگماں سے وراہماری عقل سے بعید نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: [2]

یار من نزدیک ترا من بہ من ست — ویں عجب تر کہ من ازوے دورم
چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او! — در کنارِ من و من مہجورم [3]

اگر قرآن شریف کونظر عمیق سے دیکھا جائے تو اس منعم حقیقی نے انسان کو عین ہدایت پر پیدا کیا ہے۔

۱۔ نہیں ظلم کرتا رب تیرا کسی پر۔ ۲۔ ہم اس کی طرف اس کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہیں۔
۳۔ میرا یار میرے قریب تر ہے میری اپنی ذات سے بھی، یہ عجیب تر ہے کہ میں اس سے دور ہوں، میں کیا کروں اور کس سے کہوں کہ وہ میرے پہلو میں ہے اور میں ہجر میں مہجور ہوں۔

ہر چیز کو اس کا مسخر کیا ہے اور انسان کو اپنی فرماں برداری کے لئے حکم صادر فرمایا ہے۔لیکن اس فرماں برداری کا پھل اور اطاعت کا مقصود، اس محنت سے حصول اور مراد مولیٰ کریم کی محبت اور عرف ہے، جو عین ہدایت اور ہدایت کا مقصد اور ثمر ہے۔جیسا کہ فرمایا ہے: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ١ چونکہ یہ میدان آزمائش ہے اور نفس کا حجاب ایسی بلا ہے کہ اس سے بچنا اور صراط المستقیم پر چلنا آسان کام نہیں، نفس کا سب حکم ظاہر پر ہے اور ایمان کی سب رویت اور حقیقت يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ ٢ پر ہے۔آج کون ہے جو اسلام کے چہرے اور نورِ ایمانی سے عارف ہو کر انوار اور زینتِ قلب کا بے بہا خزانہ پا سکے؟ جبکہ سراسر خواہشات اور حیات الدنیا کے فریفتہ اسلام اور قوم کی ترقی اور بہبودی کا انحصار مال وجاہِ دنیا ہی پر سمجھ رہے ہیں۔

اور فرمان مولیٰ کریم ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ، اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"

[یونس: ۷، ۸]

"جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع ہی نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی میں مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں۔ان لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے، دوزخ ہے۔"

گو اس کا شانِ نزول کفار کے حق میں ہے لیکن عمل اور حال کی رو سے کافر اور مومن اس میں برابر ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ مومن رب العالمین کے دربار میں حاضر ہونے کی اور اس کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اور کافر نہیں رکھتا، کافر حیات آخرہ اور ملاقات رب العالمین کا منکر ہے اس لئے وہ حیات الدنیا پر راضی اور مطمئن ہے۔اگر مومن باوجود ایمان کا مدعی ہونے کے: رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا ہے تو ایمان اور ایقان کس بات پر ہے؟ جبکہ وہ ذات قدیم حیاتِ دنیا کو کھیل تماشہ اور آخرت کو ہمیشہ کی اصل حیاتی فرما رہے ہیں، اور حسرت کے الفاظ سے غفلت کی نیند سے جگا کر لاعلمی سے مطلع کر رہے ہیں۔کہ

١۔ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔
٢۔ ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے۔

کاش! یہ لوگ جانتے ہوں۔

سو، اے بھائی! جب تک تیرے قدم اس دارِفنا سے اٹھ نہ جائیں اور آخرت یعنی دار بقا کی طرف استقامت نہ پکڑیں، طلبِ حق کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟

دراصل لَایَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا کسی امید پر دال ہے۔ اور قاعدہ کلیہ ہے کہ امید یاب کا ہونا طلب کے سوا محال ہے۔ تو فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ[۱] کا عمل کب ظہور پذیر ہوسکتا ہے؟ اور امیدِ لقافی الدنیا وآخرہ کہاں جب کہ ہم حیات الدنیا پر ہی راضی ہو گئے ہوں۔ اور ہمارے قلب اسی پر ہی مطمئن ہو بیٹھے ہوں؟ آج کون ہے جو اپنے مولیٰ کریم کیلئے بے قرار اور اپنے آپ سے بیزار ہو؟ ہاں! اپنے نفس کیلئے اس مالک پروردگار پر ناراض ہوتے رہتے ہیں:

ہر کہ او از خویشتن بیزار گشت
بیشک او از محرم اسرار گشت

اس مقام حصول پر بیدار اور ہوشیار ہونا چاہیے اور سر پر خاک ڈالنی چاہیے۔ وقت ہوا سے تیز جا رہا ہے۔ نہ معلوم کل کیا ہونے والا۔ یہ قیمتی سرمایہ جو سانس کا سانس بن کر ہاتھ سے جا رہا ہے، واپس نہ آئے گا۔ انسان ایک دن واپس دنیا میں آنے کیلئے تڑپے گا، مگر بے سود، ہرگز نہ آسکے گا۔ تجھے جب قدر معلوم ہوگی، مگر بے حاصل، اُٹھ! آج اپنے کام کی فکر کرتا کہ تجھ پر رحم کیا جائے۔

حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ پر جب جلاد قتل کیلئے ہاتھ چلانے لگا تو آپ کے شاگرد نے جلدی سے نوری رحمۃ اللہ علیہ کو پیچھے ہٹا کر اپنی گردن جلاد کے آگے رکھ دی، پھر نوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ جلاد حیران ہوا اور یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ اس نے دریافت کیا کہ: "یہ کیا ماجرا ہے؟" فرمایا: "دنیا کی ایک گھڑی ہمارے لئے آخرت کے ہزار سال سے بہتر ہے اور ہمارا مذہب ایثار ہے ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دو سانس جو پہلے میرے قتل ہونے کی وجہ سے توقف ہوگا وہ میرے بھائی کے کام آئیں۔"

ہیہات! آج ہم کو اس طرف سے حصہ ہی نہیں، یہ دولت کہاں اور ہم کہاں۔ کافر، منافق اور فاسق

۱۔ پس دوڑو طرف اللہ تعالیٰ کی۔

تو درکنار، مومن اور مسلمانوں کا بھی آج عجیب حال ہے، حقیقت اسلام اور رویتِ ایمان سے جاہل ہو رہے ہیں۔ ایک رسم ورواج کی مانند عمل کا نام دین رکھ لیا ہے، قانونِ اسلام اور تعزیراتِ دین کا علم حاصل ہونے پر مولانا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جبراً وقہراً ادا کر کے مومن اور اجازت کو غنیمت جان کر معصیت اور دنیا ومافیہا کے شیدا، دین کے رنگ میں دنیا کمانے کیلئے مسلم، گویا ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیل رہے ہیں۔ ہم کجا اور دین کا رستہ کجا۔

تو نے نہیں دیکھا، جب گنوار لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا تو اس عزیز الجبار کو طرف سے کیا ارشاد ہوا؟

"قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا،قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْاوَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَاوَلَمَّايَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوااللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَايَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا،اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"

[الحجرات: ۱۴]

" دیہاتیوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے، کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ اسلام لے آئے اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں۔ اور اگر تم خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو گے تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

تو جب وہ اسلام لا چکے اور تسلیم کر چکے تو ضرور کسی تصدیق اور یقین کے بعد ہی کیا ہوگا۔ اور ایمان اور ایقان دو چیز نہیں۔ تو پھر یہ نفی من اللہ کیوں ہوئی؟ اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی ہے کہ جو تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری میں عمل کرو گے تو اس میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی، اور امر مسلمہ ہے کہ کوئی عمل بجز ایمان کے قبول نہیں ہوتا۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو وہ منافق تھے نہ کافر اور فاسق، بلکہ مسلمان تھے۔ لیکن ابھی مومن نہ تھے۔ جیسا کہ فرمایا ہے کہ ہنوز تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْابِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْاوَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ"

[الحجرات:15]

''مومن تو وہ ہیں جوخدااوراس کے رسول پرایمان لائے پھر کچھ شک نہ کیااورخدا کی راہ میں مال وجان سے مجاہدہ کیا۔یہی لوگ صادق ہیں۔''

اکثرمفسرین اس پر ہیں کہ وہ منافق تھے اورابھی ان کے دلوں میں تصدیق نہ تھی۔صرف زبانی اقرارکرنے والوں میں سے تھے۔لیکن یہ خلاف حقیقت ہے۔کیونکہ حکم ہورہاہے کہ اے میرے حبیب!ان سے کہوکہ تم خداکواپنی دینداری جتاتے ہو؟ نیزفرمایاکہ یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوگئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ اپنی مسلمانی کا احسان مجھ پرنہ رکھوایسانہیں ہے:

"بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ"

[الحجرات:11]

''بلکہ خداتم پراحسان رکھتاہے کہ تم کوایمان کارستہ دکھایا،بشرطیکہ تم سچے ہو۔''

یہ امرمسلمہ ہے کہ ہدایت من اللہ ہے اوراس کواپنے کسب یامجاہدہ کے روسے جاننا سخت خطااورکذب ہے اس لئے فرمایاکہ اگرتم اپنے حال میں صادق ہوتو اللہ کا احسان مانوجس نے تمہیں ہدایت کا راستہ دکھادیا،نہ کہ الٹا احسان خداپررکھو۔یہ آیت نہ ایمان کی نفی کرتی ہے نہ اسلام کی۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:"یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" اے ایمان والو!ایمان لاؤجس طرح حق ہےایمان لانے کا اللہ اوراس کے رسول پر،یہ اسی طرح ہے جیسے فرمایا:"یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااُدْخُلُوْافِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" کہ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ۔مدارج ایمان میں ہرچندفرق ہے۔جیسے حدیث شریف میں درجۂ احسان میں بیان فرمایاہے:"اَنْ تَعْبُدَااللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَــــرَاکَ" یعنی تواس مالک حقیقی کی عبادت میں ایسامحوومستغرق ہوکہ واقعی تواس کودیکھ رہاہے۔یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے اورکم درجہ یہ ہے کہ تیرے دل کا دھیان اس درجہ تک ہوکہ وہ مالک تجھے دیکھ رہاہے اورتیرے دل کے بھیدوں کا علیم ہے۔

یقین کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ علم الیقین ہے، دوسرا عین القین اور تیسرا حق القین ہے۔ مثلاً ایک گھڑا جس میں پانی بھرا ہو، اور اس کا بظاہر (بیرونی حصہ) ترنظر آتا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ اس میں پانی ہے۔ لیکن یہ کہنا علم الیقین ہے، کیونکہ تراوت کی وجہ سے گمان اغلب ہے کہ اس میں ضرور پانی ہے۔ اس کو علم اصول میں نسبت کہنا بجا و درست ہے۔ لیکن جب چپنی اٹھا کر دیکھ لیا کہ یہ پانی اس میں موجود ہے تو یہ عین الیقن یا حکم ہوگیا۔ کیونکہ پانی کی موجودگی میں کوئی شک وشبہہ نہ رہا۔ لیکن ابھی اس کے ذائقہ (تلخ وشیریں) کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی۔ اور جب اٹھا کر پی لیا تو حقیقت کھل گئی۔ بلکہ واحد ہوگئی۔ اور یہ حق الیقین ہے۔ تو جب رویت ہو جاتی ہے گمان نہیں رہتا: ''اِنَّ الظَّنَّ لَایُغْنِیْ مِنَ الْحِقِّ شَیْئًا'' یعنی ظن یقین کے بعد کچھ کام نہیں دیتا۔

حضرت علی جرجانی قدس سرہٗ کا قول کیا ہی عجیب ہے، فرماتے ہیں کہ ''خدا کا گمان اس کے بھید سے باہر نہیں ہوتا۔ مگر خدا کے جلال یا جمال کی رویت سے باہر ہے۔ کیونکہ اس کے اظہار میں بالکل خدا کو دیکھتا ہے اور گمان فانی ہوتا ہے۔'' تو صاف ظاہر ہے کہ جب رویت ہوتی ہے، گمان نہیں رہتا۔ اور یہ نور ایمانی دل میں داخل ہونے کے سوا نہیں ہے اور یہ عین خطرات قلب ہیں جن کا سرمایہ عین محبت الٰہی ہے۔

مردان راہ حق میں سے ایک بزرگ کسی جگہ بیٹھے اپنے مولیٰ کریم سے مناجات کرر ہے تھے۔ کوئی شخص پیچھے سے آیا اور سلام کیا۔ آپ چپ ہو گئے اور سلام کا جواب دیا۔ اس نے دریافت کیا: ''آپ یہاں اکیلے بیٹھے ہیں؟'' ''تیرے آنے سے اکیلا ہو گیا ہوں۔'' وہ شخص بولا: ''مجھے تو آپ کے روبرو سوائے چند پتھروں کے کچھ نظر نہیں آتا۔'' فرمایا: ''او جاہل! میں اپنے دل کے خطرات دیکھ رہا تھا۔'' سبحان اللہ وبحمدہ! باوجود عارف یعنی مومن ہونے کے اپنے حال سے علم بھی رکھنے والے تھے۔ پس اسی لئے رویت حاصل ہوتی ہے اور یہ فکر کی ہمیشگی اور محبت کے غلبہ کے سوا نہیں ہے۔ اور جب تک دنیا و مافیھا سے اعراض اور حب الشہوات یعنی تمام مائل کی گئی چیزوں کی طرف سے دل کا انقطاع نہ ہو، یہ معنی ظاہر ہونے محال ہیں۔

آج جبکہ ظلمات کی گھٹائیں سمائے اوج پر چھا رہی ہوں اور نفی مثبت کے فلسفہ سے چمک کر گونج رہی ہوں، اور ایسی تاریکی کو نئی روشنی سے نامزد کرنے والا دانا اور عقلمند اپنے زعم اور خیال باطل میں مستغرق،

دین الحق کیلئے مُسْتَھْزِؤُوْنَ طول امل کے میدان میں خواہشات کے ٹٹو پرسوار ہو کر ھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کی تصدیق کر رہے ہوں تو آفتاب معرفت کی کرنیں ان کیلئے کب صراط المستقیم پر جلوہ فگن ہو سکتی ہیں جس سے علم حق اور مشاہدہ سے رویت اور حقیقت سے حق الیقین حاصل ہو؟ اسی وجہ سے

معرفت الٰہی

میں سخت اختلاف ہورہا ہے، اور انسان پر اس سے زیادہ اور سخت مشکل کسی امر میں واقع نہیں ہوتی ہے۔

اسلام میں ایک گروہ اس بات پر ہے، کہ دیدار الٰہی دنیا میں ہونا روا نہیں ہے، لیکن آخرت میں قیامت کے دن ضرور ہوگا، اور دوسرا گروہ قیامت کے دن بھی عرف ومشاہدہ ہونے سے منکر ہے، اور وہ اس دلیل پر ہیں کہ جب قرآن شریف میں صاف بیان ہے کہ:

"لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُوَھُوَیُدْرِکُ الْاَبْصَارَوَھُوَاللَّطِیْفُ الْخَبِیْرَ" [الانعام:۱۰۳]

"نہیں ادراک کرسکتیں اس کا نگاہیں اور وہ ادراک کرتا ہے سب نگاہوں کا، اور وہ باریک بین ہے خبر رکھنے والا۔"

تو پھر دیدار اور مشاہدہ کیسے روا ہوسکتا ہے؟ بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے پروردگار سے سوال کیا:

"رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْاِلَیْکَ" [الاعراف:۱۴۳]

"اے میرے پروردگار! تو مجھے خود کو دکھا کہ میں تجھ پر نظر کروں۔"

تو جواب ملا:

"لَنْ تَرَانِیْ"[الاعراف:۱۴۳] "تو مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتا۔"

یہ مسلم امر ہے کہ پیغمبر اولوا العزم سب ہستیوں سے برگزیدہ اور بنی آدم میں سے افضل ترین اور خداوند کریم کی معرفت میں سب سے زیادہ عارف ہیں، تو جب ان کو یہ جواب ملا کہ ہرگز نہ دیکھ سکو گے: تو عام مومن کا مولیٰ کریم کو دیکھنا کس طرح ممکن اور روا ہوسکتا ہے؟

اے بھائی! (خداوند کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے) لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ سے مراد ادراک اور احاطہ ہے، جو واقعی ناممکن اور محال ہے، کیونکہ چگونگی ذات باری تعالیٰ میں حرام ہے اور جان کہ کوئی چیز جب دوسری چیز پر محیط ہو تو وہ دوسری شے محیط پر احاطہ نہیں کر سکتی، مثلاً ہوا ہر چیز پر محیط ہے تو یہ محال ہے کہ کوئی شے اس پر محیط ہو سکے، تو بھلا اس خالق کون و مکان، بے مثل و بے نشان کی کنہ یا اس ذات بے نہایت کا ادراک اور احاطہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے، جو خود بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ہے، اور یہ بھی سمجھنے کے لیے، ورنہ اس باری تعالیٰ کا عرف کس سے اور کس چیز سے جبکہ ہر چیز کی ہستی اور قدرت اسی مالک الملک سے ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ. یعنی میں نے اپنے رب کو رب ہی سے پہچانا ہے، یعنی اسی کے نور سے ہی عرف ہوا ہے،

اس میں تو کلام نہیں کہ یہ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، اور نہ ہی دیکھ سکیں گی، اور یہی ان صاحبان کی غلطی کا اصل اور سبب ہے، کیونکہ اگر یہ آنکھ مولیٰ کریم کے مشاہدہ اور دیدار الٰہی کا محل ہوسکتی تو ضرور تھا کہ سب آنکھ والے دیکھ سکتے اور ظاہر میں عارف ہوتے، اور یہ محال ہے۔

اے بھائی! سمجھ، جب آفتاب دنیا کسی سخت آندھی یا کالی گھٹا میں ایسا چھپ جاتا ہے کہ بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے، تو یہ آلہ بصارت یعنی آنکھ صحیح و سالم، تندرست بغیر کسی نقص کے اندھی ہو جاتی ہے، یعنی جب تک آفتاب کی روشنی اس ضیا نہ بخشے یہ آفتاب وغیرہ کو نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح جب تک آفتاب معرفت قلب پر جلوہ فگن نہ ہو اور اس کے نور سے آنکھ روشن نہ ہو چشم بصیرت کو عرف کیسے ہوسکتا ہے؟

چو تو پنہا شوی ازمن ہمہ تاریکی و کفرم
چو تو پیدا شوی برمن مسلمانم بجانِ تو

اُوپر گزر چکا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی، جس کو واضح کرنے کے لیے تصریح فرمائی ہے: فَاِنَّھَا لَاتَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ، یعنی جو یہاں اندھا ہے وہی آخرت میں اندھا ہوگا، اور یقیناً یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن جو دل سینوں کے اندر ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں، تو یہ بینائی اور اعمیت سب قلب سے وابستہ ہے نہ بظاہر، کافروں کے حق

میں ارشاد ہو رہا ہے کہ دوزخ ان کے سامنے ہم اس سبب سے لائیں گے کہ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَاءٍ عَنْ ذِکْرِیْ ان کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں تھیں، اور آنکھوں کی یاد سوائے دیکھنے کے محال ہے، جیسے زبان کا ذکر بولنے سے اور کان کا سننے سے، تو جب کفار کے لیے آنکھ کا پردہ یاد الٰہی سے جو مشاہدہ اور دیدار کے سوا نہیں ہوسکتا، روا ہے تو ضرور مومن کے لیے آنکھ سے دیکھنا روا ہے، اور نور معرفت سے مومن دیکھنے والا ہے، جیسا کہ فرمایا:

"اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ"

[الزمر: ۲۲]

"بھلا جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے (دین) اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور اپنے پروردگار سے روشنی پر ہے (تو کیا وہ سخت دل کافر کی طرح ہوسکتا ہے؟) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔"

رہا سوال حضرت کلیم اللہ علیہ الصلوۃ والسلام رَبِّ اَرِنِیْ تو اس سے ان کا مطلب کما حقہ، دیکھنا تھا، جس کے جواب میں لن ترانی کا ارشاد ہوا، کیونکہ یہ ناممکن ہے، ورنہ نبوت کی پہلی ہی رات جب جنگل میں روشنی دیکھی اور آگ سمجھ کر رستہ معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے وادی مقدس میں پہنچے تو پروردگار عالم نے فرمایا اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ، یعنی بیشک یہ تو میں اللہ ہوں، تو یہ عین حضور تھا اور رویت ظاہر، کیونکہ مومن یا ولی بھید میں جاتا ہے، جو کچھ پاتا ہے سِر میں پاتا ہے اور نبی جو کچھ پاتا ہے ظاہر میں پاتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ید بیضا اور عصا وغیرہ جو کچھ پایا ظاہر میں پایا، اور سب کو دکھا دیا، اور وہ اس لیے کہ نبی اپنی نبوت کا مدعی ہوتا ہے اور دعویٰ اس کے لیے لازم، برعکس اس کے ولی کے لیے دعویٰ کی کوئی صورت درست نہیں ہوتی، اسکے لیے اخفا ہی بہتر اور اولیٰ ہوتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ نبی کے واسطہ اس بظاہر آنکھ سے دیدار و رویت مولیٰ کریم روا ہے، لیکن اب لن ترانی (تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا) ایسا اشکال ہے کہ یہ سب معنی فوت ہوئے جاتے ہیں، اور وہ اس لیے کہ ہمیں نبی و مرسل کے حال سے کچھ حصہ نہیں، بلکہ نبی تو درکنار،

ہم کو ولی کے حال سے مطلع ہونا محال ہے، اور ایسا ہی ولی کے لیے نبی کے حال سے، تو جب نبی ولی کے حال سے جاہل ہو جاتا ہے، تو ہم تو اس ترازو کے پاسنگ بھی نہیں، رہا دلیل وقال سے، تو وہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سوال چگونگی ذات باری تعالیٰ پر تھی جس کے لیے لن ترانی کا جواب ملا، ورنہ تجلی تو اس وقت بھی ہوئی، فرمان مولیٰ کریم:

"فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا" [الاعراف:۱۴۳]

"پھر جب تجلی کی رب اس کے نے طرف پہاڑ کیا اس کو ریزہ ریزہ اور گر پڑے موسیٰ علیہ السلام بے ہوش۔"

اس لیے تجلیات، مشاہدہ، دیدار، یہ سب روا بلکہ مقصود ہے، اور چگونگی یا کما حقہ، محال، اور یہ ہو بھی کیسے؟ جب اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے، تو سب ہستی اور نور من اللہ ہے، تو پھر حباب دریا کو کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ اور ذرہ آفتاب کو کیا پا سکتا ہے؟

حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ وصول خداوند تعالیٰ کا وصول ایسا نہیں ہے جیسا جسم کا وصول جسم سے ہوتا ہے، یا جوہر کا عرض سے، یا علم کا معلوم سے، یا عقل کا معقول سے، یا شے کا شے سے، تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذَالِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔[1]

اسی طرح دیدارِ الٰہی بھی کسی دیدار کی مانند نہیں ہے نہ ہی یہاں ادراک اور احاطہ کو کوئی دخل ہے، جو شخص حدث سے قدم کا فرق نہیں جانتا اس کا سمجھنا نہایت مشکل بلکہ اسے صاحب عرف کو سمجھانا بھی دشوار ہے، مشاہدہ اور دیدار یہ جو کچھ بھی ہے، حال کے تغیر اور حجاب کے دور ہونے کے سوا نہیں ہے:

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

اور یہ حال ہے جو تحریر وقال سے باہر ہے، اور یہ ایک حیاتی ہے، جو باطن سے وابستہ ہے، اور یہ وہ علم ہے جس کے لیے کوئی حرف نہیں، لیکن جو شخص یہ علم نہ رکھتا ہو وہ سب علموں سے جاہل ہوتا ہے، اور عارف

۱۔ بلند ہے اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند بہت بڑا۔

خواہ ظاہری علم سے ایک لفظ بھی نہ پڑھا ہو سب علموں سے عالم ہوتا ہے جو شخص اس حیاتی سے محروم، خواہ بظاہر زندہ نظر آتا ہو، عنداللہ وہ مردہ ہے، جیسا کہ فرمایا لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی، (تم مردے کو نہیں سنا سکتے) اور جو زندہ ہے وہ مر کر یعنی عالم برزخ یا آخرت کی طرف منتقل ہو کر بھی زندہ ہے، اور جو مردہ ہے حیات الدنیا میں بھی مردہ ہے اور یہ زندگی حیات الآخرہ ہے نہ کہ دنیا، اور یہ بصارت وسماعت حیاتِ اُخروی ہے۔

زندہ اور مردہ

"وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ، وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ، وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ، وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ، اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ، وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ" [الفاطر: ۱۹ تا ۲۲]

"اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں، اور نہ اندھیرا اور روشنی، اور نہ سایہ اور دھوپ، اور نہ زندے اور مردے برابر ہو سکتے ہیں، خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے، اور جو لوگ قبروں میں ہیں تم ان کو نہیں سنا سکتے۔"

شاید بلکہ اغلب اُمید ہے کہ بعض کوتاہ اندیش اس کے معنی قبرستان والے مردے ہی سمجھیں گے، لیکن یہ سخت جہالت اور کوتاہ فہمی ہے، کیونکہ یہ سماعت تو تبلیغ دین واسلام ہے، جو زندہ کے لیے ہے، اصحاب القبور مُردہ کے لیے نہیں بلکہ اصحاب القبور دنیوی زندگی میں چلتے پھرتے مُردے مراد ہیں، جو قرآن شریف سے ثابت ہے:

"اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ، لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" [یس: ۶۹، ۷۰]

"یہ تو نصیحت اور قرآن صاف ہے تاکہ اس شخص کو ڈرایا جائے جو زندہ ہو اور کافروں پر بات پوری ہو جائے۔"

جیسے فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (ڈر جانے والوں کے لیے ہدایت ہے) تو جب متقی زندہ ہے تو کافر مردہ ہے اور اس قبر کی حقیقت کو اپنے فضل وکرم کے رو سے مومنین کے لیے واضح طور پر اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرما رہے ہیں:

"وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ"

[یٰس:۹]

''اور کی ہم نے آگے ان کے سے ایک دیوار اور پیچھے ان کے سے ایک دیوار پس ڈھانکا ہم نے ان کو پس وہ نہیں دیکھتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمان ہو رہا ہے:

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

[الانعام:۱۲۲]

''بھلا جو شخص پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور اس کے لیے روشنی کر دی کہ وہ اس کے ذریعے سے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے، اسی طرح جو کافر عمل کر رہے ہیں وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔''

ظاہر کے مقید اس حیات اور موت سے بھی پیدائش اور بطن مادر ہی مراد لیں گے، لیکن اس کورچشمی کے لیے كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا کحل کافی ہے جس سے حجاب بصارت رفع ہو کر اشکال دفع ہو جائے گا کہ یہ کافر اپنے عملوں کی وجہ سے مردہ ہے، اور اس کو ظاہری حیاتی جو سراسر موت، اور حیات اخروی جو سراسر حیاتی ہے، الٹی نظر آ رہی ہیں محققین کے نزدیک یہ موت خواہش کے سبب سے ہے اور حیات محبت الٰہی کے باعث سے، یہ موت محرومی کے سبب سے ہے اور حیات معرفت کے باعث سے۔

حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج صاحب لاہوری قدس سرہ نے کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ معرفت کے سبب سے جو حیات ہوتی ہے وہ اور ہے اور حیات بشریت اور، اہل عالم حیات بشریت سے زندہ ہیں اور اولیاء حیات معرفت سے، ایک دن ہوگا کہ حیات بشریت ختم ہو جائے گی، كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ، اور حیات معرفت ہرگز ختم نہ ہوگی، فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً، اور یہی مضمون ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ حَيٌّ فِي الدَّارَيْنِ

نمیرد ہر کرا جانش تو باشی خوشا جانے کہ جانانش تو باشی

شاہ کرمانی قدس سرہ نے یہ آیت اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًافَاَحْیَیْنٰهُ الایة پڑھی تو فرمایا کہ اس حیات کی تین علامتیں ہیں، خلق سے عزلت، حق تعالیٰ کے ساتھ خلوت اور زبان و دل سے ذکر پر ہمیشگی کرنا۔

دررُوی خلائق در صحبت مکشای ے باش بکلی متوجہ بخدای

غافل مشواز ذوق دل و ذکر زبان تازندہ جاوید شوی در دو سرئ

لیکن اس موت سے یہ سمجھ لینا کہ مردہ مثل جماد ہے، سراسر غلط ہے، ایسا مردہ تو کافر بھی نہیں ہوسکتا، یہ موت حجاب اور حجاب کا سخت عذاب ہے۔

کَلَّااِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍلَّمَحْجُوْبُوْنَ [المطففین:۱۵] ''یقیناً وہ اپنے رب سے دن حجاب میں ہوں گے۔''

اس دن اس ہزار موت سے بھی یہ حجاب سخت ہوگا، بلکہ قرآن شریف میں ہے کہ کافر اس دن اپنے تنگ مقام کو دیکھیں گے تو موت کو پکاریں گے تو جواب ملے گا کہ:

''لَاتَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًاوَّاحِدًاوَّادْعُوْا ثُبُوْرًا کَثِیْرًا''[الفرقان:۱۴] ''تم آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو۔''

مثل جماد مرجانے کے لیے کافر التجا کرے گا اور اس حیات اخروی سے جس پر ایمان نہ رکھتا تھا، سخت بیزار اور بے قرار ہوکر کہے گا:

''یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا''[النساء:۴۰] ''کاش! میں مٹی ہو جاتا۔''

مگر کہاں، کیونکہ یہ زندگی انسان کبھی فنا ہونے والی نہیں، اور نہ ہی ہوگی، حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ فنا اور بقا کے بیان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

بقا بقا بقا، جیسا تھا، ویسا ہی ہے، اور ویسا ہی رہے گا، اَلْاٰنَ کَمَاکَانَ ، تو یہ اس باری تعالیٰ لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال، ذوالجلال والاکرام کی شان ہے۔

فنا بقا فنا، جو پہلے نہ تھا، اب ہے، اور پھر نہ رہے گا، کیا یہ بھی حدث کی طرح ہے؟ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ دنیا و آخرت میں نعمت و عذاب کے رو سے جو کچھ بھی ہے سب انسان کے لیے ہے اس لیے اس

کی ہستی حدث کی طرح نہیں ہے جس کا اول وآخر فانی ہوں، کیونکہ یہ اس دار فنا میں آیا، اوراس حدث سے پہلے بھی تھا، اور باقی رہے گا، فرمان مولیٰ کریم ہے:

"هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" [الدھر: ۱]

"بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر نہ تھا۔"

لفظ علیٰ کا اطلاق انسان پر ہے، کہ یہ تھا تو سہی لیکن ذکر کے قابل نہ تھا، کیونکہ ذکر تو خارجی وجود سے شروع ہوا، اس سے پہلے ذکر ہوتا تو کس طرح؟ کیونکہ نہ ذہنی وجود رکھتا تھا نہ لفظی، تو پھر خارجی وجود اور ذکر کہاں کا؟ ذکر تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا، یعنی جب انسان کو پتلا خاکی یا دوسرے لفظوں میں خالق کون ومکان خلقت کے وجود میں لائے تو ذکر شروع ہوا، اس سے پہلے نہ ذکر تھا اور نہ ہی یہ ذکر کے قابل۔

ذخیرۃ الملوک میں بیان ہے کہ انسان پر چھ منزلیں گزرتی ہیں (۱) عالم ارواح سے پشتِ پدر (۲) بطنِ مادر (۳) میدانِ دنیا (۴) لحدِ قبر (۵) میدانِ قیامت (۶) بہشت یا دوزخ، لیکن اس کو ماقبل حیات الدنیا والآخرہ کا علم اسی وجود میں آنے سے معلوم ہوا، وہ بھی عقلی اور نقلی وجہ سے، ورنہ حالی علم سے اس کو سوائے حال کے کچھ علم نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے قرآن مبین میں ہے:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" [الحدید: ۸]

"اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ خدا پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ پیغمبر (خدا) تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، اور اگر تم کو باور ہو تو وہ تم سے اس بارے میں عہد بھی لے چکا ہے۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس وجود یعنی حدث میں آنے سے پہلے بھی تھا جس کا اس کو علم میں تھا اب کلام الٰہی سے معلوم ہوا، ورنہ کہاں کا عہد واقرار اور کیسا یقین وعلم، (ہاں علم اور حال انبیائے کرام اس برزخ میں کلام الٰہی سے ثابت ہے) تو مولیٰ کریم نے اس کو اس وجود میں ظہور تام اور علم کل کے لیے نازل کیا ہے، حدیث شریف میں ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ، تو یہ عرف اور علم انسان کے

لیے نہایت ضروری بلکہ فرض ہے کیونکہ جو اپنے سے جاہل ہوتا ہے وہ غیر سے زیادہ اجہل ہوتا ہے لیکن ایک جہان اس علم سے جاہل ہے نہیں جانتے کہ ہم کون ہے، کہاں سے آئے ہیں اور اب کس جگہ ہیں، اور کہاں جا رہے ہیں، دنیا و ما فیہا کے شیدائی اسی محبت میں سرشار:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِمِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِوَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ،ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"

[آل عمران: ۱۴]

''لوگوں کو ان کی خواہشات کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونا اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی مزے دار معلوم ہوتی ہے مگر یہ سب دنیا کی زندگی کے سامان ہیں۔''

دنیا کی حیاتی کے دیوانے، اور وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (اور خدا کے پاس اچھا ٹھکانا ہے) کی سی نعمت سے اندھے اور اخروی حیات سے مردہ ہو رہے ہیں، علم و عرف کہاں کا؟ وقت ہاتھ سے جا رہا ہے، اور میعادِ حیاتی ختم ہوئی جا رہی ہے، تب آنکھ کھلے گی جب موت آ گھیرے گی، جیسے ارشاد مولیٰ کریم:

"كَلَّابَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَوَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ،اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌوَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍبَاسِرَةٌ،تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَافَاقِرَةٌ كَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ، وَقِيْلَ مَنْ سكتہ رَاقٍ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ، وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ"

[القیمة: ۲۰ تا ۳۰]

''ہرگز نہیں یوں بلکہ دوست رکھتے ہو تم جلدی کو اور چھوڑ دیتے ہو آخرت کو، کتنے منہ اس دن تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کی دیکھنے والے ہیں، اور کتنے منہ اس دن برے ہیں گمان کرتے ہیں یہ کہ کی جاوے گی ان سے کمر توڑنے والی معاملت، ہرگز نہیں یوں جس وقت پہنچتی ہے جان ہانس کو اور کہا جاوے کون ہے جھاڑے پھونکنے والا اور جانا اس نے کہ یہ ہے جدائی، اور لپٹ جاوے گی ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے طرف پروردگار اپنے کی ہے اس دن چلنا۔''

☆☆☆

باب سوم

عالمِ برزخ

کیفیات برزخ فی الدنیا

تو یہ چلنا اور جانا جسم کے سوا ہے، اور اگر جسم ہے، تو ایسا جو نظر نہیں آتا ہے، ہاں! بندگانِ خدا کے ارشادات مبارکہ سے ثابت ہے کہ ہم نے اپنا دوسرا وجود دیکھا، چنانچہ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''مراقبہ میں چند بار ہم نے دیکھا کہ ایک مجسم صحیح وسالم ہو بہو میرے سامنے آ کھڑا ہوا، اور وہ میں خود تھا۔'' زیادہ طوالت ووضاحت یہاں رائیگاں ہے یہ حال ہے، کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے؟ تب پتہ لگے جب حال کھلے، صرف اتنا سمجھ کے لیے ہوسکتا ہے، کہ خواب ہر ایک انسان دیکھتا ہے بدن بالکل بے حس وحرکت مردہ کی مانند پڑا ہے اور دوسرا وجود کہیں کا کہیں کام کرتا پھرتا ہے، اور یہ عوام کا حال ہے، چونکہ رُوح بدن کی طرف سے غیر متوجہ ہو کر دوسرے وجود وطن کی طرف راغب ہوتی ہے اور یہ بدن سو جاتا ہے، صرف نیند کے غلبہ سے بے ہوش کی مانند ہو جاتا ہے، مولیٰ کریم نے اس حالت کو بھی اپنے کلام پاک میں موت فرمایا ہے، اور یہ عارضی موت ہے حقیقی موت اس سے قوی ہے، کیونکہ موت کے بعد اس وجود کی محافظت بھی ترک ہو جاتی ہے، گویا لباس کی طرح انسان اس وجود سے باہر ہو گیا، یا سانپ کی طرح کنچلی اتار کر چلا گیا، لیکن یہ مثال اس حال سے پوری نہیں اتر سکتی، اسی لیے اولیاء کرام کا حال عالم

برزخ کی طرح ہو جاتا ہے اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا [۱] کے مصداق ہو جاتے ہیں۔

حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ کو جب دار پر کھینچنے لگے تو ان کا ایک بازو کاٹ دیا، آپ نے فرمایا تب جانوں جو دوسرا بازو بھی کاٹو، دوسرا کاٹا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے، اور فرمایا کہ میرے تو دونوں بازو صحیح وسلامت ہیں۔

حضرت غوث علی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دو مجذوب تھے کسی شریر نے ان کی رانوں پر انگارے رکھ دیئے، ایک کی تو جل گئیں، اور دوسرے کی رانوں پر آگ کا اثر تک نہ تھا، کسی نے سوال کیا کہ ان میں کا اعلیٰ کون تھا؟ تو آپ نے فرمایا ایک ابھی بظاہر وجود کی حفاظت پر تھا، اور دوسرا اس سے مبرا اور وہی زیادہ صاحب حال اور صاحب مدارج ہے۔

برزخ فی الآخرہ:

یہ وجود بطن قرآن کریم اور حدیث شریف کے حکم سے ثابت ہے، اور قرینِ عقل ہے کہ اگر اسی وجود ہی سے حیاتی اور حساب اور ثواب وعذاب ہو تو جل کر راکھ ہونے والا اور دریا میں غرق ہونے والا، مگر مچھ اور مچھلیوں کی غذا بننے والا وجود مستثنیٰ ہونا چاہیے اور یہ محال ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

"اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ" [الحج:۷] ''یہ کہ اللہ اُٹھائے گا اُن لوگوں کو کہ بیچ قبروں کے ہیں۔''

تو جب کہ سب لوگ قبروں میں دفنائے ہی نہیں جاتے بلکہ اکثر جلائے جاتے ہیں تو پھر یہ سب یعنی کل آدمی قبروں سے کیسے اُٹھائے جائے گے؟ اور یہ لازمی امر ہے کہ بنی نوع انسان سب کے سب عالم برزخ کی طرف مقیم ہوں گے اور قیامت کے دن اُٹھائے جائیں گے، اس لیے اس سے مراد عالم برزخ ہے، گو قیامت کے دن ہر ایک انسان اسی موجودہ اور ظاہری وجود کے ساتھ اُٹھایا جائے گا، اور اسی سے حساب لیا جائے گا، اور قبر میں عذاب اور ثواب جنت اور دوزخ کی طرف سے کھڑکی کھلی رہے گی، اس کی

۱۔ مر جاؤ تم پہلے اس سے کہ مرو تم۔

تفصیل میں بہت طول ہے اور میرا مقصود انسان فی القرآن محض ہے، اس لیے اب پھر مقصود کی طرف ہی لوٹ جاتا ہوں، تاکہ اصل معیار سے مخالف سمت پیدا نہ ہونے پائے۔

جب جنگ بدر کے دن کفار کی نعشوں کو جُب میں ڈالا گیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا ''جو وعدہ رب العالمین نے ہم سے کیا تھا وہ ہم نے پورا پالیا ہے کیا تم سے جو وعدہ ہوا تھا تم نے بھی پورا پایا ہے یا نہیں؟'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو بے جان دھڑ اور مردے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''تم اُن سے زیادہ سننے والے نہیں ہو''

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کافر ہو یا مسلم، موت کے بعد یعنی اس وجود سے منتقل ہونے کے بعد بھی زندہ اور مثل ہمارے سنتے دیکھتے ہیں، بلکہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہیں، صرف فرق یہ ہے کہ حیات الدنیا سے انتقال کر کے یعنی میدانِ دنیا سے گزر کر عالم برزخ میں مقیم ہو گئے ہیں، کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :

"وَمِن وَّرَآئِهِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ" ''اور درے ان سے ایک پردہ ہے اس دن تک کہ وہ اُٹھائے جائیں گے۔''

[المومنون: ۱۰۰]

اور قیامت تک عالم برزخ میں ہی رہیں گے، اس روز یعنی یَـوۡمَ الۡـقِیَـامَة کو اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے، انسان کے لیے یہ ایک منزل اور ایک معیار ہے جو کہ اس وجود سے جدا ہو کر یوم القیامة تک مقرر ہے، کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :

"هُوَالَّـذِیۡ خَـلَقَکُمۡ مِنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلاً وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَهٗ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ" ''وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کی اجل، اور ایک اجل مقرر کی ہوئی ہے نزدیک اس کے، پھر تم شک کرتے ہو۔''

[الانعام: ۲]

دراصل یہ بھی ایک عالم دنیا ہی کا حصہ ہے، محض اہل دنیا اور موتی کے درمیان ایک برزخ یعنی آڑ ہے کہ آپس میں مل جل نہیں سکتے ہیں سوائے ان صاحبان کے جن کا حال دنیا میں برزخ کی مانند ہو، ان کے لیے یہ برزخ یعنی پردہ اُٹھ جاتا ہے، وہ آپس میں بات چیت، ملاقات، بلکہ مدد حاصل کرتے ہیں، لیکن یہ حالت وجود کے حجاب کے دور ہونے کے سوا نہیں ہو سکتی جو محض بتوفیق الٰہی عزوجل مجاہدات

اور فضل ایز دمتعال لم یزل ولایزل سے وابستہ ہے۔

گر نیفتادم ندیدم کعبہ مقصود را
درمیانِ ما ہمیں استادگی دیوار بود

لیکن انبیاے کرام روز ازل سے اس وجود کی آفت سے مبرا اور مستثنیٰ ہیں، جیسا کہ فرمان ایزد متعال وَاِذْاَخَذَاللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ کے تحت میں اوپر بیان ہو چکا ہے اس لیے دوبارہ تحریر کرنا لایعنی ہے ہاں صرف اتنا کہ برزخ دووجہ پر ہے، ایک میدان دنیا سے قبل روحانیت میں جس پر کلام اللہ کی شہادت کافی ہے، اور دوسرا بعد از موت جس کا ثبوت نص قطعی سے ثابت ہو چکا ہے، برادران اسلام میں سے ایک گروہ اس برزخ پر عجیب طرح کا ایمان رکھنے والے ہیں، باوجود اس امر کے کہ فرقان حمید میں بیان ہو رہا ہے:

"اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَاوَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَافَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ"

[الزمر: ۴۲]

"اللہ قبض کر لیتا ہے جانوں کو نزدیک موت ان کی کے اور جو نہیں مرے قبض کر لیتا ہے ان کو بیچ نیند ان کی کے پس بند کر رکھتا ہے جن کو کہ مقرر کی ہے اوپر ان کے موت، اور بھیج دیتا ہے اور دن کو ایک وقت مقرر تک، تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے اس قوم کے کہ فکر کرتے ہیں۔"

قبض روح یعنی موت (نیند) جس کو موت صغیر سے تعبیر کرنا روا اور درست ہے، ہر ایک شخص (خصوصاً مومن) اس سے حالی طور پر عارف ہونے کے باوجود جو اس کے عنصری وجود اور روحانیت کے درمیان برزخ ہے، یہ گروہ اس کا انکار کرنے والا ہوتا ہے، اور کم فہمی و جہالت کی وجہ سے عوام الناس تو درکنار انبیائے کرام کی نسبت بھی ایسا اعتقاد رکھنا سعادت مندی خیال کرتے ہیں کہ وہ مر کر مٹی ہو گئے ہیں، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِکَ اور اس کو اثبات التوحید سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ اس گروہ کے نزدیک خداوند کریم ذوالجلال والاکرام کے سوا حیات ابدی کا ہونا شرک ہے، اور یہ سراسر نادانی اور جہالت ہے، مولیٰ

کریم نے انسان کوحیات ابدی سے حصہ دیا ہے ،بعض کم فہمی کی وجہ سے آیات بینات کودلیل پکڑتے ہیں،مثلا:

"كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ" [البقرة:٢٨]

''کیونکہ کفر کرتے ہوتم ساتھ اللہ کے اور تھے تم مردے پس جلایاتم کوپھر مردہ کرے گاتم کوپھر جلائے گاتم کوپھر طرف اسی کے پھیرے جاؤ گے۔''

اس آیت سے ان کا مفاد انسان کے معدوم ہوجانے یامرکرمٹی ہوجانے ،نیست ونابوداور حیات سے منقطع ہوجانے کے سوانہیں ہے اوران کی غلطی کا یہی سبب ہے۔

جاننا چاہیے کہ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا کی حقیقت دووجہ پرواقعہ ہوئی ہے،ایک تو حضرت آدم علیہ السلام کا بت روح پھونکنے سے پہلے یعنی خلق اول اور نطفے سے لے کررحم مادر میں طفل بننے تک حیات سے قبل ،خلق آخر،اوردوسری موت زندہ ہونے کے بعد میدانِ دنیا سے عالم برزخ کی طرف انتقال جو ہر عام وخاص کے نزدیک معروف ہے،اور پھر دوسری حیاتی صور کا پھونکا جانا اور قبروں سے اُٹھنا ہے،روح کے پھونکے جانے سے تغیروتبدل کی صورت وجود کے لیے روح ہونے اورزندہ ہونے سے ہے،یعنی پہلے بت کا روح سے زندہ ہونا پھر بت کا روح سے جدا ہونا،مطابق فرمان ایزدمتعال:

"وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ"[التکویر:٧] ''اور جب جانیں ملائی جائیں گی۔''

پھراسی وجود کا زندہ ہونا نص سے ثابت ہے،توحیاتی روح کے آنے سے اورموت روح کے چلے جانے سے ہے،اوراس کا مردہ اورزندہ ہوناوجودعنصری کے متعلق ہے،نہ کہ روحی سے،جوانسان اوراس کا اصل ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ صاحبِ قبرکوسلام دینا چاہیے،اوراس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ جانتا ہے کہ میری قبر پر چڑیا نر ہے یا مادہ،فرمان ایزدمتعال:

"اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ ''وہ آگ ہے کہ حاضر کیے جاتے ہیں اوپر اس

تَـقُـوْمُ السَّـاعَةُ اَدْخِـلُـوْاٰلَ فِـرْعَوْنَ اَشَدَّالْعَذَابِ" کے صبح اور شام اور جس دن کہ قائم ہوگی قیامت کہا جائے گا کہ داخل کرو لوگوں فرعون کے کو سخت عذاب میں۔"

[المومن: ۴۶]

اس پر دال ہے کہ کافر بھی عالم برزخ میں وجود عنصری کے سوا وجود رکھتے ہیں، اس عزیز الحکیم نے انسان کو جامع الصفات بنا کر دونوں جہاں کے نشانات سے مزین فرمایا ہے، پھر اس کو مطلع کرنے کے لیے اپنی کلام مبارک سے علم دیا ہے، جیسا کہ نیند کو موت فرمایا ہے، دراصل اس کو صغیر کہیں یا کبیر، موت یعنی اس وجود سے منتقل ہو کر عالم برزخ میں قیام کرنے کے منافی نہیں ہے صغیر اور کبیر کا فرق صرف اتنا ہے کہ روح کا وجود میں رہ کر عالم برزخ کی طرف سیر کرنا صغیر کے مترادف ہے جو رؤیا اور خواب کے نام سے موسوم ہے، اور نیند کے غلبہ اور کیفیت سے وجود مثل مردہ کے ہو جاتا ہے، اور اس کے لیے قادر مطلق نے روح کو قبض کر لینے ہی کا ارشاد فرمایا ہے، اور ساتھ ہی تفصیل کر دی ہے کہ واپس کر دیا جاتا ہے، تا کہ مدت حیات پوری کی جائے، اور جن کی حیات پوری ہو جاتی ہے، روک لیا جاتا ہے، اس لیے صغیر ہو یا کبیر کیفیت عالم برزخ یعنی موت کے بعد کے زمانہ میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، ہاں! مومن اور کافر کے حالات میں بہت بڑا فرق ہے اور مومنین کے حالات بھی ہر چند مختلف ہیں، جس قدر روحانیت قوی ہوتی ہے، وجود کا تعلق زیادہ ہوتا ہے، اولیائے کرام کا حال اور طرح کا ہے اور عام مومن کا اور طرح، اس کے سمجھنے کے لیے ہر روز کے خوابوں کی مختلف کیفیت اظہر من الشمس ہے۔

خوابِ انسان دراصل مملکت انسانیہ کی سیر ہے جو کئی نوع پر منقسم ہے، ہر ایک کی سیر اس کے حال کے مطابق ہوتی ہے، ہر ایک قسم کے تاثرات جو انسان کے بطن میں مؤثر ہوتے ہیں، تخم کی مانند انسانی بسط کے میدان میں شجر کی صورت میں متشکل ہو کر معائنہ میں آتے رہتے ہیں، جو ابتدا میں بالکل کمزور اور ناپائدار سے ہوا کرتے ہیں، ایسی خوابوں کو تخیلی یا صوری کہنا روا ہوتا ہے، لیکن متواتر اثرات پڑنے اور خیال کو قوی اور مثبت کر دینے سے نسبتی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یعنی عادت کیے گئے انسان کے ضمیر میں اَلْـعَـادَةُ طَبِیْـعَةٌ ثَـانِیَةٌ کے مصداق نیک ہو یا بد ایک قوی طاقت اور بسط کے ساتھ مختلف وجوہات پر عجیب

وغریب کیفیات کا معائنہ ہوتا رہتا ہے، جس کی تعبیر اور حقیقت سے انسان اکثر جاہل ہی رہتا ہے۔

ایک شخص بچپن سے شریف، متقی اور پرہیز گار، مجاہد اور شب خیز و درود وظائف کا دیوانہ، عبادت کا شیدا، طالب خدا، مجاہد بے ریا، تصنع سے دور ذکر الٰہی میں مسرور تھا ایک دن بستر خواب سے اُٹھتے ہی دیوانہ وار ہاتھ میں لاٹھی لیے پورے جوش وخروش کے ساتھ اہل ہنود کی رسوئی میں داخل ہو کر برتن توڑنے لگا اور کئی وجہ پر تبلیغی باتیں بنانے لگا کہ ''بادشاہ مسلمان ہوگیا ہے اور تم ابھی تک ہندو ہی ہو''؟ عوام میں مشہور ہو گیا کہ فلاں آدمی کیسا نیک کردار اور پرہیز گار تھا، افسوس کہ پاگل ہوگیا ہے، واقعی بظاہر اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی تھی، ہوش وحواس درست نہ تھے، کانسی کا ایک برتن پانی سے بھرا ہوا، اس میں دو پتلی پتلی خشک ٹہنیاں اور ایک چھوٹی سی پتلی لکڑی ہاتھ میں لیے اس برتن کو ڈھول کی طرح بجاتا ہوا اپنے والد کے ہمراہ حضرت اعلیٰ صاحب کی مسجد میں آنکلا، دراصل اس کا والد اسے اپنے ہمراہ قطب زمان کی خدمت میں اس غرض سے لایا تھا کہ اس کے حال پر توجہ فرمائیں، خیر! اس پاک ہستی کی نظر سے وہ چند روز میں اچھا بھلا ہوگیا اور اپنے کام کاج، نماز وعبادات میں پہلے کی طرح مشغول ہوگیا، چونکہ میرے دل میں اس کے متعلق کچھ تشویش سی تھی، اس لیے میں نے اس سے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے دریافت کیا کہ ''تجھے کیا ہوا تھا''؟ بولا کچھ پتہ نہیں، ہوش ہی بجا نہ رہے تھے، اس سے زیادہ کچھ بیان نہ کرتا تھا، آخر بہت اصرار اور کرید کے بعد اس نے بتایا کہ ''میں سویا پڑا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ بادشاہ مسلمان ہوگیا ہے، ہر شہر کے ہر گلی کوچہ بلکہ ہر گھر میں اسلام کا جوش ہے، قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ کے سوا کوئی کلام نہیں، سوائے دین الحق کے کسی کو کوئی کام نہیں، اس حیرت انگیز منظر کو دیکھتے ہی میرے ہوش وحواس درست نہ رہ سکے، اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کیا کرتا تھا'' میرا مقصود پورا ہوگیا اور میں نے دریافت کا سلسلہ بند کر دیا۔

دراصل اس نیک بخت نے جہاں کہیں سے کچھ سنا، جس ورد ووظیفہ کی تعریف سے عارف ہوا، پڑھنا شروع کر دیا، اور اس کا اثر اس کے بطن پر موثر ہوتا رہا، سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری و ساری رہے گی کہ ہر فعل اور حال کے لیے کوئی رہنما ہو، استاذ ہو، فرمان مولیٰ کریم ہے:

"یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ وَابْتَغُوْااِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَوَجَاھِدُوْافِیْ سَبِیْلِیہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"[المائدۃ:۳۵]

"اے لوگوں جوایمان لائے ہوڈرواللہ سے اورڈھونڈوطرف اس کے وسیلہ اورمحنت کروبیچ راہ اس کی کے تاکہ تم فلاح پاؤ"

اگر بموجب قرآن شریف صحیح وسیلہ کے ذریعہ کسی طریقہ سے سلسلہ میں داخل ہوکر یہ وردووظیفہ کیا جاتا تو یہ حال مطابق نسبت ولایت کے مترادف ہوتا، جو دیوانہ اور مجنون کے موافق ہوگیا، یہ مملکت انسانیہ کی سیر تھی، اور وردووظیفہ کا اثر اس کے بطن میں یعنی مملکت انسانیہ کی بادشاہیت کے مترادف تھا، مطابق اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً بطن میں مُلْکًا کَبِیْرًا کا شہنشاہ بحیثیت نائب احکم الحاکمین، اور بظاہر فی الدنیا حسب وعدہ عزیز الحکیم:

"وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْامِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ بَعْدِخَوْفِھِمْ اَمْنًا"

[النور:۵۵]

"وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں تم میں سے اور کام کیے اچھے البتہ خلیفہ کرے گا ان کو بیچ زمین کے جیسا کہ خلیفہ کیا تھا ان لوگوں کو کہ پہلے ان سے تھے اور البتہ ثابت کردے گا واسطے ان کے دین ان کا جو پسند کردیا ہے واسطے ان کے اور البتہ بدل دے گا ان کو پیچھے خوف ان کے کے امن"

کا مصداق ہوتا، لیکن وہ برداشت نہ کرسکا، اور تعلیم اور عمل بھی طریقت کے خلاف تھا، ورنہ ایسا نہ ہوتا۔

سنت الٰہی کے مطابق ہر نیک و بدعمل کا اثر انسان کے بطن پر مؤثر ہوتا ہے، اور استقامت کے بعد اس کا ثمر اور ظہور فی الدنیا والآخرہ ہویدا ہوتا رہتا ہے، یہ سرشت انسانیہ کا خاصہ ہے جو اس مالک حقیقی نے پراز حکمت فطرت سے انسان کو مزین فرمایا ہے، اور یہی عالم برزخ اور اس کا اصل ہے، حضرت علی کرم

۱۔ بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔

اللہ وجہہ مظہر العجائب والغرائب، شاہ ولایت، محبت کے پھول، محرم اصل الاصول نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا ہی اچھی تعلیم فرمائی ہے کہ فَكُفْرُكَ فِيكَ يَكْفِيكَ (اپنی ذات میں تیرا فکر تجھے کفایت کرے گا) گوایک حد تک سعی انسان بتوفیق الٰہی ہے لیکن مدارج دینی ودنیوی عنایت الٰہی سے وابستہ ہیں جن کا انحصار محض فضل ایزدمتعال ذوالجلال والاکرام پر ہے۔

خوابوں کے حالات:

خواب کی تعبیر موافق حال مختلف ہوا کرتی ہے، اس لیے ان خواص کی خوابوں کی تعبیر دوسرا شخص صحیح نہیں بتا سکتا، خودان کا حال اورورودواور ہرروز کے نشانات ظہور پذیر ہونے سے تعبیر کاحل ہوا کرتے ہیں، گاہے تمثیلی صورت میں ممثل ہوا کرتا ہے گاہے عینی، عینی تو رؤیا کے مترادف ہوا کرتا ہے، کبھی بیداری میں میدان استغراق سے اور کبھی اُونگھ میں خواب کی حالت سے، رہا تمثیلی، سواس کے بیان میں بہت طول ہے، اختصار کی صورت میں صرف چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

مثلاً کبھی خواب میں مرد کو عورت سے یا عورت کو مرد سے مباشرت باعثِ حظ ہوتی ہے، بعض محتلم بھی ہو جاتے ہیں، لیکن نیک سرشت قوی الضمیر محتلم بھی نہیں ہوتے۔

زبیدہ خاتون نے خواب دیکھا کہ تمام نوع انسان بلکہ حیوان، درند، پرند، چرند ہر قسم نے میرے ساتھ مباشرت کی ہے، صبح اس کیفیت خواب سے سخت حیران اور پریشان تھی، آخر ایک کنیز سے یہ خواب نہایت متحیر ہوکر بیان کیا اور کہاں کہ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں جاکر اس کی تعبیر دریافت کر، لیکن میرا نام نہ لینا، اپنا خواب بتانا، اس کنیز نے ایسا ہی کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ تیرا خواب نہیں ہے، جس کو یہ خواب آیا اس کو بھیج، آخر چاروناچار زبیدہ خاتون نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ حضرت! یہ خواب میں نے دیکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ آپ کو مبارک ہو، آپ سے کوئی ایسا فعل ہوگا کہ تمام قسم کے جاندار آپ کے فیض سے حظ اُٹھائیں گے اور آپ کو عنداللہ اجر عظیم ہوگا، چنانچہ اس نیک بخت نے ایک نہر نکلوائی جو حجاز میں دور تک پھیلی ہوئی ہے، اور علاوہ حجاج اور انسانوں کے ہر قسم کے صحرائی اور فضائی جانور اس سے اپنے پیاسے جگروں کو سیراب کرتے ہیں، اور تا قیامت یہ صدقہ جاریہ

اس سعیدہ کے لیے باعث ازدیاد برکت رہے گا۔

حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا کہ ستارے، چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں، یہ مثال عزت وتکریم کی تھی جس کا ظہور اظہر من الشمس ہے۔

بعض اوقات خواب میں یا معمولی سی اُونگھ میں کوئی شخص دیکھتا ہے، یا الہام کی صورت میں آواز سنتا ہے، کہ تیرا استاد فوت ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر استاد کے پاس پہنچتا ہے اور اس کو بخیریت تمام پاتا ہے، لیکن بعد از ملاحظہ حال اس کو معلوم ہو جاتا ہے، کہ جو فیض و برکت اس کے وجود یا برزخ میں اس کی طرف سے منسوب تھی کسی خطا کی وجہ سے مفقود ہو چکی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ معانی میرے حال کی عبارت ہی سے نمایاں ہوئے ہیں۔

ہر ایک کا برزخ اس کے حال کی رویت پر واضح ہوتا ہے، مثلاً ایک عام دنیا دار آدمی خواب دیکھتا ہے کہ میں اور میرا حریف دونوں کسی پانی تالاب یا دریا یا نہر سے پار جا رہے ہیں، حریف تو کشتی پر سوار ہو کر پار چلا گیا ہے اور میں نے ہر چند کوشش کی ہے لیکن پار نہیں جا سکا، بعد میں وہ دونوں کسی کام کے لیے اپنی اپنی جگہ پر سعی کرتے ہیں، وہ کشتی پر جانے والا کامیاب ہو جاتا ہے اور یہ ناکام رہ جاتا ہے، اور اگر کوئی طالب خدا خواب میں دریا کو عبور کرتا ہے، خواہ کشتی پر یا بغیر کسی سہارے کے تیرتا ہوا دریا سے پار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے یہ معائنہ توحیدِ الٰہی کے مترادف ہوتا ہے، قصہ مختصر ہر ایک کا دریا سے پار ہونا اس کے ضمیر کی مراد کے سفر کو طے کرنے کے سوا نہیں ہوا کرتا۔

گو حال کی رو سے برزخ فی الدنیا اور آخرہ کا کوئی فرق نہیں ہے، لیکن مقام کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے، اس کیفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی دیوار یا مکان میں آئینہ لگا ہوا ہو، اور اس کے سامنے دروازہ کھلا ہوا ہو تو باہر کی ہر چیز اس آئینہ میں سے عیاں ہوتی ہے، جو کچھ انسان دیکھتا ہے درست دیکھتا ہے، ہر چیز کی حرکات وسکنات، شکل وشباہت میں کوئی فرق نہیں پاتا ہے، لیکن موت کے بعد اس مکان سے باہر نکل جاتا ہے، اور جو کچھ پہلے عکسی صورت میں دیکھتا تھا، اب عینی صورت میں معائنہ کرنے والا ہوتا ہے، ہر نیک وبدعمل جو مثل تخم کے دل کی زمین میں پوشیدہ تھا، شجر کی مانند ہویدا ہو گیا ہے،

مثلاً معصیت مثل آگ جلانے والی کے اور نیکی مثل جنت کے ٹھنڈک اور تفریح پہنچانے والی ہوگئی، لیکن اس میں بھی عوام کے مانند خواص کا حال نہیں ہوتا ہے، خواص کو فی الدنیا یہ کیفیت پنہاں نہیں رہتی ہے، وہ ذراسی غلطی کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی غیر موافق تاثیران کے بطن یعنی برزخ میں مؤثر ہوتی ہے، تڑپادیتی ہے، آگ لگادیتی ہے، کمزور کردیتی ہے، جب تک وہ اللہ کے فضل وکرم سے دور نہ ہوجائے، ہوش وحواس ہی بجاودرست نہیں ہوتے ہیں، اور انبیاو مرسلین کا حال تو ان سب کیفیات سے بدرجہاورا ہوتا ہے، ان کا برزخ دراصل ہوتا ہی نہیں ہے یا صحیح معنوں میں فی الدنیا ان کا حال برزخ کی طرح ہوتا ہے، ان حجابات سے یہ ہستیاں منزہ ومبرا ہوتی ہیں، اور دراصل مرسلین کے حال سے مومن تو درکنار کسی اولیاء اللہ کو بھی کما حقہ، واقفیت ہونا محال ہے اس لیے کلام سوءادبی ہے۔

جس طرح خاص کی حالت اور کیفیت پنہاں ہی رہتی ہے اسی طرح نسبت منکرین کا غلبہ بھی ان کے حال پر غلبہ رکھتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:

"وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَّاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا" [الاعراف: ۱۴۶]	"اور اگر دیکھیں راہ بھلائی کی نہ پکڑیں اس کو راستہ اور اگر دیکھیں راہ گمراہی کی پکڑیں اس کو راستہ"

ان کی حالت اس کے مترادف ہوجاتی ہے، ایک شخص نے میرے پاس آکر شکایت کی کہ جب میں نماز پڑھنے لگتا ہوں تو میرے جوڑوں میں درد ہونا شروع ہوجاتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، چھوڑ دیتا ہوں تو پھر دوچار دن کے بعد آرام ہوجاتا ہے، دراصل انسان اپنے حال سے اکثر جاہل رہتا ہے، میں نے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرادیا کہ یہ بے نمازیت تیرے جوڑوں سے نکل رہی ہے نماز نہ چھوڑنا، ان شاء اللہ تعالیٰ بالکل صحت ہوجائے گی، لیکن وہ صبر واستقامت نہ رکھ سکا۔

حاصل مطلب، انسان اپنے بطن اور حال کے تغیر وتبدل سے گھبراجاتا ہے، اور غلطی کھاجاتا ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا، صاحبِ حال بھی اس تغیر وتبدل، قبض وبسط، آرام وتکلیف، اور راحت ورنج میں غلطی کھاجاتے ہیں، کیونکہ جس نسبت میں اس کا حال مناسبت پیدا کرتا ہے اسی کو حال سمجھنے لگتا ہے

اور دراصل ہر ایک کا وہی حال ہوتا ہے، دوسرے حال یا نسبت سے جاہل ہوتا ہے، کوئی لاکھوں میں کا ایک جو قریباً سب نسبتوں سے علم رکھتا ہو، تمام احوال کے میدان سے گزرا ہوا ہو، تمیز کرنے والا ہوتا ہے، اسی لیے بعض صاحبِ حال جب شریعت غرا اور سنت نبی کریم صلی اللہ ولیہ وآلہ وسلم کے خلاف اپنے حال سے محفوظ ہوتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ سارا حال خلاف سنت ہے، تو وہ اپنے حال کے متوالے دو حال سے خالی نہیں ہوتے۔

ا۔ یا تو اس حال کو شریعت اور سنت سے ارفع اور اعلیٰ خیال کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ اسی پر ہوتا ہے

۲ یا اپنے حال کو قضا و قدر خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

پہلے گروہ کے حال کے اسباب و وجوہات ان کی مناسبت کے مترادف ہوتے ہیں، چونکہ باری تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو بیحد متاثر بنایا ہے اور یہی اس کی ہر قسم کی ترقی کا باعث ہے، خواہ ناری طبقات سے ہو یا نوری، پاکی ہو یا پلیدی، نیکی ہو یا بُرائی، خیر ہو یا شر، نفع ہو یا نقصان، ہر ایک فعل سے متاثر ہر ایک نسبت سے مناسبت کر جانے والا اور اَلْعَادَةُ طَبِيعَةٌ ثَانِيَةٌ [۱] کے مصداق ہر رنگ میں رنگا جانے والا اور مطابق كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ [۲] ہر ایک اپنے حال میں خوش ہوتا ہے (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اس لیے طبیعت کی قبض و بسط کو ضمیر کے ترازو میں موازنہ کرنے سے مامور من اللہ اور رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے ورود پر فیصلہ کر لیتا ہے اور اپنی حالت کو درست اور اپنی نسبت کو صحیح خیال کرتا ہے، اور نا مطابقت کی وجہ سے شریعت غرا اور سنت نبی کریم صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم کو ابتدائی درجہ اور اسفل خیال کرتا ہے اور اپنے حال کو ولایت اعلیٰ پر دال کرتا ہے، حضرت داتا گنج بخش صاحب ہجویری لاہوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص شریعت غرا کی حدود کو توڑے اور احکام خداوندی کو فنا کرے لوگوں کے نزدیک ولی ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک وہ شیطان ہے۔

دوسرا گروہ باوجود اسی حال سے مناسبت رکھنے کے برائے نام آداب شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے حال کو قضا و قدر خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور

۱۔ عادت دوسری طبیعت ہے۔ ۲۔ ہر گروہ اپنی یافت پر خوش ہے۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

کے مضمون سے مطمئن ہو جاتے ہیں، لیکن تقدیر میں انسان مطلق جاہل ہے جس کا علم اس قادرِ مطلق کے سوا کما حقہ کوئی نہیں جانتا، گو میری کم استعدادی اتنی وسعت کی مالک نہیں ہے کہ میں اس کو تفصیل کے ساتھ تحریر کرسکوں، ایسے شخصوں کی حقیقت حال سے تامل ہی ہے، لیکن میرا مسلک اس کتاب میں محض انسان فی القرآن ہے، اس لیے

تقدیر انسان

میں قلم کو تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں، وَمَاتَوْفِيْقِىْ اِلَّابِاللّٰهِ۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ کرام میں سے چند صاحب کچھ تقدیر میں گفتگو کر رہے تھے، آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ اس میں زیادہ کلام نہ کرو، قبل ازیں کئی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔

دوسری حدیث شریف میں ہے کہ ازل سے ابدالاباد تک جو کچھ ہونے والا تھا، وہ ہو چکا ہے ،اور فرمایا کہ جَفَّ الْقَلَمُ یعنی قلم سوکھ گیا اور سیاہی خشک ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ تقدیر میں عوام تو درکنار بڑے بڑے علمائے دین کی عقلیں بھی قاصر ہیں، بزرگانِ دین میں سے جن پاک ہستیوں کو اس علیم الحکیم نے جس قدر علم بخشا ہے، مشیت ایزدی کے مطابق اس کی تفصیل واظہار سے سکوت اختیار کرنے والے ہیں، ہاں حسب استعداد تعلیم سے دریغ کرنے والے نہیں ہوتے ہیں۔ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کسی شخص نے عریضہ ارسال کیا، جس میں بعد حمد وصلوٰۃ کے مسئلہ تقدیر کا جواب چاہا، آپ نے تحریر فرمایا کہ ہمارا ایمان جبر اور قدر کے درمیان ہے، نہ ہم قدریہ ہیں اور نہ جبریہ، اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا، آپ نے فرمایا تیری ماں تجھ پر روئے ،اندھیرے چاہ میں بغیر روشنی کے داخل نہ ہو۔

ان ارشادات سے ثابت ہو رہا ہے کہ سائلوں کی استعداد اور سمجھ کے مطابق یہ جوابات تھے، کیونکہ ہر ایک کا بطن اس لقمہ کے قابل نہیں ہے، ہر ایک کی استعداد اس کی حامل نہیں ہوسکتی، اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ اعتقاد صحت کی رو سے نہایت بجا و درست ہے کہ ہم جبریہ ہیں اور نہ ہی قدریہ، قدریہ وہ ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اس عمل کی جزا یا سزا کے مرتکب ہوتے ہیں، یعنی جزا من اللہ نیک اعمال کی رو سے اور سزا معصیت کی وجہ سے، اس کے سوا خداوند کریم نہ ہم کو کوئی ثواب عطا فرماتا ہے اور نہ ہی سزا دیا کرتا ہے، اور جبریہ کا اعتقاد یہ ہے کہ خواہ ہم عمل کریں یا نہ کریں جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا گیا ہے وہی حصول ہے ہماری کوشش ہمارے عارضہ کی وجہ پر ہے اور مجاہدہ بے سود۔

قومے بہ جدوجہد گرفتند وصل یار
قومے دگر حوالہ تقدیر می کنند

بلکہ ان کا یقین ہے کہ تدبیر بھی تقدیر کی طرف لے جاتی ہے۔

سوزنِ تدبیر گر ساری عمر سیتی رہے
رخنہ تقدیر کو ممکن نہیں کرنا رفو

اور قدریہ اور جبریہ کے درمیان صحت اس وجہ پر ہے کہ ہم قدریہ تو اپنے اعمال کی وجہ پر ہیں اور جبریہ من اللہ جزا یا سزا کی رو سے، اور یہ اس لیے کہ اس صورت کے سوا ہر دو وجوہات کلامِ الٰہی کے خلاف کی مقتضی ہیں، كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ:

"مَـااَصَـابَکَ مِـنْ حَسَـنَةٍفَمِـنَ اللّٰـهِ وَمَااَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍفَمِنْ نَّفْسِکَ" [النساء: ۷۹]

''جو پہنچتا ہے کہ بھلائی سے پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہنچتا ہے تجھ کو بُرائی سے پس تیرے نفس سے ہے''

اس لیے بھلائی اور برائی دونوں کو اس عزیز الحکیم کی طرف منسوب کرنا خطا ہے اور جبریہ کا مذہب باطل ہے اس میں شک نہیں کہ يُضِـلُّ مَـنْ يَّشَـاءُ وَيَهْدِیْ مَنْ يَّشَاءُ [۱] ومثلها آیات سے قادریت ٹپک

۱۔ گمراہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

رہی ہے، لیکن سارے قرآن شریف سے بے محل یا بلا وجہ ایک آیت کا ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ آلم سے وَالنَّاس تک ایک آیت تو در کنار ایک لفظ بھی سوائے اس کے نہیں ہے کہ اُصولِ نزول ہمارے حال کی وجہ پر ہے اور شانِ نزول ہمارے اعمال کی وجہ پر، اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے کلام کی پوری سمجھ عطا فرمائے، اس خالق کائنات نے انسان کو جامع صفات بنایا ہے اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم ١ فرما کر ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ٢ یعنی میدان دنیا میں مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ٣ کی میعاد کی قید لگا کر خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ٤ کا ارشاد فرمایا ہے، اس خاکی پتلا میں دونوں جہان سے نشان ہیں، پھر فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ٥ کی تعلیم حالیہ اس کے ضمیر میں سرشت کی رو سے گوندھ رکھی ہے، بعدہ بتوسل مرسلین اپنی آیات سے یوں تعلیم فرمائی:

"فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی"

[طٰہٰ: ۱۲۳ تا ۱۲۴]

"پس اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پس جس نے پیروی کی ہدایت میری کی پس گمراہ ہوگا اور نہ ایذا کھنچے گا، اور جس نے منہ پھیرا یاد میری سے پس تحقیق واسطے اس کے ہے معیشت تنگ اور اٹھائیں گے ہم اس کو دن قیامت کے اندھا"

اور وعدہ اور وعید کی رو سے آگاہ فرمادیا ہے کہ:

"وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ"

[الکہف: ۲۹]

"اور آپ کہہ دیجیے کہ یہ حق ہے پروردگار تمہارے کی طرف سے، پس جو کوئی چاہے پس ایمان لائے اور جو کوئی چاہے پس کفر کرے۔"

۱۔ بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو بیچ اچھی صورت کے۔ ۲۔ پھر اسے ہر نیچی حالت کی طرف پھیر دیا۔
۳۔ جائے قرار اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک۔ ٤۔ پیدا کیا موت کو زندگانی کو تا کہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھا ہے اعمال کی رو سے۔ ٥۔ پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری دل میں ڈالی۔

مذکورہ بالا حدیث شریف کا ارشاد مبارک عمل کے میدان میں قانون کے رو سے وعدہ اور وعید کی وجہ پر اس آیت کے مترادف ہی ہے کہ جَفَّ الْقَلَمُ یعنی قلم سوکھ گیا ہے، اور سیاہی خشک ہوگئی ہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ پھر ہم کس پر عمل کریں؟ فرمایا اعمال نیک میں از حد سعی کرو۔ اب ارشادات کے مطابق تغیر و تبدل خلاف قانون نہیں ہوسکتا۔

یہ قاعدہ کلیہ اور قرین عدل وانصاف ہے کہ ہر شخص کی آزمائش اس کے حصول یعنی طاقت، ہمت اور وصول ہی پر ہوا کرتی ہے تو انسان کو جو صفات من اللہ توفیق ہوئی ہیں، اور جس وسعت تک مختار کیا گیا ہے، لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [1] کے مطابق بلا میں مبتلا کیا گیا ہے یعنی آزمایا گیا ہے، اس بلا کے میدان میں انسان مفتون اور مولیٰ کریم ممتحن ہیں، مطابق ارشاد ذوالجلال والاکرام:

"اَلٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ"

[العنکبوت: ۱، ۲]

''کیا گمان کیا ہے لوگوں نے یہ کہ چھوڑے جائیں اتنے ہی پر کہ منہ سے کہہ لیں کہ ایمان لائے ہم اور وہ نہ آزمائے جائیں''

تو انسان اس مقام میں دو حال سے خالی نہیں رہتا، یا فرماں بردار، یا نافرمان، اور ذات پاک کا معاملہ اس حال میں بھی اپنے بندوں کے ساتھ عجیب ہی ہے، فرماتے ہیں:

"وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِیْرًا"

[الفاطر: ۴۵]

''اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا ولیکن ڈھیل دیتا ہے ان کو ایک وقت مقرر تک، پس جب آوے گا وقت مقرر ان کا پس تحقیق اللہ ہے ساتھ بندوں اپنے کے دیکھنے والا''

تاہم لَایُخْلِفُ الْمِیْعَادَ کے مطابق فرمان صادر ہو رہا ہے:

[1] ۔ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو مگر طاقت اس کی پر۔

"مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ"

[الانعام: ۱۶۰]

"جوکوئی لاوے بھلائی پس واسطے اس کے ہے دس برابر اس کے اور جو کوئی لاوے برائی پس نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر مانند اس کی اور وہ نہیں ظلم کیے جائیں گے"

وہ مالک حقیقی نیکی کو پسند فرماتے ہیں اور برائی سے بیزار ہوتے ہیں ایک حد تک انسان اسی حال میں حائل رہتا ہے، اس مقام سے گزرنے کے بعد اس قادر مطلق کی تقدیر انسان کے لیے توفیق سرشتی سے بدل کر اضافیہ تصرف کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرمان مبارک ہے:

"فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا"

[الانعام: ۱۲۵، ۱۲۶]

"تو جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کردے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے اور یہ ہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے"

اب یہ دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا ہے جو جبریہ کے مترادف ہے، یعنی ارادہ الٰہی نیک شخص کے لیے ہدایت اور شرح صدر اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى کے مطابق کسی قدر مشیت ایزدی کا تصرف انسان کے ضمیر میں توفیق ہوتا ہے، اسلام اور اعمال اس کے لیے آسان تر اور محفوظ ہو جاتے ہیں، وہ کشاں کشاں صراط مستقیم کی طرف دوڑا چلا جاتا ہے اور فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ کی تعلیم کا راستہ پالیتا ہے، برکات اور نعمات اس کے قدم چومتی ہیں، عجز و الحاح کی دولت اس کا نصیب ہو جاتی ہے، پہلا طبقہ سرشت انسانیہ نیک و بداعمال کی وجہ پر آزمائش میں تھا، جس کو معلق تقدیر سے منسوب کرنا بجا و درست ہے، اور یہ حالت یعنی دوسرا طبقہ نسبت اضافیہ از راہ شفقت و کرم نوازی من اللہ تقدیر مبرم کے مترادف ہے، تاہم اس کا تعلق کسی قدر معلق

سے وابستہ ہے، جیسے کہ بلعم بن باعور کی نسبت کلام الٰہی شاہد ہے:

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَالَّذِیْ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَافَانْسَلَخَ مِنْهَافَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ وَلَوْشِئْنَالَرَفَعْنٰهُ بِهَاوَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَاِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْتَتْرُكْهُ یَلْهَثْ"

[الاعراف:۱۷۵، ۱۷۶]

''اور پڑھ او پر ان کے قصہ اس شخص کا کہ دیں ہم نے اسکو نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس پیچھے لگایا اسکو شیطان نے پس ہوگیا گمراہوں سے، اور اگر چاہتے ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان کے یعنی نشانیوں کے ولیکن وہ لگ گیا طرف زمین کی اور پیروی کی خواہش اپنی کی پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے تو اوپر اس کے زبان لٹکائے یا چھوڑ دے اس کو زبان لٹکائے''

دوسرا شخص اس مقام میں بوجہ بِمَا كَانُوْایَكْسِبُوْنَ ۱ ناراضگی اور غضبی صورت کا شکار ہو رہا ہے، یعنی اس میں تصرف حق کسی قدر مَنْ یُّرِدْاَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًاحَرَجًا ۲ کے مطابق مردودیت کی طرف ہو جاتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"وَاعْلَمُوْااَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ"

[الانفال:۲۴]

''اور جانو یہ کہ اللہ حائل ہوتا ہے درمیان آدمی کے اور دل اس کے کے''

اس کی عقل ماری جاتی ہے، سمجھ الٹ جاتی ہے، تکبر و رعونت کا پتلا بن کر مطابق ارشاد كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُفِی السَّمَآءِ (گویا آسمان پر چڑھ رہا ہے) کا مصداق بن جاتا ہے، اسلام اور نیک اعمال اس کے لیے کٹھن ہو جاتے ہیں بلکہ برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھنے لگ جاتا ہے، تاہم کسی قدر اس کی تقدیر معلق سے علاقہ رکھتی ہے، كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :

۱۔ بسبب اس چیز کے کہ کماتے تھے۔

۲۔ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

"اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّا رِ وَلَنْ تَجِدَلَهُمْ نَصِیْراً o اِلَّاالَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْاوَاعْتَصَمُوْابِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْادِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ"

[النساء: ۱۴۵، ۱۴۶]

''بیشک منافق بیچ درجے نیچے کے ہیں آگ سے اور ہرگز نہ پائے گا تو واسطے ان کے مددگار، مگر جنہوں نے کہ توبہ کی اور صلاحیت کی اور مضبوط پکڑا خدا کو اور خالص کیا دین اپنے کو واسطے اللہ کے، پس یہ لوگ ساتھ مسلمانوں کے ہیں''

اور رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ (میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے) کے مطابق تغیر و تبدل سے امید باقی ہوتی ہے، اب اس طبقہ سے عبور کرنے کے بعد مبرم مطلق ہو جاتی ہے، تصرف حق اس کے لیے خواہ شقی ہو یا سعید، ہر دو وجہ پر اس کے حال کے موافق متصرف ہو جاتا ہے، کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْاسَوَاءٌ عَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ o خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌوَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ"

[البقرة: ۶، ۷]

''بیشک جو لوگ کہ کافر ہوئے برابر ہے اوپر ان کے کیا ڈرایا تو نے ان کو یا نہ ڈرایا تو نے ان کو نہیں ایمان لائے گے، مہر کی اللہ نے اوپر دلوں ان کے کے اور اوپر کانوں ان کے کے، اور اوپر آنکھوں ان کی کے پردہ ہے اور واسطے ان کے عذاب ہے بہت بڑا''

اس کو مفصل کرنے کے لیے اور اشکال کو رفع کرنے کے لیے دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے:

"ذَالِکَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْاثُمَّ کَفَرُوْافَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَایَفْقَهُوْنَ"

[المنافقون: ۳]

''یہ بسبب اس کے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پس مہر رکھی گئی اوپر دلوں ان کے کے پس وہ نہیں سمجھتے۔''

اما بعد سرکشوں اور بدنصیبوں کو از روئے غیرت و غضب فرمایا:

"اِسْتَحْوَذَعَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِکْرَاللّٰهِ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ اَلَااِنَّ حِزْبَ

''غالب آیا ہے اوپر ان کے شیطان پس بھلا دی ان کو یاد خدا کی، یہ لوگ گروہ شیطان کے

الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ" [المجادلة: ۱۹]

ہیں خبردار ہو تحقیق گروہ شیطان کے وہی ہیں زیاں پانے والے"

اسی طرح سعیدوں کے لیے، نیک نصیبوں کے واسطے از راہِ رحمت و ہدایت ارشاد فرمایا:

"لَاتَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْا اٰبَآءَ هُمْ اَوْاَبْنَآءَ هُمْ اَوْاِخْوَانَهُمْ اَوْعَشِیْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" [المجادلة: ۲۲]

"نہ پائے گا تو کسی قوم کو کہ ایمان لاتے ہوں ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے دوستی کریں ساتھ اس شخص سے کہ مقابلہ کرتا ہے اللہ کا اور رسول اس کے کا اگر چہ ہوں باپ ان کے یا بیٹے ان کے یا بھائی ان کے یا کنبہ ان کا، یہ لوگ لکھ دیا ہے اللہ نے بیچ دلوں ان کے کے ایمان اور قوت دی ہے ان کو ساتھ روح کے اپنی طرف سے داخل کرے گا ان کو بہشتوں میں کہ چلتی ہیں نیچے ان کے نہریں ہمیش رہنے والے بیچ ان کے، راضی ہوا اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے اور راضی ہوئے وہ اس سے، یہ لوگ ہیں گروہ خدا کے خبردار ہو تحقیق گروہ اللہ کے وہی ہیں فلاح پانے والے"

یہ احکام اور ان کا اصول نزول ہمارے حال کے موافق وارد ہے، اور شانِ نزول ہمارے افعال کے مطابق، بعض جہلا اور متکبر جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسی آیات کو بلا حجت ذات باری تعالیٰ کی طرف الزام کرتے ہیں اور یہ سراسر خطا اور کم فہمی ہے۔

"قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَامًا"

"کہہ کہ نہیں اختیار دیتا تم کو رب میرا اگر نہ ہوتی التجا تمہاری پس تحقیق جھٹلایا تم نے پس البتہ ہوگا

[الفرقان:۷۷] وبال اس کا لگ جانے والا"

کے مطالعہ اورغور سے ثابت ہورہا ہے کہ یہ ایسی خطا ہے جس کے لیے سزا لازم ہوجاتی ہے، ایسے اشکال کو رفع کرنے کے لیے اور حق کو ثابت کرنے کے لیے کیا ہی فیصلہ دیا ہے:

"سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا وَلَا اٰبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ"

[الانعام:۱۴۸،۱۴۹]

"البتہ کہیں گے وہ لوگ جو شریک لاتے ہیں اگر چاہتا اللہ نہ شریک کرتے ہم اور نہ باپ ہمارے اور نہ حرام کرتے ہم کچھ، اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے کہ پہلے ان سے تھے یہاں تک کہ چکھا انہوں نے عذاب ہمارا، کہہ کیا ہے تمہارے پاس کچھ علم پس نکالو گے اس کو واسطے ہمارے ؟ نہیں پیروی کرتے تم مگر گمان کی اور نہیں تم مگر اٹکل کرتے، کہہ پس واسطے اللہ کے ہے دلیل پہنچی ہوئی، پس اگر چاہتا ہدایت کرتا تم سب کو"

بالکل عیاں ہورہا ہے کہ بلاوجہ اور سوائے حجت کے مالک حقیقی کی طرف افعال سیہ یعنی شرک کروانے یا توحید کو ثابت کرنے یعنی شرک سے باز رکھنے کو منسوب کرنے والوں کو کذاب فرمایا ہے، اور فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کی رو سے غیرت کی وجہ پر بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے تحت میں اپنی مشیت کو نسبت کیا ہے، ایسی آیات بینات قرآن الحمید میں کثرت سے موجود ہیں جن سے مشیت ایزدی کے سوا کچھ ثابت نہیں ہوسکتا، بعض لوگ کم فہمی اور کم استعدادی کی وجہ سے بلاحجت ذات باری تعالیٰ کی طرف الزام کرتے ہیں، اور یہ سخت جہالت اور نادانی ہے، ان سب آیات کا یہاں درج کرنا لاحاصل ہے اس لیے سب سے قوی اور مشیت کی دلیل روشن فہمید کے لیے درج کی جاتی ہے، تاکہ تمام اشکال کے رفع کرنے کے لیے کافی ہوجائے، فرمایا ہے:

"وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"

[السجدة:۱۳]

''اور اگر چاہتے ہم البتہ دیتے ہم ہر ایک جی کو ہدایت اس کی ولکن ثابت ہوئی بات میری طرف سے کہ البتہ بھروں گا میں دوزخ کو جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔''

اب حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي ایسا اشکال ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ بات خداوند کریم کی طرف سے قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھروں گا، لیکن وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ [1] کی بساط پر غور و تعمق سے عجز و الحاح کے راستہ توفیق من اللہ کا طالب ہونا بعید از رحمت نہ ہوگا کہ تفسیر القرآن سے یہ اشکال حل ہو جائے۔

اے عزیز! خداوند جل وعلا تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے، حَقَّ الْقَوْلِ مِنِّي (یعنی میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے) کی علت اور اس کی حجت دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ واضح ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ جب خالق کائنات نے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کو سجدہ کا حکم فرمایا تو سب سجدہ میں گر پڑے، لیکن ابلیس اکڑ بیٹھا، فرمایا مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ [2] جواب دیا أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ، فرمایا دور ہو جا میری درگاہ سے، قیامت تک کے لیے تیرے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا گیا ہے، تو ابلیس نے کہاں کہ میری ایک عرض قبول کی جائے کہ مجھے إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ تک کی مہلت مل جائے، ارشاد ہوا فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ تب اس ملعون نے حصول مہلت کے بعد عناد کی وجہ پر کہاں فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ فرمان ہوا کہ:

"قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ"

''کہا کہ بس سچ بات ہے یہ، اور سچ کہتا ہوں میں، البتہ بھردوں گا میں دوزخ کو تجھ سے اور

۱۔ اور البتہ بے شک آسان کیا ہم نے قرآن کو واسطے ذکر کے پس کیا ہے کوئی ذکر کرنے والا۔

۲۔ کس نے تجھے منع کیا ہے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب کہ میں نے تجھے حکم دیا ہے۔

ان سے جو پیروی کرتے ہیں تیری ان میں سے اکھٹے" [ص: ۸۴، ۸۵]

پس اس قصہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ کا وعدہ مِنْکَ وَمِمَّنْ تَبِعَکَ کے لیے لازم ہوا، جو فَلِلّٰـهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کے مترادف ہے، نہ کہ بلا وجہ اور بلا حجت جنوں اور انسانوں سے دوزخ کو بھر دے گا کا الزام، جو ذات پاک کے لائق نہیں ہے، روا ہوسکتا ہے، بلکہ ایسا گمان کرنا بھی سراسر خطا ہے۔ رہا سوال علم

قضاوقدر

تو جاننا چاہیے کہ علم خداوندی ایک صفت بالذات ہے جو ذات پاک سے منفک نہیں ہے اور نہ ہی ہوئی ہے، اور نہ ہی کبھی ہوگی، اور نہ ہی اس کی وسعت کی کوئی حد ہے نہ حصر، جو کچھ ظہور میں آیا، اور جو آنے والا ہے، اور جو آچکا ہے، اس علیم خبیر کے علم میں ذرہ بے مقدار کی مانند بھی نہیں ہے، جب کچھ نہ تھا اور ہر شے کے ظہور کا علم اس حکیم وقدیر کی ذاتِ معلٰی میں متحقق تھا، اور اب بھی ویسا ہی علم اس کی ذات میں مانند ذات کے اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ [1] کے مترادف ہے، دراصل ظہور کا علم یا قبل از ظہور متحقق بالذات ہماری تفہیم کے لیے عبارت ہے، ورنہ مشیت ایزدی اور قدرت لامتناہی کے تصرف کے میدان میں ان کی کچھ وقعت نہیں ہے، اور وہ اس لیے کہ صفات ذاتیہ کا حصول ذات کے لیے جاننا روا نہیں ہے، بلکہ ان صفات ذاتیہ کو حصول بالذات ہے، جو تابع ذات ہیں، تو جب اس خالق کائنات نے ظہور کا ارادہ فرمایا تو اول خلقت نوری یعنی عالم امر کی طرف مرید ہوئے، اور اپنے علم میں سے جس قدر چاہا لوح وقلم کی طرف محفوظ سے منسوب کیا، کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ:

"لَارَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ اِلَّافِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ" [الانعام: ۵۹]

"نہیں کوئی تر نہ خشک مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے"

۱۔ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔

"لَايَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍفِي السَّمٰوٰتِ وَلَافِي الْاَرْضِ وَلَااَصْغَرُمِنْ ذٰلِكَ وَلَااَكْبَرُاِلَّافِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" [السبا:۳]

"نہیں پوشیدہ اس سے برابرایک ذرے کے بیچ آسمانوں کے اور نہ بیچ زمین کے اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے"

لیکن یہ علم خداوندی مخلوق میں سے کسی کے علم کی مانند نہیں ہے، اور وہ اس لیے کہ علم خداوند کریم ہرشی سے معیت کی رو سے ہے، اور یہ مخلوق کے لیے کسی وجہ سے بھی روا نہیں ہے، مولیٰ کریم کی ہر صفت ذاتیہ اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے بلکہ ہر وصف واصف کل لامحدود ہے، اس لیے ان حرفوں، لفظوں اور عبارتوں سے جو ہماری فہمید کے لیے حق سے نزول کی طرف، اصل سے فرع کی طرف اور مرکز سے دائرے کی طرف مبذول کیا گیا ہے، ورا بلکہ ورا سے بھی ورا ہے جس کا کماحقہ سمجھنا بھی ہمارے ادراک سے بالا ہے، تو اس صورت میں ازلی سعید اور ازلی بد بخت جس کی نسبت ذوالجلال والاکرام کی طرف روا ہے لیکن اس کا علم اور حکم ہماری طرف سے گمراہی کے سوا نہیں ہے، اور رب العالمین پر الزام بلا حجت کرنا خطا ہے، اور یہ جبریہ کا مذہب ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

مولیٰ کریم اپنے کسی فعل میں عاجز نہیں، بہر وجہ قادر ہے، ہاں باوجود قدرت رکھنے کے لَايُخْلِفُ الْمِيْعَادَ کے مطابق وعدہ کا ایفا کرتے ہیں، اور یہ بھی قدرت اور قادریت کی صریح دلیل ہے، کیونکہ ہر وعدہ کا ایفا سوائے قدرت کاملہ کے استقلال نہیں رکھتا، سارے قرآن مجید میں کسی کے ازلی بد بخت ہونے کا حکم پایا نہیں جاتا، ہاں حدیث شریف میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے اور آپ کے ہر دو یدین مبارک میں دو کتابیں تھیں، فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کتابیں کیا ہیں، اور ان میں کیا درج ہے"؟ سب نے عرض کیا "ہمارے ماں باپ قربان ہوں، اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں" تو آپ نے فرمایا ان میں ہر جنتی، اس کے ماں باپ، اور اس کے قبیلے کا نام درج ہے، اور ہر دوزخی، اس کے ماں باپ اور اس کے قبیلے کا نام درج ہے، اور اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی اور اس پر مہر چسپاں کی گئی ہے"

گواس حدیث کی صحت میں تامل ہے، لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تاہم اللہ جل شانہ، کی قادریت کے منافی نہیں ہوسکتی، کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"یَمْحُوا اللّٰهُ مَایَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْکِتٰبِ "[الرعد: ۳۹]

''مٹاڈالتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اور ثابت کرتا ہے، اور نزدیک اس کے ہے اصل کتاب۔''

اس آیت شریف کے مطابق کمی وبیشی، تغیر وتبدل روا ہوسکتا ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ " [الرحمن: ۳۱]

''شتاب فارغ ہوں گے ہم واسطے تمہارے اے دو خلقتیں جن وانس کی''

ان آیات سے ثابت ہورہا ہے کہ قضاوقدر کالکھا جانا اور کسی کام کا مقرر ہونا اس امر کا مقتضی نہیں، اور نہ ہی ہوسکتا ہے کہ قادریت خداوند تعالیٰ کے کسی امر کا منافی ہوسکے، اس خالق حقیقی اور قادرِ مطلق کا امر ہر وقت، ہر آن، ہر زمان مخلوق کے لیے مفعول ہے، عالم امر سے لے کر عالم موجودات تک کوئی چیز خواہ نوری ہو یا ناری، روحی ہو یا اجسادی، اپنے ارادہ اور حال میں قادر نہیں ہے، اور نہ ہی کبھی ہوگی، اس قادر مطلق کے یدقدرت میں عاجز اور طوعاً وکرہاً بندہ کی حیثیت میں ہے، تو اس صورت کے ضمن میں قضاوقدر کالکھنا جس کی کیفیت اور حال سے علم اس ذات پاک کے سوا محال ہے، اور مطابق یَمْحُوا اللّٰهُ مَایَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعَنْدَهٗ اُمُّ الْکِتٰبِ اس کا مٹانا اور ثابت رکھنا قادر مطلق کی قدرت اور اختیار میں محویت اور مثبت عاجز اور لاچار ہے، اس لیے کسی حکم کے لیے بھی تعین کا مدار روا نہیں ہوسکتا۔

اور یہ ہماری رجاوخوف کی حالت کو درست رکھنے اور اس سے مفاد حاصل کرنے اور صحت کے ساتھ رجوع الی اللہ حاصل کرنے کے واسطے ثبت اور نسخ کو قادریت کے تصرف کا مسخر بنادیا ہے تاکہ بہر حال رضائے الٰہی کے میدان میں ثابت قدمی سے مقصود حاصل کرنے والے ہوں۔

ولایت، کرامت اوراستدراج

حضرت علی ہجویری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ خداوند کریم ان کا ہونا چاہتا ہے اور یہ خدا کے چاہنے والے ہوتے ہیں، اصل مقصود کے معنوں کو پائے ہوئے، محبت کے شجر کو معرفت کے باغ میں سجائے ہوئے، من دون اللہ سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں، انگوریاں ان کے قدوم کی برکات سے اگتی ہیں، مسلمان ان کی دعاؤں سے فتح حاصل کرتے ہیں، یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ (اللہ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں) کی دولت انہی ہستیوں کیلئے مخصوص ہے جس کیلئے مولیٰ کریم نے انسان کو تخلیق کیا ہے۔

اے بھائی! سمجھ کہ یہ محبت مخلوق کی محبت کی طرح نہیں ہے، کیونکہ اس کا حصول حجابات کے دور ہونے کے سوا درست نہیں ہوسکتا، اور ماسوئ اللہ کی محبت سراسر حجاب ہے اس لئے مائل کی گئی چیزوں سے اعراض کرنے کے سوا اس کا حصول ناممکن ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُمِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْااَشَدُّ حُبًّالِّلّٰهِ"[البقرة:۱۶۵]

"اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنالیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں۔"

اس آیت شریف سے ظاہر ہے کہ کسی غیر خدا سے محبت شرک ہے، اور شرک دو وجہ پر ہے ایک شرک جلی اور دوسرا شرک خفی، شرک جلی تو کسی غیر کے سامنے سجدہ یا اس کی عبادت کرنا، یا اس سے خداوند کریم کی مثل مدد مانگنا، یا اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال کی مانند کسی کو جاننا ہے۔ لیکن شرک خفی محض کَحُبِّ اللّٰهِ کا مصداق ہے، یعنی کسی غیر خدا سے اس طرح محبت کرنا جیسی اس محبوب حقیقی سے چاہیے تھی۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک آدمی اپنی جان سے بھی زیادہ محبت مجھ سے نہ رکھے مومن نہیں ہوسکتا۔ تو اس کا حل بھی کلام الٰہی میں ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں فرمایا ہے:

"اِنَّمَاوَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"[المائدہ:۵۵]

"سوائے اس کے نہیں کہ دوست تمہارا، اللہ ہے اور رسول اس کا اور وہ لوگ کہ ایمان لائے۔"

بظاہر تو دونوں آیات بھی آپس میں متضاد ہی نظر آتی ہیں، لیکن تدبر کے میزان اور نورِ ایمانی کے ترازو میں جانچنے سے نہ صرف تطبیق ہوگی بلکہ معاملہ کی صحت منکشف ہو جائے گی۔

عزیز! دو چیزیں ان آیات سے صادر ہوتی ہیں، ایک مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور دوسری فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تو جان کہ ہر مِنْ دُوْنِ اللّٰہ شرک ہے اور ہر فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حق۔ بلکہ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے سوا اصل مدعا کا ملنا دشوار اور ولایت مذموم اور دوستی لا حاصل ہے، دراصل کسی نبی، ولی یا مومن کی محبت یا نسبت کے سوا یا دوسرے معنوں میں نورِ رسالت کے سوا محبت سراسر گمراہی ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَزَّوَجَلَّ:

"اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓءُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ" [البقرۃ:۲۵۷]

"اللہ ولی ہے مسلمان کا، انہیں اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کفار کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیریوں کی طرف نکالتے ہیں یہی لوگ دوزخ والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔"

ھیھات! آج عوام الناس کے نزدیک جو کوئی اسلام کے برخلاف راستہ اختیار کرے، اور ایمان کے حکموں کو فنا کرے، ولی ہوتا ہے لیکن عند اللہ و عند الرسول ایسا شخص شیطان ہے، اس عزیز حکیم نے حق سے باطل کو مٹانے کیلئے، سچ سے جھوٹ کو نابود کرنے کیلئے، نار کو نور سے بجھانے کیلئے، اس غفلت کی نیند سے جگانے کیلئے، صراطِ مستقیم پر چلانے کیلئے، مشعلِ ہدایت کو بجھانے کیلئے کیا ہی اچھا فیصلہ دیا ہے:

"قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" [آل عمران:۳۱]

"اے محبوب! تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔"

یعنی اے میرے حبیب! ان لوگوں سے فرمادو، سنادو، سمجھا دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، اس کے محب بنتے ہو، یعنی اپنے زعم میں بساطِ محبت پر عشق کا دم بھرتے ہو تو آؤ میری اتباع کرو تا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے۔

اس سے ثابت ہوا کہ سوائے اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہماری محبت محل قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر سکتی۔

کرامت:

کرامت اکرام من اللہ ہے جو اللہ کے بندوں سے کئی وجوہات کی بنا پر ظہور ہوا کرتا ہے، اور کئی نوع پر منقسم ہے: اضطراری، اختیاری، استقراری۔

جب کسی مصیبت کے وقت مومن کو اضطرار واقعہ ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے اور مطابق:

"اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ" [النمل: ۶۲]

"یا وہ جو لاچار کی سنتا ہے جب اسے پکاریں اور دور کر دیتا ہے برائی اور تمہیں زمین کا وارث کرتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ اور خدا ہے بہت ہی کم دھیان کرتے ہو۔"

ہر مضطر کی دعا قبول ہو جاتی ہے، اس کی التجا رد نہیں کی جاتی اور اس کو تسکین و قرار دینے کیلئے مناسب مدد دی جاتی ہے، حسب استعداد اس کرامت کا ظہور من اللہ ہوا کرتا ہے، اولیائے کرام کے ہاتھوں بڑے بڑے زبردست کارنامے معروف ہیں لیکن ان کے ظہور میں مطلق ان کا دخل نہیں ہوتا، محض اکرام من اللہ ہی ہوا کرتا ہے اور یہ اس محبت کے صلہ میں سے ہے جو مولیٰ کریم کو اپنے بندوں کے ساتھ ہوتی ہے، فرمان مولیٰ کریم ہے:

"نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ" [حٰمٓ السجدة: ۳۱]

"ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔"

دوسری کرامت اختیاری ہے اور یہ دو وجہ پر ہے، ایک اختیار من اللہ سے ہے اور دوسری تصرف بذات خود سے جس میں مطلق اختیار ہے، اختیار من اللہ انبیائے کرام کے لئے خاص ہے، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا اور شیاطین (جن وغیرہ) مسخر کرنے کے بعد فرمایا:

"هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ"[ص: ۳۹] "یہ ہماری عطا ہے اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔"

جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں اور حساب کا ڈر بھی نہ رکھیں، اور مومنین میں سے بھی کسی قدر ایسے اختیار کا دیا جانا روا اور ثابت ہے، چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کا تخت منگانے کیلئے اپنے درباریوں سے خطاب فرمایا کہ کون اسے جلد از جلد میرے پاس لاسکتا ہے؟ تو:

"قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ" [النمل: ۴۰] "اس نے عرض کی جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے آپ کی بارگاہ میں پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کروں گا۔"

حضرت غوث علی شاہ صاحب پانی پتی قدس سرہ "تذکرہ" میں فرماتے ہیں کہ:

"جب ہم بارادہ حج بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اس کے معلم سے ہم نے پوچھا کہ:" میاں! کبھی کوئی مرد حق بھی ملا ہے۔" اس نے کہا کہ:" ہاں دو مرد ملے ہیں، ایک تو اس زمانہ میں تشریف لائے تھے جب میں خوردسال تھا اور میرا باپ معلم تھا، اور دوسرے اب ملے ہیں۔" ہم نے کہا کہ: "بھائی! ان کو تم نے کیونکر پہچانا تھا؟" کہا کہ:" جس وقت ہمارا جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو ایک فقیر ڈبوسا سے نکل کر میرے والد کے پاس آن پہنچا اور کہنے لگا کہ:" اس میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے، بھلا منزل مقصود پر کب پہنچیں گے۔" انہوں نے جواب دیا کہ:" سوا مہینہ میں۔" اس نے کہا:" یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ہمارا جی متلاتا ہے، اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کبھی سوار نہ ہوتے۔" والد نے کہا:" صاحب! میں مجبور ہوں، اگر آپ کچھ ہمت رکھتے ہوں تو زور لگائیے تا کہ جہاز ساحل جدہ پر جالگے۔" فقیر نے کہا:" اچھا یہ بتلاؤ پہلے کوئی بندرگاہ آتی ہے؟" کہا" عدن" پوچھا" پھر؟" جواب دیا" ضحہ" کہا" اور" جواب دیا" حدیدہ۔" بولا" اور" کہا" جدہ۔" تب فقیر نے فرمایا کہ" بس لنگر ڈال دو۔" اور خود اٹھ کر ڈبوسا کے اندر چلے گئے، میرے والد نے سمندر کی طرف نگاہ کی تو کنارہ پر چراغ روشن نظر آئے اور جدہ کے آثار معلوم ہوئے، نہایت حیرت ہوئی کہ الٰہی! یہ کیا معاملہ ہے، پندرہ دن تک تو بمبئی سے چل کر کنارہ کا پتہ بھی نہیں لگتا،

ایک خلاصی کو حکم دیا کہ: جلد ہوڑے پر سوار ہو کر جا اور کنارہ کی خبر لا۔'' وہ دیکھ کر واپس آیا اور کہا کہ: ''صاحب! بندرگاہ جدہ آ گیا۔'' والد نے جہاز کو لنگر کروایا اور فقیر کو ڈھونڈا تو کہیں پتہ نہ لگا، اللہ اکبر! بڑا زبردست بزرگ تھا، مگر افسوس ہے پھر اس کی زیارت نہ ہوئی، ہم نے کہا: ''دوسرا کہاں ہے۔'' بولا کہ ''میرے پاس بیٹھا ہے۔'' ہم نے کہا کہ ''تم نے کیونکر جانا؟'' کہا کہ ''مجھ کو ہزارہا آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقرا کی زیارت کی مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا اور مرد خدا کا حال نہ پوچھا، آپ کے سوال سے میں جان گیا، کیونکہ مرد کو مرد ہی پوچھتا ہے۔

اولیاء را می شناسد اولیاء　　دزد را ہم دزد داند بے ریا
غیر جنسیت نمی داند کسے　　می شناسد جنس خود را ہر یکے[1]

لیکن ایسا شخص ابوالوقت یا خضر الوقت ہوا کرتا ہے۔

دوسرا تصرف بذات خود ہے جو کسی حد تک اختیاری ہوا کرتا ہے، اور سرشتی قوت کے تصرف فی الضمیر کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن باوجود طاقت رکھنے کے بھی یہ تصرف بذات خود کو پسند نہیں فرماتے ہیں کیونکہ اپنے حال کو پائے ہوئے ''نزدیکاں رابیشتر حیرانی'' کے تحت میں اتقا کو اختیار کرنے والے ہوتے ہیں، اور چونکہ یہ تصرف بذات خود استدراج کی مانند ہوتا ہے اس لئے ایسے تصرف کو مذموم کہا ہے، اور بندگان خدا نے اس سے اجتناب کیا ہے۔

استدراج:

اے بھائی! وہ ہادی مطلق تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، اس قادر مطلق خالق موجودات نے انسان کو جامع الصفات بنایا ہے اور اس قوت کو طاقت اور ہمت دو حصوں پر منقسم فرمایا ہے۔ طاقت جسمانیت سے علاقہ رکھتی ہے اور ہمت روحانیت سے، اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ'' [2]

۱۔ اولیاء اللہ کو اولیاء اللہ ہی پہچانتے ہیں اسی طرح بغیر شک کے چور دوسرے چور کو جان جاتا ہے۔ بس غیر جنس دوسرے کو نہیں جان سکتا، اور اپنی جنس سے ہر ایک کو پہچان لیتا ہے۔

(۲) اور البتہ بے شک بزرگی دی ہم نے آدم کو۔

اور هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا [1] کا ارشاد فرما کر "سَخَّرَلَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" [2] وغیرہ یعنی سب کی سب مخلوق اور اس کا مفاد انسان ہی کی خاطر بنایا اور اس کو اپنے لئے، چونکہ اس بیان میں بہت طول ہے اور اس باب میں تفصیل اصل مقصود کے خلاف کی مقتضی ہے، اس لئے اختصار کے راستہ اصل کی طرف رجوع کرتا ہوں، فرمان ذوالجلال والاکرام ہے کہ:

"وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُالسَّبِیْلِ وَمِنْھَاجَآئِرٌ" [النحل: ۹]

''اور او پر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی ان میں سے کج ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

"اِنَّ ھٰذَاالْقُرْآنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ" [بنی اسرائیل: ۹]

''بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔''

اور یہ قَصْدُاالسَّبِیْلِ اور اصل مقصود "لَامَقْصُوْدَاِلَّااللّٰہُ لَا مَوْجُوْدَاِلَّااللّٰہُ لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ" [3] ہے لیکن سعی انسانی کئی وجہ پر ہے، تو مطابق فرمان لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّامَاسَعٰی [4] کے جدھر انسان سعی کرتا ہے، ذات پاک اس کو ادھر ہی چلنے دیتے ہیں اور ''نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی'' [5] کی سنت اللہ کے مطابق ادھر ہی چلاتے ہیں، انہی جائر میں سے ایک کج راہ قبولیت خلق ہے جس کو بزرگان دین نے لوہے کے زنار سے تعبیر کیا ہے، یہ بہت بڑا احجاب ہے، بلکہ شیطانی تصرف کا آلہ اور بہت بڑی گمراہی کا سبب، نفس کا سرمایہ، نہ ٹلنے والی بلا اور شہد میں ملی ہوئی زہر ہے جو اخلاص کی زندگی کو ہلاک کر دینے والی اور اعمال صالحہ کو مثل خس وخاشاک کے جلا دینے والی ہے، اسی مرض کے مبتلا "مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاوَ زِیْنَتَھَا" [6] کے فریفتہ نُوَفِّ

١۔ وہی ذات پاک ہے جس نے پیدا کیا ہے واسطے تمہارے جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ۔

٢۔ مسخر کیا واسطے تمہارے سورج کو اور چاند کو۔

٣۔ اللہ کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

٤۔ نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جو کچھ کوشش کرے۔ ٥۔ پھیرتے ہیں ہم اس کو جدھر وہ پھرتا ہے۔

٦۔ جو شخص دنیا اور اس کی زینت کا ارادہ کرے۔

نُوَفِّ اِلَیْھِمْ اَعْمَالَھُمْ (ہم اس میں ان کا پورا پھل دے دیں گے) سے بے خبر اور شیدا، میدان دنیا و مافیہا کے شجر اور ثمر تک پہنچنے والے سخت ترین مجاہدات سے نفس کا خلاف کرتے ہیں اور اسی راستہ روحانیت کو قوت دینے والے ہوتے ہیں چونکہ مولیٰ کریم نے انسان کی سرشت میں روحانیت کا دارومدار اسی پر رکھا ہے، اس لئے ایسے شخص بھی مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

"وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِنْ حَیْثُ لَایَعْلَمُوْنَ، وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ"

[الاعراف:۱۸۳]

''اور جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں جلد ہم انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جائیں گے جہاں سے انہیں خبر نہ ہوگی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے۔''

غیرت کی رو سے ہی سہی کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتے ہیں اور خلقت کے کاموں میں تصرف رکھتے ہیں، چنانچہ نقل ہے کہ:

''دہلی میں ایک ہندو فقیر تھا، سلب مرض میں بہت کمال رکھتا تھا، اتفاقاً ایک بار سلطان جی سخت مریض ہوئے، اپنے مریدوں کو فرمایا کہ مجھ کو اس کافر کے پاس ہرگز نہ لے جانا جب مرض کا غلبہ ہوا اور حضرت بیہوش ہو گئے تو مرید گھبرائے، ناچار اس کے پاس حضرت کو لے گئے، اس نے فوراً مرض سلب کر لیا، آپ ہوش میں آئے اور دیکھا کہ اس کافر نے سلب مرض کیا ہے، اس کو کچھ انعام دینا چاہیے، فرمایا کہ تم کو یہ کمال کس طرح حاصل ہوا؟ اس نے کہا کہ نفس کے خلاف کرنے سے۔ آپ نے فرمایا کہ بھلا تمہارا نفس اسلام کو قبول کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، فرمایا کہ پھر یہ بھی تو خلاف نفس کرو، وہ اول تو خاموش ہوا پھر اسلام لایا، اور حضرت نے اس کو دین تعلیم فرمایا۔''

یہی استدراج کا اصل ہے، اور مسمریزم بھی اسی شجر کی شاخ ہے، جاہل لوگ اس کو بھی ولایت کی مانند یا اس کا کچھ حصہ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن کرامت محض اکرام من اللہ اور محبت الٰہی کی وجہ پر ہے اور استدراج اس کے برعکس مردودیت کی وجہ سے ہے:

"وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَالْاِسْلَامِ دِيْنًافَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَفِى الْاٰخِرَةِمِنَ الْخٰسِرِيْنَ"
[آل عمران:۸۵]

''اور جواسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں زیاں کاروں سے ہے۔''

دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، نور اور نار کا سا حال ہے، کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَمَايَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ،وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَاالنُّوْرُ،وَلَاالظِّلُّ وَلَاالْحَرُوْرُ"
[الفاطر:۱۹ تا ۲۱]

''اور برابر نہیں اندھا اور بینا اور نہ اندھیرا اور اجالا، اور نہ سایہ نہ تیز دھوپ۔''

علم غیب

"هُوَاللّٰهُ الَّذِىْ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِهُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ"
[الحشر:۲۲]

''وہی ہے اللہ جو نہیں کوئی معبود مگر وہ، جاننے والا ہے پوشیدہ کا اور حاضر کا، وہی ہے بخشش کرنے والا مہربان۔''

اصول نزول کے مطابق یہ بھی ہمارے حال ہی سے عبارت ہے، ورنہ خداوند کریم کے لیے کوئی غیب نہیں ہے، بلکہ یہ اس خالق کائنات کی شان کے لائق ہی نہیں، تمام مخلوقات سے جو ہمارے لیے ظاہر ہے اور جو مخفی ہے، فعل کے رو سے یا حال کی وجہ پر اس سب سے علیم ہے، اور جس قدر وہ کسی کو عطا کرے، عنایت کرے، اسی قدر وہ اس کا جاننے والا ہوتا ہے اور یہ کئی نوع پر منقسم ہے:

جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خلقت فرمایا اور ملائکہ کو متنبہ کرنے اور اپنی قدرت کاملہ کے ظہور کے لیے علم لدن سے ان کے قلب اطہر میں القا کیا تو انہوں نے موجودات کے نام بتلا دیئے۔

یہ وہ عبارت ہے جس کے لیے کوئی لفظ نہیں، اور یہ وہ کلام ہے جس کے لیے کوئی صورت نہیں، اور یہ

وہ علم تھا جس کے لیے ظاہری تعلیم کی احتیاج نہیں، محض القائے ربانی تھا جس کو علم لدُن کہنا روا ہے، اور دلیل اس کی شاہد ہے کہ اگر کوئی ظاہری مروجہ تعلیم سے یا کسی کتاب سے، یا حفظ کی وجہ سے (جس میں محض کلام بغیر عبارت ہی کی احتیاج) ہوتی، تو آج تمام بنی آدم کی ایک زبان ہونا چاہیے تھی، لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے، اہل عرب کے لیے فارسی زبان بمنزلہ غیب کے ہے، لیکن عربی لسان ان کے لیے ظاہر، اسی طرح ہر زبان مثلاً ہندی، پنجابی، سندھی، انگریزی، افریقی، امریکی، عبرانی، وغیرہ سب ایک دوسری سے مختلف ہیں، اور ہر ایک ملک کے لیے دوسرے ملک کی زبان بمنزلہ علم غیب ہے، اور اس عزیز الحکیم نے اس اختلاف السنہ کو اپنے نشانات سے تعبیر فرمایا ہے، کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ" [الروم: ۲۲]

"اور نشانیوں اس کی سے ہے پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا اور اختلاف زبانوں تمہاری کا اور رنگوں تمہارے کا، تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے عالموں کے۔"

خواہ انسان جہالت کے سبب سے انکار ہی کرے، اس میں کلام نہیں کہ انسان کے علم کی ابتدا مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۱؎ سے ہوئی ہے، جیسے اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام نے اس بے بہا دولت سے جس کو ذوالجلال والاکرام نے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ۲؎ سے نامزد کیا ہے، حامل ہوتے ہی موجودات کے نام بتادیئے، یہ علم موجودات سے ہے جیسا کہ ہر فرد بشر مختلف زبانوں اور ناموں سے واقف اور عالم ہے، اور اس موجودات میں سے کسی چیز کی بھی علم غیب کی طرف نسبت نہیں اور وہ اس لیے کہ ان اشیاء کا غیب اس علم کے ذریعے جس کو مروجہ صورت میں مادۂ انسانی کہنا درست ہے ظاہر ہو چکا ہے۔

اس موجودات سے استعدادِ انسانی کے راستہ عقل کے میدان میں عالم محسوسات کا علم ہے، جیسے گرمی سردی اور تمام اشیاء کے اثرات کا اخذ کرنا اور تجربہ کے بساط پر ان تاثیرات کے فعل کا معائنہ اور ان کی طاقت کا تجربہ اور عقلی تجربات سے فائدہ حاصل کرنا ہے، کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

۱۔ اپنے پاس سے علم۔ ۲۔ پھونکا میں نے اس میں اپنی روح سے۔

"اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَلَکُمُ الْبَحْرَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْامِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ " [الحاثیہ:۱۲]	"اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے مسخر کیا واسطے تمہارے دریا کو تا کہ چلیں کشتیاں بیچ اس کے ساتھ حکم اس کے کے اور تا کہ ڈھونڈو فضل اس کے سے اور تا کہ تم شکر کرو۔"

پانی اور معدنیات کی رگڑ سے برقی طاقتوں کا عمل معروف ہے، بے تار برقی سے خبروں کا دور دراز سے تصرف فی زماننا اظہر من الشمس ہے، جس کی تفصیل اس کتاب میں لاحاصل ہے، سوائے اس کے کہ ان محسوسات اور تجربات سے ان کی تاثیرات وافعال کے علم سے معلومات کا حاصل ہونا ثابت ہے، جو محسوسات سے معلومات کا حفظ دماغ میں اخذ کرنا ہے، گویا موجودات سے محسوسات اور محسوسات سے معلومات تک کا تو علم سیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ ان کی حقیقت ہی یہی ہے، لیکن معروفات کے میدان میں عقل کا ادراک مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

جن اشخاص کی سعی اور ہمت کی دوڑ ان عوالم تک محدود تھی اور اس طاقت اور استعداد کا فائدہ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا [۱] ہی پر محدود رہا، وَھُمْ یَحْسِبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا [۲] کی غفلت اور جہالت نے ان کے عقلوں کو ڈھانپ لیا، عالم معروفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہی کو انتہائے علم اور مقصود جان لیا، نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی [۳] کی عادت الٰہی نے ان کو مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ [٤] کا مرتکب کر دیا اور مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ [٥] کی دولت سے محروم رہ ہو گئے۔

اے بھائی! خدائے کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے اور اپنے فضل وکرم سے اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی [٦] کی

۱۔ جن لوگوں کی کوشش زندگانی دنیا ہی کے حصول میں گم ہوگئی۔ ۲۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ ۳۔ پھیرتے ہیں ہم اس کو جدھر وہ پھرتا ہے۔ ٤۔ جو کوئی دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرے، دیتے ہیں ہم اس کو اس سے اور نہیں ہے اس کیلئے آخرت میں کچھ حصہ۔ ٥۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اس کی کھیتی میں اس کیلئے مزید زیادتی کرتے ہیں۔ ٦۔ یقیناً ہمارے ذمے ہے ہدایت دینا۔

رحمت سے اصل مقصود کی طرف راستہ دے، اہل دنیا تو درکنار، اہل دین کا علم بھی جو ظاہر پر حکم رکھتا ہے ، عالم معلومات سے تجاوز نہیں کرسکتا، گو اجر کے لحاظ سے مغفرت اور عملی جامہ کی رو سے نعمت کا سبب ہے، مگر اسی کو معراج کمال سمجھ لینا اصل مقصود سے محجوب رہنے کے باعث ہے، طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جو لوگ اسی علم کو جو محض نظام دنیا اور ثواب الآخرہ تک محدود ہے لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ [۱] کی وجہ پر اس سے آگے کے منکر ہو رہے ہیں، جو سخت نقصان کا باعث اور اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَكْبَرُ [۲] کا مصداق ہے۔

عزیزا! اس سے آگے عالم معروفات کا علم حجابات کے دور ہونے کے سوا نہیں ہے جس کا حصول دائمی فکر صحیحہ اور فضل ایزدی کے بغیر ناممکن ہے، اور جس کا توسل بموجب ارشاد ایزد متعال فَسْـئَـلْ بِـهٖ خَبِيْرًا [۳] کاملان و عارفانِ خدا کے خاکِ زیر پا ہونے اور صحیح اتباع کرنے کے سوا محال ہے۔

علم انوار است اندر دل رجال نے زراہِ دفتر و نے قیل وقال
علم در سینہ بسینہ آمدہ علم بے کینہ خزینہ آمدہ
علم درسی نہ بود، در سینہ بود

عالم معروفات کا علم سراسر رویت اور عالم معلومات کا علم محض ظن، تو اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [٤] کے مطابق جب رویت کا حصول ہو، ظن باقی نہیں رہتا، اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص نارنگی (سنگترہ) کے علم کا طالب ہے اور اس کا بالتفصیل علم حاصل کرتا ہے، کہ سنگترہ ایک پھل ہے، جس کا درخت درمیانہ، برگ درمیانہ لمبوترے، پھول سفید، اور خام پھل سبز ہوتا ہے، جب پختہ ہوتا ہے تو گہرا زرد رنگ اختیار کر لیتا ہے، جھال نرم سی اور اس کے اندر آٹھ نو پھانکیں زرد رنگ، رس بھریاں ایک دوسری سے ملحق ہوتی ہیں، جن کا ذائقہ ترش و شیریں ہوتا ہے، وغیرہ سب صفات سے عالم ہو جاتا ہے، لیکن دوسرے شخص کو نارنگی کے درخت کے پاس لے جاتے ہیں، اور ظاہری علم سے ایک سبق یا ایک لفظ بھی نہیں پڑھایا جاتا، صرف ایک سنگترہ درخت سے توڑ کر اس کو کھلا دیا جاتا ہے، اب پہلا عالم ہے اور یہ دوسرا عارف، عالم کے

۱۔ نہ گھیرتے وہ اس کے علم سے۔ ۲۔ علم سب سے بڑا حجاب ہے۔ ۳۔ اس کے متعلق کسی خبر والے سے سوال کر۔ ٤۔ بے شک ظن نہیں مستغنی کرتا حقیقت سے کچھ بھی۔

متعلق احتمال ہے کہ بجائے سنگترہ کے کھٹے یا مالٹے کو سنگترہ سمجھ لے ،لیکن دوسرا شخص جو سنگترہ سے عارف ہو چکا ہے ، یہ غلطی نہیں کھا سکتا ،اس لیے بلاشبہہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف عالم ، عارف نہیں ہوتا لیکن عارف عالم ہوتا ہے۔

ہر عالم کا حامل روح ہی ہے ، جو حیاتی کا اصل ، وجودی دائرے کا مرکز ، ہر فرع کا اصل اور ہر فعل کا متصرف ہے ، گو یہ وجود اس کے علم کا مظہر ہے لیکن اس کے چہرے کا نقاب اور حجاب بھی ہے ، جس حجاب میں محجوب ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے ، مثلاً موجودات کا علم اس کے لیے حجاب اکبر ہے ، اور عالم محسوسات جو موجودات سے بالاتر ہے ، موجودات کے حجاب سے مبرا ہے ، اسی طرح معلومات کے لیے محسوسات ایک حجاب ہے باوجود ایک دوسرے سے متعلق ہونے کے ان عالموں کو آپس میں کوئی نسبت نہیں ، لیکن جب بفضلِ الٰہی معروفات کے میدان میں قدم زن ہوتا ہے تو موجودات ، محسوسات اور معلومات کے حجابات سے خلاصی پانے والا ہوتا ہے ، تب مَاتَشَآءُ وْنَ اِلَّآاَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ [1] کی رضا کے راستے عالم امر سے مطلع ہو کر اس عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ [2] سے اپنی ذات کو پہچاننے والا مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْعَرَفَ رَبَّهٗ [3] کے راز کو پانے والا وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَاتُبْصِرُوْنَ [4] کی بصارت سے بینا ہو جاتا ہے ، چونکہ اس میدان یعنی عالم امر سے جو آمر کے امر سے وابستہ ہے عارف ہوتا ہے ، گو اس کے حال اور کیفیت کا بیان از حد مشکل ہے تاہم اتنا کہ ایسے شخص کی نظر میں ہر مخلوق کا فعل ، فعلِ خداوندی ہی ہوتا ہے ، اور وہ اس لیے کہ جب حجابات دور ہو جاتے ہیں تو اس کی نظر میں مخلوقات کے حجاب بھی نہیں رہتے ، اور یہ عبارت حال کے غلبہ کے رو سے ہے ، اپنے حال کے مطابق نفی حجاب اور اثبات امر و فعل کا معائنہ کرنے والا ہوتا ہے اور

حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

کے دریا میں مستغرق ، گو لاکھوں میں کا کوئی ایک اس مقام تک پہنچتا ہے ، لیکن یہاں تک پہنچنے والوں میں سے اکثر اس مقام ہی پر ڈیرہ ڈال دیتے ہیں ، اور اسی کو معراج کمال سمجھ لیتے ہیں ، اور وہ اس لیے کہ

---

١ ـ تم کیا چاہو مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ٢ ـ علم کتاب میں سے۔ ٣ ـ جس نے پہچانا ، اپنے نفس کو پس بے شک پہچانا اپنے رب کو۔ ٤ ـ اور بیچ جانوں اپنی کے کیا تم دیکھتے نہیں؟

ذاتِ معلیٰ نے اس فعل کو جو محض امرالٰہی یعنی عالم امر سے ہے، روح (جس کو مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ سے تعبیر کیا ہے) کی طرف معرفت کو اجرا رکھا ہے، عین فعل ذات بلکہ عین ذات ہی سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ بھی ایک حجاب ہی ہے، مشیتِ ایزدی اور فضل ربانی سے جن کا یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے وہ فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ[1] کے مطابق سعی اور ہمت کے قدموں سے محبت کی وادی میں سرگردان پھرنے والے اور محبوب کی طلب میں جان پر کھیلنے والے ہوتے ہیں، اگر مشیت ایزدی ان کی یاوری کرے تو لقائے الٰہی کی دولت سے مشاہدہ کی روئت نصیب ہو جائے، تو بعید از رحمت نہیں ہے اور یہی انسان کے علم وعرف کی انتہا ہے، اس سے آگے اس کی رسائی نہیں۔

اب یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، جس کی سمجھ اور حل انسانی طاقت سے باہر ہے کہ علم کا حصول موجودات سے شروع ہو کر لقائے الٰہی ومشاہدہ لامتناہی تک بس ہے، اور علم کے معنی کسی شے سے واقف ہونے اور اس کے جاننے کے سوا نہیں ہیں، تو قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے تحت بلقیس کا تحت لانے میں ارشاد مولیٰ کریم ہے:

"قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ"

[النمل: ۴۰]

"کہا اس شخص نے کہ نزدیک اس کے تھا علم کتاب سے میں لے آؤں گا تمہارے پاس اس کو پہلے اس سے کہ پھر آوے طرف تمہاری نظر تمہارے پس جب دیکھا اس کو ٹھہرا ہوا نزدیک اپنے کہا یہ ہے فضل، پروردگار میرے کے سے۔"

اتنی مسافت سے عرش عظیم کی روئت تو اک بڑے علم کشف سے ممکن ہے۔ لیکن اس کو آنکھ جھپکتے میں لاکر حاضر کرنا کسی علم کے عمل کا نتیجہ خلاف عقل وادراک ہے۔ جس کا انحصار دو وجہ پر ہے۔ ایک تو اتنا بڑا کہ اس کو عرش عظیم فرمایا ہے، اٹھانا اور آناً فاناً لے آنا اور دوسرا اس کا حفاظت اور حراست شاہی سے نکالنا۔

۱۔ پس دوڑو طرف اللہ کی۔

مَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ ١ جواب اور حل اس کا اس طرح ہے کہ سب طاقتوں کا مرجع ذات باری تعالیٰ کی طرف ہے اور ان کا فعل اسی کی جانب سے روا ہے۔ اور یہ بھی دو نوع پر منقسم ہیں۔ ایک تو وہ طاقت ہے جو انسان کی طرف اپنی عطا سے دو یعت فرمائی ہے جس میں اس کو کسی قدر اختیار دیا ہے۔ اور اس میں یہ حسنات وسیئات کے رو سے مختار ہے، اور ان کی جزا وسزا کا مستحق اور حامل۔ مثلاً حیاتی جو محض عطائے الٰہی ہے۔ لیکن ودیعت ہونے کے بعد انسان کیلئے ذاتی کا حکم رکھتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہ ہوگی۔ خواہ یہ اس کے صرف کرنے میں کافر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ دوسرا فعل جو ذات باری تعالیٰ کے لائق ہے جس میں کسی فرد بشر کو طاقت نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کے تصرف کی مجال۔ اور وہ تصرفات روحی کے متعلق ہے۔

گو ہر فعل نیک وبد کا مقتضی روح ہی ہے۔ لیکن بارشاد رب العالمین: مَآاَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍفَمِنَ اللّٰهِ وَمَآاَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍفَمِنْ نَّفْسِکَ ٢ کی تقسیم لازم ہے۔ مِنْ بَعْدِبِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ٣ کے باعث اور اٰمَنُوْاوَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ٤ کی وجہ پر حسب ارشاد ذوالجلال والاکرام یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ٥ غضبی اور رحمی شان سے روح کی جانب متصرف ہونا مطابق قرآن مجید سنت اللہ جاری ہے۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ٦ فی الدنیا۔ اور یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ٧ فی الاخرۃ۔ اور یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ٨ کا نتیجہ قرب خداوندی اور یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ ٩ کے سایہ میں تَخَلَّقُوْابِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ١٠ سے حجاب کا دور کرنا ہے جو اصل مقصود ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ حدیث قدسی کسی امر کی دلیل ہے:

١۔ نہیں ہے توفیق مجھے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ۔ ٢۔ جو پہنچے تجھ کو بھلائی پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تجھے برائی پس وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے۔ ٣۔ بسبب اس چیز کے کماتے ہیں۔

٤۔ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔　٥۔ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

٦۔ پس دوری ہے واسطے قوم ظالموں کے۔　٧۔ اس دن یقیناً وہ حجاب میں ہوں گے۔

٨۔ ہدایت دیتا ہے طرف اپنی اسے جو جھکتا ہے۔

٩۔ محبت کرتا ہے وہ اس سے اور محبت کرتے ہیں وہ اس سے۔

١٠۔ اپنے اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق کی طرح بناؤ۔

"وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَاتَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَایَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحْبِبْتُهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا (فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَبْطِشُ وَبِیْ یَمْشِیْ ۱) وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَاِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَمَاتَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَافَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَهُ مَسَآءَتَهٗ وَلَابُدَّلَهٗ مِنْهُ رواه البخاری"

''اور روایت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص کہ ایذا دے میرے ولی کو پس بے شک خبردار کرتا ہوں میں اس کو ساتھ لڑائی کے اور نہیں نزدیکی حاصل کی طرف میری، بندے میرے نے، ساتھ کسی چیز کے کہ بہت محبوب ہو طرف میری، اس چیز سے کہ فرض کیا میں نے اس پر اور ہمیشہ رہتا ہے بندہ میرا نزدیکی ڈھونڈتا طرف میری ساتھ نفلوں کے یہاں تک کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو جس وقت کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو پس ہوتا ہوں میں شنوائی اسکی کہ سنتا ہے ساتھ اس کے اور ہوتا ہوں میں آنکھ اس کی کہ دیکھتا ہے ساتھ اس کے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے ساتھ اس کے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے ساتھ اس کے (پس میرے ساتھ سنتا ہے اور میرے ساتھ دیکھتا ہے اور میرے ساتھ پکڑتا ہے اور میرے ساتھ چلتا ہے) اور اگر مانگتا ہے مجھ سے یہ بندہ البتہ دیتا ہوں میں اس کو اور اگر پناہ پکڑتا ہے ساتھ میرے البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو اور نہیں توقف کرتا اور تردد کرتا میں کسی چیز سے کہ کرنے والا ہوں میں اس کو، مانند تردد میرے کے، قبض کرنے جان مومن کے سے، ناخوش رکھتا ہے وہ موت کو اور حال یہ ہے کہ میں ناخوش رکھتا ہوں ناخوشی اس کی کو اور چارہ نہیں اس کو مرگ سے روایت کی یہ بخاری نے۔''

۱۔ خطوط کے اندر کے کلمات ایک دوسری حدیث کے ہیں جو الگ سند سے مروی ہیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اس ذات پاک کا ہاتھ پاؤں بنانا یَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ [1] کسی میں حلول کرنا تو درکنار ایسا گمان بھی کفر بلکہ شرک مطلق ہے۔ ہاں صوفیائے کرام کے نزدیک یہ فنافی اللہ سے عبارت ہے۔ اور اس سے مقصود صفات انسانیہ کے فنا ہونے اور حجابات کے دور ہونے اور صفات خداوندی سے متصف ہونے کی رو سے ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"صِبْغَةَاللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةًوَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ" [البقرۃ:۱۳۸]

''رنگ دیا ہے ہم کو اللہ نے، اور کون ہے بہتر خدا سے رنگ میں۔ اور ہم اسی کے لئے عبادت کرنے والے ہیں۔''

بمصداق:

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ ازحلقوم عبداللہ بود [2]

اس مقام پر عبداللہ کی حقیقت اپنے رب کریم سے واحد ہو جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات شریف [3] میں فرماتے ہیں کہ ''اس مقام پر انسان صفات بشریت سے نکل کر صفات الٰہیہ سے متصف ہو جاتا ہے۔'' یعنی کہ انسان کا اختیار مطلق اٹھ جاتا ہے۔ اس کے ارادے فنا ہو جاتے ہیں اور مامور من اللہ ہو جاتا ہے۔ ولی کے لئے یہ مقام محفوظات سے ہے اور مرسلین کے لئے معصومیت سے حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''مولیٰ کریم کی صفات ذاتیہ سے انسانی صفات ذاتیہ کو ایسا اتحاد ہے جس میں تمیز دشوار ہے۔''

عزیزا! یہ ارشادات بندگان خدا تیری تسلی کے لئے مرقوم ہیں، ورنہ ارشاد مولیٰ کریم فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا [4] اس بات کی دلیل ہے کہ مولیٰ کریم نے انسان کو اپنی صفت پر تخلیق کیا ہے۔ اور

۱۔ پناہ پکڑتا ہوں میں ساتھ اللہ تعالیٰ کے، اس سے۔ ۲۔ اس اللہ کے بندے کا فرمایا ہوا خود خدا کا فرمایا ہوا ہی ہوتا ہے اگرچہ اللہ کے بندے کے حلق سے فرمان صادر ہو رہا ہوتا ہے۔

۳۔ دفتر سوم، مکتوب نمبر ۵۳

٤۔ بناوٹ خدا کی وہ ہے جس پر بنایا انسان کو۔

صَبْغَةَ اللّٰهِ [1] اس پر شاہد ہے کہ انسان زکیٰ حاصل ہونے کے بعد خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اب علم جو ذات باری تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سے ایک صفت بالذات ہے، انسان کے علم کی تاریکی کو دور کر کے اپنے علم کا نور اس کے صدر میں ثبت کر دیتے ہیں۔ تب اس علم سے جو علم حقیقی ہے اور سب علوم اس اصل کے بمنزلہ ظل اور فرع کے ہیں، ایسا فعل ظہور میں آتا ہے۔

پہلے روح کے بیان میں گزر چکا ہے کہ ہر صفت ذاتیہ اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے بلکہ واصف کل لامحدود ہے، اس لئے یہ علم کسی علم کی مانند نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے صفات اور طاقت کا مخلوق کی طرف نسبت کرنا سراسر جہالت ہے۔ کیونکہ ان صفات کا فعل سب کا سب من اللہ ہے اور یہ صراط المستقیم ہے۔ لیکن یہ اصول نزول ہے کہ جب اصل فرع کی طرف فاعل ہو، اسی کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ [2] سے مرشد ہے، جیسا اوپر گزر چکا ہے۔ گو حقیقت فاعل حقیقی اور نسبت اصل اور حق کی طرف ہے لیکن حکم اس مومن کی طرف منسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو حضرات حدث اور قدم کا فرق نہیں جانتے اور فرع سے اصل کو نہیں پہچانتے۔ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اسی بناء پر قرآن مجید جو کلام الٰہی اور صفات ذاتیہ سے ہے، جب اس کا حکم قطعہ قرطاس پر حرفوں اور لفظوں کی طرف منسوب ہوا، تو مخلوق کے قائل ہوئے۔

اس راقم کے وقت میں بھی حلف بالقرآن پر علمائے دین میں تقاضا ہوا، مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ عنوان ''حلف بالقرآن'' کے تحت اس کتاب کے آخر میں کچھ تحریر کیا گیا ہے، تاکہ اس سے مقصود حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے خاص علم سے بینا کرے، جس طرح علم کو کلام کے لباس سے ملبوس کرنے کیلئے اسباب مخلوق کو ملازم کیا ہے، اسی طرح اپنے علم کو قلوب انسانیہ کی طرف ودیعت فرمانے کیلئے ملفوف بنایا ہے۔ اب ذرا عدل وانصاف کے ترازو میں نور ایمانی سے موازنہ کرنا بعید از ہدایت نہ ہوگا کہ مرسلین کا حال اور تعلق اس ذوالجلال والاکرام کے ساتھ کیا ہوگا؟ اس میں کلام نہیں کہ مرسلین کے حال سے

١۔ رنگ ہے اللہ کا۔ ٢۔ بولا یہ شخص کہ جس کے پاس کتاب سے علم تھا۔

مومن تو در کنار خاص اولیاء اللہ کو بھی کوئی علم نہیں ہے اور اس کی مثال دریا کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی سی ہے۔ عجب یہ ہے کہ باوجودیکہ برادران اسلام اس میں مناظرے بلکہ مجادلے کیلئے یہاں تک کمربستہ ہیں کہ الامان۔ کیا انہوں نے ارشاد مولیٰ کریم **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ** (اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو اللہ کے بارے بغیر علم کے جھگڑا کرتے ہیں) کو مطالعہ نہیں کیا ہے؟ یا حبط اعمال (اعمال ضائع ہونے) سے بے خوف ہو رہے ہیں، یا انہوں نے خداوند کریم سے اس کی صریح سند پکڑ لی ہے؟

اے بھائی! یہ معنی جو اوپر بیان ہو چکے ہیں، یہ نکتۂ عبد پر بس ہیں اور یہی عقیدہ اس کیلئے کافی ہے۔ اگر اس سے بڑھ کر کوئی عزیز مرتبہ ہوتا تو لازم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر فائز ہوتے۔ اس لئے اس سے بڑھ کر کوئی درجہ ہی نہیں۔ **فَهِمَ مَنْ فَهِمَ** دیکھو فرمان مولیٰ کریم:

"**اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ**" [الفتح: ۱۰]	"تحقیق وہ لوگ کہ بیعت کرتے ہیں تجھ سے، سوائے اس کے نہیں کہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ ہاتھ اللہ کا ہے اوپر ان کے ہاتھ کے۔"

کی حقیقت کیسی واضح ہے جس کو اپنے عبد کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عبارت فعل خداوندی کی طرف منسوب ہے جو غیر کے فعل کی نفی پر دلالت کرتی ہے جس طرح کہ عام مومنوں کیلئے فرمایا **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** یعنی نہیں قتل کیا تم نے ان کو ولیکن اللہ نے قتل کیا ہے ان کو۔

جواب:

اس میں کلام نہیں کہ یہ واقعی فعل مومنین کی نفی ہے کہ یہ تمہارا فعل نہیں۔ بلکہ یہ توفیق من اللہ ہے اور خدا ہی کے حکم سے ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ اس سے وراء ہے اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک تو **يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ** یعنی یہ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ یعنی بظاہر اقرار وعہد جو تجھ سے کرتے ہیں دراصل وہ وعدہ اللہ سے ہے۔ گو دوسری صورت بھی اسی کے مترادف ہے۔ لیکن اس میں ایک بین فرق ہے جو اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ہاتھ پر اللہ جل شانہ کا ہاتھ ہے۔ چاہئے تھا کہ اس جگہ بھی ایسا ہی ارشاد ہوتا کہ تیرا ہاتھ جو ان کے ہاتھ پر ہے وہ تیرا نہیں

ہے، بلکہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن فرمان یہ ہے کہ ہاتھ اللہ کا ہے ان کے ہاتھوں پر، جس سے عبدہ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ ثابت ہو رہی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ذات باری تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے، اور ایسا خیال کرنا شرک ظاہرہ ہے اور مطلق مکابرہ۔ مولیٰ کریم ایسے گمان سے محفوظ رکھیں۔ ہاں، یہ نسبت خاص ہے ذات باری تعالیٰ کی اپنے عبد کے ساتھ۔ جس کی مختصر تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

علم الانسان وعلم الرحمٰن

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر علم کا اصل الاصول اور مرجع وہ ذات باری تعالیٰ ہے، اور ہر قسم کے علم کا حصول من اللہ ہی ہے۔ فرمان علیم حکیم ہے:

"اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ" [العلق:۳، ۴، ۵]

"پڑھ اور رب تیرا بہت کرم کرنے والا ہے جس نے علم دیا ساتھ قلم کے، علم دیا انسان کو جو کچھ کہ نہیں جانتا تھا۔"

کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا علم رب العالمین کی طرف سے عطائی ہے، اور مولیٰ کریم کا علم ذاتی، مولیٰ کریم کا علم کل اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا [۱] کی تعریف سے معروف ہے اور انسان کا علم جزوی اور محدود، اور یہ کسی حد تک درست ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ حصول من اللہ میں سے جو کچھ بھی انسان کو حاصل ہوا ہے وہ اس کے ضمیر میں ذاتیہ کا حکم رکھتا ہے۔ کیا اس علم اور حصول میں ذات معلیٰ اور انسان کی مساوات ہے یا نہیں؟ مثلاً کلام کی رو سے قرآن مجید میں سے موجودات اور رب العالمین نے کلام اور معانی کے لحاظ سے جس قدر علم انسان کو سمجھایا، بعد جاننے اور پہچاننے کے انسان اور رحمٰن کے علم میں کوئی فرق نہیں ہے؟ لیکن یہ حقیقت کے خلاف، اصل معانی کے برعکس بلکہ ظاہر مکابرہ اور سراسر شرک ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک تو کسی حالت میں بھی پروردگار عالمیاں کے ساتھ کوئی مساوات ومماثلت کا ہونا ناممکن

۱۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے گھیر رکھا ہے ہر چیز کو علم سے۔

اور ممتنعات سے ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس رب العالمین کا علم ہر چیز کے ساتھ معیت کی رو سے ہے۔ اور انسان خواہ ولی ہو خواہ نبی یا مرسل، اور کل علوم ظاہری و باطنی سے من اللہ عالم اور عارف بھی ہو، اسرار الٰہیہ میں پوری دسترس رکھتا ہو۔ باوجود ان سب حقائق ومعارف اور کمال انکشاف کے کسی چیز کا علم معیت کی رو سے روا نہیں ہوسکتا ہے۔ اور معیت کا ہونا انسان کے احاطہ سے باہر ہے اور ایسا گمان کرنا بھی جہالت اور ظاہرہ مکابرہ ہے۔ کیونکہ یہ اس ایزد متعال ذوالجلال والاکرام ہی کی شان ہے۔

"یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْهَاوَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْهَاوَهُوَمَعَكُمْ اَیْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" [الحدید:۴]

''جانتا ہے جو کچھ کہ داخل ہوتا ہے بیچ زمین کے اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو کچھ کہ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں اور وہ ساتھ تمہارے ہے جہاں ہو تم۔ اور اللہ ساتھ اس چیز کے کہ کرتے ہو تم دیکھنے والا ہے۔''

ہیں تو نظروں میں میرے　لاکن　نظر آتے　نہیں
مثل　بوئے　گل　ہیں پنہاں صاف　دکھلاتے　نہیں

گویہ غیب ظاہر سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اس کا حکم ظاہر پر محال ہے۔ تاہم دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔ فَاَیْنَمَاتُوَلُّوْافَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی ''تم جدھر بھی پھرو، ادھر ہی اللہ تعالیٰ ہے۔'' اور معیت کی وجہ پر نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) کا ارشاد اظہر من الشمس ہے اس لئے علم انسان اور علم رحمٰن میں مساوات کا اعتقاد رکھنا یا سمجھنا بلاشبہ شرک اور ظلم عظیم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کا علم کسی جہل کے دفع ہونے اور حجاب کے رفع ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور مولیٰ کریم ان عیوب سے پاک ہیں: سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَلْاٰنَ كَمَاكَانَ[۱]
اور یہ اس لئے کہ انسان کا علم خارجی حصول سے ہے اور ذات پاک کا علم ذاتی۔ گو انسان کا علم بھی حصول

۱۔ پاک ہے اللہ ساتھ تعریف اپنی کے، اب بھی ہے جیسا کہ تھا۔

کے بعداس کی ذات میں ذاتیہ ہی کا حکم رکھتا ہے لیکن مولیٰ کریم کے ذاتی علم سے ہرگز کوئی نسبت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مطابق فرمان ایزدمتعال ذوالجلال والاکرام اِنَّ اللّٰہَ قَدْاَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۱؎ کی تعریف اس عزیز الحکیم ہی کیلئے ہے جس میں غیر کو ہرگز دخل نہیں ہے۔

اور یہ احاطہ علم بالذات سے ہے۔ کیونکہ اگر احاطہ سوائے ذات کے سمجھا جائے تو اَحَاطَ کی نسبت ذات سے برطرف ہوجاتی ہے اور یہ محال ہے۔ اور یہ احاطہ کسی غیر کی مانند نہیں ہے۔ ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُوَالْبَاطِنُ ۲؎ ہی کے مترادف ہے۔ گومثالیں یہاں بیگانگی ہیں اوراس لم یزل ولایزال کے لئے کوئی مثال درست نہیں آسکتی۔ تاہم فہمید کیلئے اس سے چارہ نہیں۔ اس کو یوں قیاس کرنا چاہئے کہ ہر چیز کا اصل روح ہے اور ظہور کے اسباب کے لئے جسد لازمی ہے۔ ہر جسد کی نشو ونما، بقا اور فنا روح کے تصرف سے ہے۔ جب تمام مخلوقات عدم کی تاریکی میں پنہاں اور بے نام ونشان تھی، اس عالم الغیب کی ذات معلّیٰ میں متحقق تھی۔ ظہور کیلئے مرید ہونے کی صورت میں اِذَااَرَادَشَیْئًااَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ ۳؎ کا ارشاد ہوا۔ لَہٗ کی ضمیر متحقق بالذات ہونے کی دلیل ہے اور کُنْ امر کے مترادف اور فَیَکُوْنُ ظہورِ عمل پر روشن ہے۔ تو اول بحکم خدا عالم امر کے میدان میں روحانیت کا ظہور ہوا۔ وہاں سے وجود عنصری کا ظہور میدان دنیا میں ہویدا ہوا۔

ان سب منازل ومدارج اور تغیر وتبدل میں اس واجب الوجود کا علم یکساں ہے۔ خالق کائنات، علّتِ ممکنات جس نے عدم سے ہر چیز کو ظہور کا لباس عطا فرمایا، اور اس کے لئے معدوم کردینے پر قادر ہے۔ ہر چیز کے اصل اور فرع، ظاہر اور باطن، ہر حال اور تمام افعال میں اس کا علم ذاتی ہے۔ مخلوق میں سے کسی کیلئے ایسا علم تو درکنار اس قسم کا خیال کرنا بھی خطا ہے۔ کیونکہ انسان کا علم خارجی صورت میں ماخوذ فی النفس کے سوا نہیں ہے۔ جس قدر اسفل عالموں سے اعلیٰ کی طرف عروج ہونے کی صورت میں حجابات کا کشف

۱۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے گھیر رکھا ہے ہر چیز کو اپنے علم سے۔
۲۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے اول اور سب سے آخر ہے اور ظاہر بھی اور باطن بھی۔
۳۔ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے واسطے اس کے ہو جا تو ہو جاتا ہے۔

ہوتا ہے،اس سے معلومات محسوسات کے میدان میں نزول کرنے والے ہوتے ہیں۔ہاں،عالم معروفات کے میدان میں سے (جو محض فضل الٰہی سے وابستہ ہے) حصول بشر کیلئے انتہائی درجہ ہے۔اوراس سے آگے یعنی عالم امر سے ورا محض ذات قدس کا پرتو انسان کیلئے انسان کے ضمیر میں اس کے اختیار سے باہر ہے۔محض تصرفِ حق اس کے محو کردینے یا ثابت رکھنے پر قادر جس میں مطلق اس کا اختیار نہیں رہتا۔یا صحیح معنوں میں انسان اوراس کا اصل بالکل مفقود ہوجاتا ہے۔ایسی حالت میں کسی فعل کا ظہور انسان کی طرف سے سمجھنا خطا ہوتا ہے۔

ان سب علوم کی رویت (جن کا ذکراوپر گزر چکا ہے،مثلاً علم تقدیر،علم قضاوقدر،علم غیب اورعلم الانسان وعلم الرحمٰن میں فرق،جن کا ظاہر آیات بینات پر دال ہے) محض بطن انسانیہ پر منحصر ہے جس کو عالم برزخ کہنا ہی بجاودرست ہے۔ہر علم اوراس کے ایقان کا اول مطابق یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ایمان بالغیب کے ساتھ وابستہ ہے اوراس کا آخر رویت پر عیاں ہوتا ہے۔اوراس کا حصول فی الدنیا انکشاف پر اور فی الآخرۃ حقیقت پر۔گو بعض اعلیٰ ہستیوں کی روشن ضمیری کے باعث یہ برزخ میدان دنیا ہی میں اٹھ جاتا ہے تاہم انکشافِ حقیقت کا انحصار میدان برزخ کیلئے کما حقہ متحقق ہے۔

اور تمام علوم کا حصول فی الدنیا اور عالم برزخ میں استمداد کی وجہ پر زندہ کو موتیٰ سے اور موتیٰ کو زندہ سے ہوتا رہتا ہے۔اس لئے ہردوعالموں آپس کے تعلقات کی وجہ پر حصول کا اجرا اور مفاد واضح اور جائز ہے۔دنیوی تعلق کے انقطاع کے بعد حال کے تغیر وتبدل کے رو سے جس قدر انسان کے برزخ کا تعین اس کے ضمیر میں موثر ہوتا ہے۔ہر نیک وبد،کفر ہو یا اسلام جو اس کے برزخ میں قرار پا چکا ہے۔یا صحیح معنوں میں جس رنگ میں رنگا جا چکا ہے،اس کی ترقی يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تک ہوتی رہتی ہے،جس کی حقیقت اس دن کھل جائے گی۔

☆☆☆

باب چہارم:

یوم القیامہ

اب عالم برزخ کا زمانہ گزر چکا بحکم خدا صور پھونکا گیا۔ جمیع انسان قبروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ احکم الحاکمین کے عدل کا ترازو قائم کیا گیا۔ ذرہ بھر نیکی اور برائی، خیر اور شر کا عمل ہویدا ہو گیا۔ تغیر حال جو اعمال کی وجہ سے مخفی تھا کی حقیقت عیاں ہوگئی۔ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ١ کا راز کھل گیا۔ اعمال نامہ کی کتاب ہر ایک کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ اِقْرَاْ كِتَابَکَ ٢ کا فرمان صادر ہو چکا۔ وجود انسان یعنی ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، بلکہ ہر ایک عضو جو کہ حیات دنیا میں اس کے حکم کا مسخر تھا، اس کے اشارے کا تابع تھا، برعکس ہو گیا۔

یوم عسیر ٣ کی کیفیت نے انسانوں کو متوالا کر دیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ ایک کو دوسرے کی خبر تک نہ رہی۔ لَاتَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ٤ کا عمل ظاہر ہو چکا۔ تمام تعلقات منقطع ہو گئے کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ رہا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر بھاگ رہی ہے۔ نفسی نفسی کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ عوام تو درکنا، نبی اور مرسلین بھی سب کے سب نفسی نفسی ہی پکار رہے ہیں۔ ہاں، صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمَّتِی یَارَبِّ اُمَّتِی کی دعا فرما رہے ہیں۔

١۔ جس دن کئی منہ سفید ہوں گے اور کئی منہ سیاہ۔ ٢۔ پڑھ اپنی کتاب۔

٣۔ سختی کا دن۔ ٤۔ نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا۔

دراصل ہر ایک شخص مطابق کُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ [1] اپنے حال میں بے اختیار مستغرق ہوگا اہل دنیا، دنیا کے حجاب میں، کافر کفر کے پردہ میں، منافق نفاق کے جال میں، علی ھذا القیاس ہر ایک کا حجاب اس کیلئے بلائے جان ہوگا۔ کیونکہ یہ سب علائق باوجود منقطع ہونے کے تاثیر اور حجاب کے سوا کوئی اصل نہ رکھیں گے: فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ [2] کے مطابق انسان پر حقیقت اشیاء منکشف ہو جائے گی۔ اصل مقصود کی طرف جانے کیلئے تڑپے گا۔ لیکن حجابات سد راہ ہو جائیں گے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ" [المطففین:15]

"ہرگز نہیں، یقیناً وہ اپنے پروردگار سے اس دن البتہ حجاب میں ہوں گے۔"

آج مولیٰ کریم يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ [3] اور لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ [4] ومثلھا ارشادات سے ان کی افسوسناک حالت بیان فرماتے ہیں کہ کاش! یہ جانتے۔ لیکن اس دن حق کو ظاہر کرنے کیلئے حقیقت کے انکشاف کیلئے بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ کے مواخذہ کو عیاں کرنے کے واسطے بنی نوع انسان کو سجدہ کیلئے بلایا جائے گا۔

کشف ساق:

ارشاد مولیٰ کریم ہے:

"يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ" [القلم:42،43]

"جس دن کہ کھولا جائے گا پنڈلی سے اور بلائے جائیں گے طرف سجدے کی پس نہ کرسکیں گے۔ نیچے ہوں گی، آنکھیں ان کی۔ ڈھانکتی ہوگی ان کو ذلت اور تحقیق تھے بلائے جاتے طرف سجدے کے اور وہ سالم تھے۔"

۱۔ ہر آدمی اپنی کمائی کے بدلے میں رہن ہے۔ ۲۔ آج کے دن تیری آنکھیں لوہے کی سی ہیں۔
۳۔ افسوس ہے بندوں پر۔
٤۔ کاش کہ وہ جانتے ہوں۔

مفسرین اس کی تفسیر میں مجبور ہی ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ انسانی علم کی وسعت عالم معروفات سے آگے پرواز نہیں کرسکتی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر عزیزی میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک گروہ نے نادانی سے بدوں (بغیر) سمجھے بوجھے اس کام کی حقیقت کو گمراہی کے بھنور میں ڈالا یعنی تشبیہ ظاہری میں پڑ گئے اور ان حقیقتوں کو اعضاء اور جوارح پر قیاس کر کے حق تعالیٰ کی ذات پاک کی صورت اور شکل کے معتقد ہوئے، یعنی حق تعالیٰ کا جسم ہونے کے قائل ہوئے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا یعنی برتر ہے اللہ تعالیٰ اس چیز سے جو کہتے ہیں ظالم بہت بڑی اور برتری کر کے۔ اور ایک جماعت نے تنزیہ کے قاعدے کو ایسا گہہ کے پکڑا کہ ان حقیقتوں کے ثابت کرنے کو اس قاعدے کے منافی سمجھ کے ایسی تاویل کی ہے جو مقصد سے بہت دور ہے۔ بلکہ نفی اور انکار کا حکم رکھتی ہے تو گویا حقیقت میں ان حقائق کی دریافت اور سمجھ میں تشبیہ والوں کے شریک ہوئے۔ فرق ان دونوں میں اتنا ہوا کہ پہلے فرقے نے ثابت کیا ہے اور انہوں نے نفی کی ہے۔ تو ان کو بھی سوائے ان معنوں کے جو ان کے ظاہر لفظوں میں پائے جاتے ہیں، دوسرا مطلب کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اور اہل سنت و جماعت کے محقق جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا مقصد کی حقیقت کو پہنچے اور کہا کہ ہر چیز کی ذات کو دریافت کرنے کے بعد اس کے اعضاء کا حال معلوم ہوتا ہے۔''

آپ کا یہ فرمان بالکل واضح ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک مولیٰ کریم کا ید و وجہ یا آنکھ اور ساق ومثلہا یعنی کل اعضا جسم کی مثل سمجھنا کم فہمی بلکہ سراسر خطا ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس کا بالکل انکار کیا ہے اور یہ بھی خطا ہے۔ اور یہ بالکل بجا و درست ہے۔ کیونکہ ان کی مراد اس میں ذات اور حقائق کے برزخ کی ہے۔ اور اس کی توضیح ذات اور صفات میں عرف کے سوا نہیں ہے۔ کئی وجہ پر اوپر گزر چکا ہے کہ صفات بالذات محض تابع ذات ہیں اور صفات بالفعل تابع صفات بالذات۔ صفات بالفعل کا ظہور الی الخلق ہوا کرتا ہے اور صفات بالذات محض ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اس جگہ اس کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ کلام مجید کا اصول نزول ہمارے حال کی وجہ پر ہے اور شانِ نزول ہمارے اعمال

کی وجہ سے۔ حال بمنزلہ اصول کے ہے اور اعمال بمنزلہ فرع کے۔ گو کوئی ایک وجہ سے اعمال کا اثر تغیر حال کا موجب ہوا کرتا ہے لیکن اعمال کا مرید ہونا حال کے سوا نہیں ہوتا ہے۔ وہ ذات پاک کسی اثر کی ماخذ نہیں اور نہ ہی یہ اس کی ذات پاک کے شایاں ہے۔ لیکن انسان سوائے حال کے کما حقہ کسی فہمید کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے محض حقائق کو منکشف کرنے کیلئے استعارے کے طور پر اعضاء کو ہمارے حال کے مطابق بیان میں لائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عطا وسخا کے لئے بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ١ فرمایا ہے۔ اور دید کو بصارت سے سماعت کو سمع سے اور مشاہدہ ولقا کو وجہ سے نسبت دی ہے۔ ورنہ ذات پاک کیلئے کسی عضو سے نسبت ظاہرہ نادانی اور جہالت ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ٢ کسی صورت یا کسی وجہ پر اللہ جل وعلا کے اعضا قیاس کرنا خواہ وہ مخلوق کے اعضا سے کوئی نسبت نہ رکھنے کا گمان ہی کیوں نہ ہو، سراسر نادانی اور جہالت ہے۔

جو کچھ کہ قیاس اور گماں وہم میں آئے
اس سے بھی ورا بلکہ ورا سے بھی ورا ہے

وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٣ کے مطابق آیات اللہ میں غور وتدبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور وہ یوں سمجھنا چاہئے کہ ہمارے نفوس میں سب طاقتیں روح ہی سے ہیں۔ اور قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ٤ کے مصداق تمام اعضاء میں روح ہی کا تصرف ہے۔ آنکھ جو دیکھنے کا آلہ ہے اس میں بصارت کا کام دے رہی ہے، زبان میں بولنے کا، کان میں سننے کا، ہاتھ میں پکڑنے اور پاؤں میں چلنے کا۔ علیٰ ہذا القیاس! ہر ایک سے اپنی شکل وصورت کے مطابق فعل عیاں ہے۔ اور ان سب میں تصرف روح ہی سے ہے۔ سوائے جوارح کے بگڑ جانے کی صورت میں یا منتقل ہو جانے کے بعد روحی طاقت جو بمنزلہ اصل کے ہے فرع سے جدا ہونے کی صورت میں اپنے کسی تصرف اور طاقت کے منافی ہونے کی مقتضی نہیں ہوسکتی۔ تو اب اس سے

١۔ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں۔ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ ٢۔ پاک ہے وہ اور بلند اس چیز سے کہ کہتے ہیں بہت بلند بہت بڑا۔ ٣۔ اور بیچ جانوں اپنی کے کیا تم دیکھتے نہیں؟
٤۔ کہہ ہر ایک اپنی شکل پر عمل کرتا ہے۔

یہ فائدہ حاصل کرنا بعید از مقصود نہ ہوگا کہ وہ ذات معلّٰی ان سب اسباب سے منزہ اور مبرا ہے۔

تو پھر اعضا کی مناسبت جو محض ہمارے حال کی وجہ پر بیان کی گئی ہے، اس ذات معلّٰی کی طرف کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس لئے ساق اور اس سے پردہ کا اٹھایا جانا ہمارے ہی حال سے عبارت ہے۔ کیونکہ ید وعین اور وجہ، ان سب کی نسبت مولٰی کریم نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمائی ہے لیکن ساق کو اپنی ذات کی طرف نسبت نہیں دی۔ اس لئے اس کو مخلوق کی طرف جس میں بنی نوع انسان مختص ہیں، نسبت ہونی چاہئے، اور سوائے اس کے نادانی ہے۔ جس طرح ہر اعضا کے بیان سے ہمارے حال کی وجہ پر بیان فرمایا ہے اسی طرح ساق بمنزلہ اسفل مخلوق سے نسبت کو ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ اس ذات پاک کا کسی حجاب سے محجوب ہونا روا نہیں ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس واجب الوجود کیلئے عیاں ہے، یہ حجابات اور انکشافات مخلوق ہی کیلئے ہیں نہ کہ ذات باری تعالٰی کیلئے، اور تمام مخلوق میں سے بنی نوع انسان اس محل میں اس لئے مخصوص ہیں کہ ہر قرب و بعد کا مقام اسی کا حصہ ہے۔ اس واسطے اس دن کافر، مومن، منافق، فاسق سب سے یکساں حجاب دور کئے جائیں گے اور تجلی باری تعالٰی عیاں ہو جائے گی۔ حسب حال ہر ایک کی حالت مطابق فرمان:

"يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ○ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ" [الطارق: ۹۔۱۰]	"جس دن آزمائی جائیں گی چھپی باتیں پس نہ ہوگی واسطے اس کے قوت اور نہ مدد دینے والا۔"

ظاہر ہو جائے گی، ساجدین کیلئے راحت ہوگی اور منکرین جنہوں نے دنیا میں اعراض کر رکھا تھا اس نعمت سے محروم رہیں گے یعنی سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی پشتیں تختہ ہو جائیں گی۔ ہر ایک کو اسی حجاب میں جس میں وہ محجوب تھا چھوڑ دیا جائے گا۔ تاکہ اس مشاہدہ اور لقائے الٰہی سے جو اس کو دکھایا جائے گا، حسرت کے میدان میں زیادہ عذاب کا موجب ہو اور مطابق:

"مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى" [بنی اسرائیل: ۷۲]	"جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہے پس وہی آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔"

ابدی اعمیت میں گرفتار ہو، مومن صاحب مشاہدہ محویت میں مستغرق اور شاد ہوں گے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍنَّاضِرَةٌ ٥اِلٰى رَبِّهَانَاظِرَةٌوَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍبَاسِرَةٌ ٥تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَافَاقِرَةٌ"
[القیامۃ: ۲۲ تا ۲۵]

''کتنے منہ اس دن تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کی دیکھنے والے ہیں، اور کتنے منہ اس دن برے ہیں، گمان کرتے ہیں یہ کہ کی جاوے گی ان سے کمر توڑنے والی یعنی معاملت۔''

گوحالات ازحد مختلف ہوں گے، اور یہ اختلاف ہرایک کے حال کی روئت سے ہوگا۔ تاہم ان آیات سے ظاہر ہے کہ محو دیدار، ہشاش بشاش اور راحت سے مسرور ہوں گے اور دوسرے باسرہ کے مطابق اداس اور رنجور ہوں گے۔

مومن کو بفضلہٖ تعالیٰ دنیا میں بھی لقاء اور مشاہدہ کے ساتھ حیات ابدی سے حصہ ہوتا ہے، اور عالم برزخ میں بھی اسی سے استغراق اور یوم القیامۃ میں خصوصیت کے ساتھ رحمت الٰہی اس کی یاوری کرے گی۔ اور برعکس اس کے کافر، مشرک، فاسق، منافق میدان دنیا میں اعمٰی اور عالم برزخ میں ظلمات کے گڑھے میں مقید اور یوم القیامۃ میں حسرت کے دریا میں غرق اور عذاب ابدی میں گرفتار۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الدنیا والاخرۃ مومن اور کافر کا حال کسی صورت میں مساوی نہیں ہوسکتا۔ لَايَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ (اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہوسکتے) تو اس صورت حال کے مطابق مومن کیلئے، خصوصاً اولیائے کرام کیلئے کوئی حجاب نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ''ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوام تجلی حاصل ہے۔'' تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ [۱] کفار کیلئے مخصوص ہے، تاکہ انکشاف حقائق ان کیلئے موجب عذاب ہو، اور وہ اس لئے کہ انسان کے لئے سوائے اس کے عذاب کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ کیونکہ مولیٰ کریم کا معاملہ انسان کے ساتھ محبت کا ہے، اور محبت میں حجاب اور فرقت سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے اور دیدار اور مشاہدہ اور قرب سے بڑھ کر کوئی راحت نہیں ہے۔ رُوْحٌ مِّنْ اَمْرِ رَبِّى ہے۔

۱۔ کھولا جائے گا پنڈلی سے۔

یعنی امر الٰہی ہے جس سے مولیٰ کریم کو خاص تعلق ہے۔ یعنی آمر کو امر سے ایسا تعلق اور اتحاد ہے جس کی تمیز محال ہے۔ اور یہ ایسا تعلق ہے جیسے مرکز کو دائرہ سے، اصل کو فرع سے، معنوں کو عبارت سے، روح کو وجود سے اور مرید کو ارادہ سے۔ انسان خواہ کافر ہو یا مومن، دشمن ہو یا دوست، مرحوم ہو یا مقہور، رب العالمین کا تعلق سب سے یکساں ہے۔

یار نزدیک تر از من بہ من ست
ویں عجب تر کہ من از وے دورم[1]

کوئی اس کے فضل وکرم سے مقرب ہے اور کوئی اس کے عدل وانصاف کے رو سے بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ [2] کی وجہ پر دور۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ کو روح اللہ اور محمد رسول اللہ رحمۃ اللعالمین کو محبوبیت سے مشرف فرمایا ہے۔ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔ گویا ہر ایک کو جیسی نسبت ذات معلّٰی سے ہے، ویسے ہی القاب سے نسبت دی ہے۔ جیسے فرمایا: بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ [3]

جاننا چاہئے کہ یہ نسبت رحمی ہو یا غضبی، ہمارے حال کے رو سے ہے۔ بعد وقرب ہمارے اعمال سے ہے، اور ان معنوں کی عبارت ہمارے حجابات کے حائل ہونے اور دور ہو کر حقائق کے منکشف ہونے کی رو سے ہے، نہ کہ مولیٰ کریم کے حجاب اور کشف کی حقیقت، جو ذات پاک کیلئے مطلقاً روا نہیں ہے۔

اب اس سے یہ مفاد اور مقصود حاصل کرنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ کل کائنات ایک وجود کی مانند ہے جس میں انسان خاص ہے اور انبیائے کرام خاص الخاص، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں فرمایا:

"وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ" [طٰہ:۳۹] 'اور تاکہ پرورش پاؤ تم سامنے آنکھ میری کے۔'

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا:

"فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا" [الطور:۴۸] ''کہ بے شک تم ہماری نگہداشت میں ہو۔''

۱۔ میرا دوست تو میرے بہت زیادہ قریب ہے اور یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ میں اس سے دور ہوں۔
۲۔ بسبب اس چیز کے کہ تھے کماتے۔
۳۔ دوری ہے واسطے قوم ظالموں کے۔

جومقربی اور محبوبی پر دال ہیں۔اور بعض کو دوری اور مجوبی سے نسبت دے رکھی ہے۔تو عزیز الحکیم نے وجود موجوادت میں سے اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ہستیوں کو ساق سے تشبیہ دی ہے۔اس مالک الملک کا ارشاد مبارک: لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ [۱] میں صورت اسی کے مترادف ہے۔مطابق حدیث شریف کہ ساق موقف میں اور قدم دوزخ میں ہوگا۔اور مالک حقیقی کا اس کیلئے فرمان ہوگا کہ کیا تو بھر گئی؟ کہے گی میرے رب، میں بھر چکی۔مطابق فرمان ایزدمتعال: وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی [۲] کے کوئی صورت خواہ قدرت کی ساق ہی کیوں نہ ہو، مذموم ہے۔اور ایسا اعتقاد سراسر جہالت اور نادانی سے ہے، جو اس ذات پاک کے لائق نہیں ہے۔

تو جب کشف ساق جس کی نسبت اسفل مخلوق کی طرف منسوب کی گئی ہے، ہو چکے گی تو جن لوگوں نے دنیا میں رجوع الی اللہ نہ کیا اور نہ ہی حکم کے مطابق معبود حق کی عبادت اور سجدہ کر سکے۔ان کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہوگی۔دل میں رنج و قلق کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔عبادت اور سجدہ کی حقیقت عیاں ہوجائے گی۔اس رحمت و شفقت اور عنایات و انعامات سے جو سجدہ اور عبادت و فرماں برداری کی زحمت اور مشقت میں پنہاں تھی، آگاہی ہوجائے گی تب مارے ندامت کے سرنگوں ہونے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا

نامۂ اعمال

دیا جائے گا۔فرمان مولیٰ کریم ہے:

"فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ

"پس جو کوئی دیا گیا عمل نامہ اپنا بیچ داہنے ہاتھ اپنے کے پاس کہے گا لو پڑھو عمل نامہ میرا۔بے

۱۔اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

۲۔اور واسطے اللہ کے ہے مثال بہت بلند۔

حِسَابِيَهْ o فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ o فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ o قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ o كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ o وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ o وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ o يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ o مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ o هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ o خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ o ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ o ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ o اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ o وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ o فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ o وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ o لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ"

[الحاقۃ: ۱۹ تا ۳۷]

شک میں جانتا تھا یہ کہ میں ملوں گا حساب اپنے سے۔ پس وہ زندگانی خوش میں ہے۔ بیچ بہشت بلند کے کہ میوے اس کے نزدیک ہیں، کھاؤ اور پیو پورا پورا، بدلے اس کے جو کر چکے ہو تم بیچ دنوں گزرے ہوؤں کے۔ اور جو کوئی دیا گیا عمل نامہ اپنا بیچ بائیں ہاتھ اپنے کے، پس کہے گا اے کاش کہ میں نہ دیا گیا ہوتا عمل نامہ اپنا اور نہ جانتا میں کہ کیا ہے حساب میرا۔ اے کاش کہ یہ موت ہوتی تمام کرنے والی۔ نہ کفائت کیا مجھ سے مال میرے نے جاتی رہی مجھ سے سلطنت میری۔ پکڑو اس کو پس طوق پہناؤ اس کو، پھر دوزخ میں لے جاؤ اس کو پھر بیچ زنجیر کے کہ پیمائش اس کی ستر ہاتھ ہے۔ پس داخل کرو اس کو تحقیق وہ تھا نہ ایمان لاتا ساتھ اللہ کے جو بڑا ہے۔ اور نہ رغبت دلاتا تھا اوپر کھانے فقیر کے۔ پس نہیں واسطے اس کے آج اس جگہ کوئی دوست، اور نہ کھانا مگر دھوون دوزخیوں کے سے نہیں کھائیں گے اس کو مگر گنہ گار۔"

سعیدوں کو دائیں ہاتھ میں اور بدبختوں کو بائیں ہاتھ میں۔ سعید خدا کے فضل سے خوش اور بدبخت موافق آیات اپنے حال میں مستغرق، اور ہر ایک کو حکم ہوگا کہ:

"اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا"[بنی اسرائیل:١٤]

''پڑھ کتاب اپنی، کافی ہے جان تیری آج اوپر تیرے حساب لینے والی۔''

ہر امی اوران پڑھ بھی اپنے اعمال کا مطالعہ کرے گا۔طوعاًو کرہاًو مجبوراً معائنہ کرنا ہی پڑے گا اور اس کے سوا کسی کو چارہ نہ ہوگا۔کئی انواع واقسام پر حساب شروع ہو جائے گا۔عدل وانصاف کا ترازو کھڑا کیا جائیگا۔وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ٥ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ٥ یعنی جس نے ذرہ بھر نیکی کمائی ہوگی وہ بھی پالے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی دیکھ لے گا۔

"وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَّلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا"

[الکهف:٤٩]

''اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جاوے گی۔تو تم گنہ گاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے اے وائے یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو، کوئی بات بھی نہیں مگر اس میں لکھ رکھا ہے اور جو عمل کئے گئے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا''

صرف لکھا ہوا نہیں ہوگا بلکہ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا کے مطابق مکان وزمان اور فعل وحرکات کا نقشہ کھنچا ہوا ہوگا۔

دوسری وجہ حساب جوارح کے ساتھ ہوگی:

"حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

[حم السجدة:٢٠]

''یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چہرے ان کے برخلاف ان کے تمام اعمال کی شہادت دیں گے۔''

تیسری وجہ نیت کے خلوص پر ہوگی۔جس سے نہ تو کراماً کاتبین کو خبر ہوگی، نہ کسی انسان کو اور نہ جن

کو۔اس سے علم اس علیم بذات الصدور ہی کو ہوگا۔اوران معنوں کی عبارت دل کے ثواب اور گناہ کے روسے ہوگی۔گناہ ہو یا ثواب، نیکی ہو یا برائی، ریا ہو یا اخلاص، نفاق ہو یا ایمان، کفر ہو یا اسلام، اس کا حساب عنداللہ ہی ہوگا۔بمصداق:

میان عاشق ومعشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

بعض انسان اس حساب وکتاب سے مبرا ہوں گے۔اور وہ اس لئے کہ ایسے شخصوں کی سعی (جو دو نوع پر منقسم ہے، باطناً ہمت کی روسے اور ظاہراً طاقت کی وجہ پر) مطابق فرمان ایزدمتعال: اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (جن لوگوں کی تمام تر سعی حصول دنیا میں گم ہوگئی) سب کی سب اسی کے حصول پر خرچ ہوگئی، اور وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا [۱] کی سخت ترین خطا کی وجہ سے خوش رہے، اورنشانات بینات کی طرف سے منکر اور لقائے الٰہی سے غافل رہے اس لئے بوجہ یکسوئی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کے فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا [۲] کے مطابق حساب سے مبرا رہے۔

ایسے ہی جن اشخاص کی سعی ہمہ تن آخرت یا رضائے مولیٰ کریم کی طرف مصروف رہی، ان کیلئے بھی وزن قائم نہ ہوگا۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خطاب فرمایا کہ: ''مجھ سے میرے پروردگار نے وعدہ فرمایا کہ تیری امت سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل کروں گا۔ میں نے عرض کیا کہ یارب کریم! اور بڑھایئے۔فرمایا کہ ستر ہزار دفعہ ستر ہزار'' یعنی چار ارب نوے کروڑ۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: ''اَلَّذِیْنَ لَا یَتَدَاوُوْنَ وَلَا یَتَدَاعُوْنَ وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ (یعنی جو لوگ تنگی اور بیماری کے وقت نہ دوا کرتے ہیں نہ دعا بلکہ صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں) اور بھی کئی قسم کے لوگ آپ نے بیان فرمائے جو سب صاحب تسلیم ورضا ہیں۔مثلاً شاکرین، صابرین، ذاکرین، خاشعین اور

۱۔اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔
۲۔پس نہ قائم کریں گے ہم واسطے ان کے دن قیامت کے تول۔

خائفین وغیرہم۔

اس زمانہ حساب میں کوئی کسی کی یاوری نہ کرے گا اور نہ ہی کوئی کسی کا بوجھ اٹھا سکے گا۔ بمصداق لَاتَزِرُوَازِرَۃٌوِّزْرَاُخْرٰی [1]۔ اور:

"یَوْمَ یَفِرُّالْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ oوَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِo وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ"

[عبس: ۳۴تا۳۶]

"اس دن بھاگے کا آدمی بھائی اپنے سے اور ماں اپنی سے اور باپ سے، اور بیوی اپنی سے بیٹوں اپنے سے۔"

اور نہ ہی کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ اور وہ اس لئے کہ یہ میدان عدل وانصاف ہر ایک شخص کے حال کے موافق موازنہ کرنے والا ہوگا۔ اور یہ روانہیں ہے کہ ایک کے گناہ دوسرا شخص اٹھالے۔ اور یہ محال ہے۔ کیونکہ یہ بوجھ کسی مادی چیز کی مانند نہیں ہے جو ایک کے سر سے دوسرا کچھ حصہ لے کر ہلکا کردے۔ یہ اس عزیز الحکیم کی حکمت کے اندازہ پر بوجھ کی کیفیت ہے۔ بعض اس قدر دبے پڑے ہوں گے کہ پہاڑ کے نیچے پس جانے سے بھی زیادہ سخت حال رکھنے والے ہوں گے۔ لیکن یہ بار مثل حجر کے ہرگز نہیں ہوگا بلکہ گناہ کا دباؤ حجاب کی صورت میں دل پر اور اس کے اثرات بدن پر ہوں گے۔

ہاں جن لوگوں کے اعمال نیک و بد خلط ہوں گے اور مومن ہوں گے۔ ان کے اعمال مثل ترازو کے موازنہ کئے جائیں گے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ oوَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓااَنْفُسَهُمْ بِمَا کَانُوْابِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ"

[الاعراف: ۸،۹]

"اور تولنا اس دن حق ہے، پس جو شخص کہ بھاری ہوئی تول اس کی پس یہ لوگ وہی ہیں فلاح پانے والے اور جو کوئی کہ ہلکی ہوئی تول اسکی پس یہ لوگ ہیں جنہوں نے خسارہ دیا جانوں اپنی کو بسبب اس کے کہ تھے نشانیوں ہماری کے ظلم کرتے۔"

۱۔ نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا۔

جن کے اعمال صالح وزن میں بھاری ہوں گے وہ من مانی عیش میں ہوں گے اور جن کے ہلکے ہوں گے وہ مصیبت میں گرفتار رہوں گے۔

جب حساب کا کام تمام ہو جائے گا تو حسب تعلق تمام لوگ گروہ گروہ ہو جائیں گے۔ جس جس کے ساتھ دنیا میں مطابقت اور مناسبت رکھتے ہوں گے۔ کشاں کشاں خود بخود جمع ہو جائیں گے۔ ان میں کا ہر ایک سردار مثل پیشوا امام ہوگا:

"يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ" [بنی اسرائیل: ۷۱]

''جس دن بلائیں گے ہم ہر ایک انسان کو اس کے پیشوا کے ساتھ''

فرعون اپنی آل یعنی اپنے متبعین کا رہنما ہوگا، نمرود اپنے لشکر کا سردار ہوگا، اور ابولہب اپنے ہم خیالوں کا پیشوا۔ علی ھذا القیاس! تمام انبیاء اور رسول اپنی اپنی امت کے رہنما ہوں گے۔ اور سب مرسلین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع ہوں گے اور آپ

لواء الحمد

کو تھامے تمام انبیاء ومرسلین کیلئے سردار ہوں گے۔ ہر ایک نبی اور رسول اپنے اپنے مدارج ومقامات سے مزین ہونے کے باوجود سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، آخر آمد بود فخر الاولین صلی اللہ علیہ آلہ سلم کی نسبت محمدی یعنی محبوبیت کی طرف آرزو اور التجا کرنے والے ہوں گے اور مثل ستاروں کے ماہتاب کے ظل میں محبوب محض کے نور کے سایہ میں محو ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کل انبیاء نفسی نفسی کہیں گے۔ اور چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبودیت کے مقام میں محبوبیت کے لباس سے مزین ہوں گے، جس سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں ہے۔ اس لئے انتہائی یاب اور حصول کے بعد آپ سے امتی امتی کی صدا ہی ظہور پذیر ہوگی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ایک مرسل کو مولیٰ کریم نے کسی نہ کسی صفت سے خاص کیا ہے اور جو کچھ من اللہ ان کو خاصہ عطا ہوا اسی نسبت سے معروف ہوئے۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ روح اللہ، علیہم السلام۔ اور حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی شان میں فرمایا ہے:

"یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًاo وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا" [الاحزاب:۴۵،۴۶]

"اے نبی! بے شک بھیجا ہم نے تجھے گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا طرف اللہ کی، ساتھ حکم اس کے اور سورج روشن کرنے والا۔"

اور ساتھ ہی مومنین کو بشارت دینے کیلئے اور منکرین کو مطلع کرنے کیلئے سوء اعتقادی کو حق کے دریا میں غرق کرنے کے واسطے کیا ہی صاف اور بین فیصلہ فرمادیا ہے:

"وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا" [الاحزاب:۴۷]

"اور خوشخبری دو ایمان والوں کو کہ یقیناً یہ ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔"

دونوں آیات مقدسہ کے درمیان اور کوئی آیت نہیں جس سے بے تعلق مضمون اور معانی کا احتمال ہو سکے۔ بلکہ دونوں آیات کا ایک دوسری سے الحاق ہے۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے حبیب! ان صفات سے جو میں نے تجھے مزین فرما کر مرسل کیا ہے یہ مومنوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔ اور:

"ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" [الجمعۃ:۲]

"وہی ذات پاک ہے جس نے بھیجا بیچ ان پڑھوں کے پیغمبر ان ہی میں سے۔ پڑھتا ہے اوپر ان کے آیتیں ان کی اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت۔"

کا نزول اسی کے مترادف ہے۔ اس لئے یہ صفات محض اس رحمۃ للعالمین کا صرف خاصہ ہی نہیں بلکہ ان خصوصیات کا مفاد اور مِنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا مومنین کیلئے بھی ہے، تاکہ اس نسبت سے جو رب العالمین نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائی ہے، فائدہ حاصل کریں، نعمت عظمیٰ سے اور بے بہا دولت سے مالا مال ہوں۔

اے عزیز! جاننا چاہئے کہ ہرایک انسان کا حال فی الدنیا ہی آخرت میں مکاشف ہوگا اور ہرایک مناسبت کی وجہ سے بلا اختیار اپنی نسبت سے منسوب ہوگا۔ تو آج میدان دنیا میں جونسی نسبت سے اعتقاد رکھنے والا ہوگا، اسی سے فیوض اور تعلق اور حصول کے اجرا کی امید ہوگی۔ کیونکہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی وجہ پر قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز سے اعتقاد نہ ہو اس سے حصول محال ہے......تو حقیقت منکشف ہونے کے بعد مطابق:

"وَیَوْمَ یَعَضُّ الظّٰلِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ○ یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا"

[الفرقان:۲۷تا۲۹]

"اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا ظالم اوپر دونوں ہاتھوں اپنے کے کہے گا اے کاش کہ پکڑتا میں، ساتھ رسول کے، راہ، اے وائے ہے مجھ کو کاش کہ نہ پکڑتا میں فلانے کو دوست۔ البتہ بے شک گمراہ کیا مجھ کو ذکر سے پیچھے اس کے کہ آیا میرے پاس۔ اور ہے شیطان آدمی کو ہلاکی میں سونپنے والا۔

ظالم اس دن اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں (مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا) یعنی معیت حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محروم نہ رہتا۔

اسی معیت کے معنوں کو پائے ہوئے، اسی نسبت محمدی سے دل کو سجائے ہوئے اور اصل توحید یعنی توحید و رسالت کے میدان میں پوری استقامت سے قدموں کو جمائے ہوئے حضرت شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں:

"من آں خدائے را پرستارم کہ رب محمد است" [1]

۱۔ یاد رہے کہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے قصہ میں اسی نسبت رسالت کا اظہار کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب جادوں گروں نے مقابلہ میں دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پھینکا ہوا عصا واقعی اژدھا بن کر ہمارے خیالی سانپوں کو سچ مچ کھا گیا ہے تو حق ظاہر ہونے کے بعد انہوں نے فرعون کے وعدہ =

کیا ہی پرمعانی کلمات ہیں جن کی مراد ربوبیت کی صفت میں سے مخصوص ہے۔ وہ لم یزل ولا یزال بے مثل وبے مثال کل موجودات کا مالک اور تمام عالمین کا رب ہے، رب العالمین کی صفت اسی کیلئے ہے۔ کل موجودات سری، روحانی، ملکی، وجودی بلکہ حیوانات، نباتات وجمادات اور تمام درند، چرند، پرند کا رب ، باقی صفات کی رو سے کافر، مسلم، مشرک، مومن، منافق، سب کا پروردگار ہے۔ یعنی ربوبیت کا تعلق کل مخلوقات سے یکساں ہے۔ لیکن اوصاف بالکل مختلف ہیں۔ ہرایک کو جس صفت پر تخلیق کیا ہے اس سے وہی فعل صادر ہوتا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَا كِلَتِهٖ (کہہ ہر کوئی اپنی شکل پر عمل کرتا ہے) کے مطابق ہرایک اپنی سرشت پر عمل کرتا ہے۔ لیکن انسان تمام مخلوق میں تغیر وتبدل کو کسی حد تک بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (بسبب اس چیز کے کہ کماتے تھے) کے اسباب سے وابستہ ہے۔ لیکن نعمت، عظمت اور ہدایت محض فضل الٰہی پر منحصر ہے۔ انبیائے کرام کا معاملہ عوام کے حال سے وراء ہے۔ اور سید المرسلین تمام انبیائے کرام میں سے مختص ہیں اور نص اس پر شاہد ہے۔ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ رسالت کسب سے نہ کبھی حاصل ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ محض فضل الٰہی ہے جس کے دورخ ہیں۔ ایک تو خود مرسلین کی ذات کی طرف كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (آپ پر آپ کے رب کا بہت بڑا فضل ہے) کی وجہ پر، اور دوسرا مخلوق کی طرف رسالت کے توسل اور انعام وہدایت من اللہ کی رو سے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا کہ بشارت ہے ایمان لانے والوں کیلئے فی الدنیا ہدایت کے رو سے، اور اللہ

= تقرب کو بالائے طاق رکھ کر اور تمام نفسانی ہوا وہوس سے پاک ہو کر برملا کہا امنا برب العالمین اور سجدہ میں گر گئے۔ یہ حق گوئی اور حق جوئی درگاہ رب العزت میں اس قدر مقبول ہوئی کہ فوراً اسی میدان میں انہیں نسبت رسالت کی طرف ہدایت دی اور انہوں نے کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى یعنی ہم ہارون وموسیٰ علیہما السلام کے رب پر ایمان لائے پھر جب فرعون نے صلیب پر چڑھانے کی دھمکی دی اور انہوں نے اسے بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ایمان ورشد بمعیت رسالت کے مقابلے میں اس حیات الدنیا کو ہیچ جانا تو کہا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کرلے، تو جو کچھ کرے گا اس دنیا میں کرے گا) بس دنیا سے قدم اٹھ گئے اور منتہی ہو گئے تو فرمایا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا الآیۃ یعنی ہم اپنے رب پر ایمان لائے۔ ۱۲

تعالیٰ کی طرف سے بڑا فضل ہے حصول آخرت کی وجہ پر، دنیا عمل کا میدان ہے اور آخرت اجر کا۔ تو جس کسی نے فی الدنیا جس نسبت سے تعلق پیدا کیا ہوگا، وہ آخرت میں اسی کے ساتھ ہوگا اور اس کی معیت اس سے ملحق ہوگی۔ تو مطابق آیات بینات جن کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھتا ہوگا، وہ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔

ان صفات سے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، میدان دنیا میں نسبت رکھنے والے میدان قیامت میں لواء الحمد کے نیچے سایہ رسالت سے معمور ہوں گے، اور باوجود مسلمان ہونے کے آج جن کا اعتقاد ان آیات پر حصول کی رو سے نہیں ہے اور اس فیض و برکت کو اثبات توحید کے منافی سمجھتے ہیں، مطلق بے نصیب اور محروم ہوں گے۔ مولیٰ کریم نے صاف طور پر توضیح فرما دی ہے کہ میرے حبیب! ان اوصاف سے متصف کر کے ترا مرسل کرنا مومنین کیلئے بشارت اور میری طرف سے بڑا فضل ہے۔ تا کہ وہ مسرور ہوں اور منکر حسرت کے میدان میں ذلیل و خوار ہوں۔

اے بھائی! مومنین تو:

"وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا"

[النساء:٦٩]

''اور جو کوئی فرماں برداری کرے اللہ کی اور رسول کی پس یہ لوگ ساتھ ان لوگوں کے ہیں کہ انعام کیا ہے اللہ نے اوپر ان کے پیغمبروں سے اور صدیقوں سے اور شہیدوں سے اور صالحین سے اور اچھے ہیں یہ لوگ رفیق۔''

کے مطابق نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحین کے ہمراہ ہی ہوں گے۔ اور جن کے اعتقاد تو درست ہوں گے، لیکن اعمال میں باوجود ایمان کے کوتاہی کے باعث گنہ گار اور فاسق ہوں گے ان کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باذن اللہ شفیع ہوں گے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ان حجابات سے جن کی وجہ سے وہ نور رسالت اور دیدار الٰہی سے محجوب ہوں گے خلاصی پا جائیں گے۔ لیکن جن کو آج سوء اعتقادی کی ظلمات نے ڈھانپ رکھا ہے اور وہ اس تعلیم سے جس کو خداوند کریم نے عین ہدایت کا سبب بنایا ہے، اور اس آفتاب

رسالت سے جس سے نشو ونما اور روئیدگی ایمان کو مستلزم کیا ہے منکر ہو رہے ہیں، اور ان فیوض کو شرک خیال کرتے ہیں۔ شیطان نے ان کو دھوکا دیا ہے اور اپنی زعمی توحید کے دریا میں ایسے غرق ہوئے ہیں کہ اس سے سر نکالنا دشوار ہو گیا ہے۔ اور اصل توحید یعنی توحید رسالت سے جو نور محمدی سے مزین ہے فیض یاب ہونا ناممکن ہو چکا ہے۔ دراصل ایسے شخص اقرار کے رنگ میں انکار کرنے والے ہیں جو ہرگز ہدایت نہیں پا سکتے۔ کیونکہ وہ کلام الٰہی سے منکر ہو رہے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ اگر وہ اس بات پر یقین کریں کہ یہ مومنین کو فضل کبیر کی بشارت اوصاف رحمۃ للعالمین مومنوں کیلئے اجرائے ہدایت اور سبیل کے رو سے ہے، تو ان کو حیات النبی اور آپ کا ہر مومن سے علم اور قرب کا یقین کرنا پڑتا ہے اور ان کے نزدیک یہ شرک اور کفر ہے۔

لیکن اس کا انکار بھی کفر سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ناسخ ان آیات بینات کا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی زمانہ اس کے تصرف کے منافی ہونے کا مقتضی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ماضی اور حال میں جاری رہا اور تا قیامت جاری وساری رہے گا۔ یہ سنت اور مشیت ایزدی ہے جس کو کوئی اسباب منقطع کرنے والا نہیں ہے۔

جس طرح آج مطابقت اور مناسبت کی وجہ سے بنی نوع انسان گروہ گروہ ہو رہے ہیں قیامت کے میدان میں بھی اسی کے مطابق، موافق نسبت وحال گروہ گروہ ہو جائیں گے۔ فاسقوں کا گروہ الگ ہوگا، منافقین کا الگ، کفار الگ اور مومن الگ ہو جائیں گے۔ ہر ایک پر حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ مطابق فرمان: فَبَصَرُکَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ سے ہر ایک دانا و بینا ہو جائے گا۔ فاسق دنیا میں لوٹنے کی آرزو کرے گا:

"وَلَوْتَرٰى اِذِالْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْارُؤُ وْسِهِمْ عِنْدَرَبِّهِمْ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَافَارْجِعْنَانَعْمَلْ صَالِحًااِنَّا مُوْقِنُوْنَ"

[السجدة: ۱۲]

"اور کاش کہ دیکھے تو جس وقت گنہ گار نیچے ڈالے ہوں گے سر اپنے نزدیک رب اپنے کے (کہیں گے) اے رب ہمارے، دیکھا ہم نے اور سنا ہم نے پس پھیر ہم کو کہ عمل کریں اچھے۔ تحقیق ہم یقین لانے والے ہیں۔"

منافق اپنی عادت کے موافق قسمیں اٹھائے گا اور خیال کرے گا کہ شاید اسی طرح جس طرح دنیا میں کار برآری کر لیا کرتا تھا آج بھی کام لے نکلے گا مگر بے سود۔ کیونکہ حقیقت ظاہر ہونے کے بعد جھوٹ اور

فریب کام نہیں دیتا۔آخر جب اہل ایمان کو اپنے مقام پر پہنچنے کیلئے

صراط

پر سے گزرنے کا حکم ملے گا تو اس پر خطر اور پر ظلمات راستہ کو طے کرنے کیلئے حسب مدارج اور موافق حال کا نور ایمانی مشعل راہ ہوگا۔منافق یہاں بھی اپنے حال کے موافق وہی سعی کرے گا اور دنیا میں اپنی عادت کی طرف مومنین سے سوال کرے گا کہ کیا میں تمہارے ساتھ نہ تھا؟

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْاانْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ
ارْجِعُوْاوَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ
بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍلَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ
وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ٥ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ
نَكُنْ مَّعَكُمْ"

[الحدید:۱۳،۱۴]

''اس دن کہ کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے ہیں،انتظار کرو ہمارا ہم بھی روشنی لیں نور تمہارے سے۔کہا جائے گا پھر جاؤ پیچھے اپنے پس ڈھونڈلاؤ نور پس مارا جائے گا درمیان ان کو کوٹ واسطے اس کے دروازہ ہے،اندر کی طرف جو ہے بیچ اس کے رحمت ہے اور باہر کی طرف جو ہے اس کی اس طرف سے ہے عذاب پکاریں گے ان کو کیا نہ تھے ہم ساتھ تمہارے۔''

جواب میں مومن مطلع کرے گا:

"قَالُوْابَلٰی وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰی
جَآءَ اَمْرُاللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ

''کہیں گے ہاں تھے تم،ولیکن فتنے میں ڈالا تھا تم نے جانوں اپنی کو اور منتظر تھے تم یعنی واسطے برائی کے ہمارے اور شک میں تھے تم اور فریب

الْغَرُوْرُ" دیا تھاتم کو آرزوؤں نے یہاں تک کہ آیا حکم
[الحدید:۱۴] خدا کا اور فریب دیا تھا تم کو ساتھ اللہ کے فریب
دینے والے۔"

متعدد صحیح حدیثوں میں صراحت ہے کہ یہ صراط میدان حشر اور جنت کے درمیان دوزخ پر کھینچی جائے گی جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ دس ہزار سال کی مسافت چڑھائی، دس ہزار سال کی راہ ہموار اور اترنے کیلئے بھی دس ہزار سال کی مدت درکار ہے۔ یاد رہے کہ یوم القیامۃ کی کل مدت پچاس ہزار سال مقدار ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

"تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ"
[المعارج:۴]

"چڑھیں گے فرشتے اور روح طرف اس کی بیچ اس دن کے کہ ہے مقدار اس کی برابر پچاس ہزار سال کے۔"

لیکن جیسے کہ حسب مدارج بعض پر یہ دن آسانی اور قلیل مدت میں گزر جائے گا۔ حتی کہ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ بعض کو اتنا ہی عرصہ معلوم ہوگا جتنا کہ دو نمازوں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ اسی طرح گو اس پل صراط سے گزرنا ہر انسان کا ضروری اور ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

"وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا"
[مریم: ۷۱، ۷۲]

"اور نہیں کوئی تم میں سے مگر گزرنے والا ہے اوپر اس کے سے۔ ہے اوپر پروردگار تیرے کے لازم فیصلہ کیا گیا۔ پھر نجات دیں گے ہم ان کو جو پرہیزگاری کرتے ہیں اور چھوڑیں گے ہم ظالموں کو بیچ اس کے گرے ہوئے۔"

لیکن گزرنے والے حسب مدارج گزریں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض تو اس پر سے بجلی کی سی تیزی سے گزر جائیں گے۔ بعض ہوا کی طرح اور بعض سرپٹ گھوڑے کی طرح۔ پھر شتر سوار کی مانند، پھر دوڑتے آدمی کی طرح، پھر پیدل چلنے کی طرح، بعض آہستگی سے اور بعض لڑکھڑاتے اور

ڈگمگاتے۔اسی طرح حسب حال باوجود بال سے باریک ہونے کے مومنین کیلئے یہ صراط حسب مراتب ومدارج وسعت رکھے گی۔تا آنکہ حدنگاہ تک فراخ ہوگی اور بجلی کی سی تیزی یا ہوا کی طرح گزرنے والے منزل مقصود پر پہنچ کر تعجب کریں گے نہ صراط دیکھی نہ دوزخ، تو جواب ملے گا کہ تمہارے گزرتے وقت صراط کو وسیع اور دوزخ کو سرد کر دیا گیا۔حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی قدس سرہٗ نے فتوح الغیب میں ایک حدیث شریف نقل فرمائی ہے کہ دوزخ مومن کو گزرتے وقت کہے گی کہ ''اے مومن، جلدی سے گزر جا کہ تیرے نور نے میرے شعلے کو سرد کر دیا۔''

علیٰ ہذا القیاس نور بھی حسب مدارج وحسب مراتب ہی مرتب ہو کر ظہور میں آئے گا، چنانچہ حدیث شریف میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ بعض مومنوں کا نور اس قدر روشن ہوگا کہ مدینہ طیبہ سے عدن تک کی مسافت کو روشن اور منور کر دے گا۔بعض کا اس سے کم، بعض کا کھجور کے درخت کے برابر اور بعض کا اپنے قد کے مطابق بعض کا صرف اتنا کہ قدموں کی جگہ کو روشن کرے گا۔یہاں تک کہ انگوٹھے کے ناخن پر ہوگا جو جگنو کی طرح کبھی چمکے گا اور کبھی بجھ جائے گا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سَمِّنُوْا ضَحَايَاكُمْ فَاِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ یعنی خوب موٹی تازی قربانیاں کیا کرو کیونکہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صراط دراصل صراط المستقیم پر چلنے کی مثالی صورت ہے۔یعنی میدان دنیا میں انسان احکام شریعت اور صراط المستقیم پر جس قدر ثابت قدمی اور پامردی سے گامزن ہوگا اسی قدر یہ صراط اس کیلئے آسان ہوگی۔اور جس قدر نسبت محمدی سے نور حاصل کرے گا اسی قدر وہ فی الدنیا وفی الآخرۃ ہر میدان میں اس کیلئے مشعل راہ ہوگی۔جیسا کہ فرمایا:

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" [الانعام:۱۲۲]	''کیا جو شخص کہ تھا مردہ پس جلایا ہم نے اس کو اور کیا ہم نے واسطے اس کے نور، چلتا ہے ساتھ اس کے بیچ لوگوں کے کیا وہ مانند اس شخص کے ہے کہ صفت اس کی یہ ہے کہ بیچ اندھیروں کے

نہیں نکلنے والا اس سے۔''

اسی نور کا یہ ظہور تام ہے اور یہی ظلمت کفر ونفاق ہے جو اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوئی۔ آخر دونوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس کے اندر کی طرف اہل ایمان اور باہر کی جانب منافق مطابق: نَـذَرُ الظّٰـلِـمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا [1] جہنم کی تہہ میں پہنچ جائیں گے۔ رَبَّـنَـا لَا تَـجْـعَـلْـنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ o وَنَـجِّنَا بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ [2]

دوزخ اور جنت:

''وَسِیْقَ الَّـذِیْـنَ کَفَرُوْا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰی اِذَا جَـآءُ وْهَـا فُتِـحَـتْ اَبْـوَابُهَـا وَقَـالَ لَهُمْ خَـزَنَتُهَا اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰـتِ رَبِّـکُـمْ وَیُـنْـذِرُوْنَـکُـمْ لِـقَـآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا قَـالُـوْا بَـلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَةُ الْعَذَابِ عَـلَـی الْکٰفِرِیْنَ o قِیْـلَ ادْخُـلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ o وَسِیْقَ الَّـذِیْـنَ اتَّـقَـوْا رَبَّهُـمْ اِلَـی الْجَنَّةِ زُمَـرًا حَتّٰـی اِذَا جَـآءُ وْهَـا وَفُتِـحَتْ اَبْوَابُهَـا وَقَـالَ لَهُمْ خَـزَنَتُهَـا سَـلٰـمٌ عَـلَیْـکُـمْ طِبْتُمْ فَـادْخُلُوْهَـا خٰلِدِیْنَ''

[الزمر: ۸۱ تا ۸۳]

''اور ہانکے جائیں گے وہ لوگ کہ کافر ہوئے تھے طرف دوزخ کی گروہ گروہ۔ یہاں تک کہ جب آئیں گے اس کے پاس کھولے جائیں گے دروازے اس کے اور کہیں گے واسطے ان کے چوکیدار اس کے کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے پڑھتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں پروردگار تمہارے کی اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن کے ملنے سے کہیں گے کیوں نہیں؟ ولیکن ثابت ہوئی بات عذاب کی اوپر کافروں کے، کہا جائے گا داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے ہمیشہ رہنے والے بیچ اس کے۔ پس بری ہے جگہ تکبر کرنے والوں کی۔ اور چلائی جائیں گی سواریاں ان لوگوں کی جو ڈرتے تھے

۱۔ چھوڑیں گے ہم ظالموں کو بیچ اس کے گرے ہوئے۔ ۲۔ اے رب ہمارے، نہ کر ہمیں ساتھ قوم ظالموں کے اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

رب اپنے سے طرف بہشت کی گروہ گروہ یہاں تک کہ جب آئیں گے اس کے پاس اور کھولے جائیں گے دروازے اس کے اور کہیں گے واسطے ان کے چوکیدار اس کے سلامتی ہو تم پر، خوشحال ہوئے تم۔ پس داخل ہو اس میں ہمیشہ رہنے والے۔"

مطابق فرمان اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ کی تفریق ہو جائے گی اور دونوں کو اپنے اپنے مقام کی طرف چلنے کا حکم دیا جائے گا۔ ہر ایک دوزخی اور جنتی کے مدارج مختلف ہوں گے اور وہ بھی حال کے موافق ہی ظہور ہو گا۔

دوزخ

کے سات در کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مطلع فرمایا ہے:

"وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ"
[الحجر: ۴۳، ۴۴]

"اور تحقیق دوزخ جگہ وعدے ان کے کی ہے سب کی۔ واسطے اس کے سات دروازے ہیں۔ واسطے ہر ایک دروازے کے ان میں سے ایک حصہ ہے تقسیم کیا گیا۔"

ان ساتوں کے نام قرآن مجید اور حدیث شریف میں واضح ہیں۔ چنانچہ پہلے کا نام **جهنم** ہے اور دوسرے کا **لظی**، تیسرا **حطمه**، چوتھا **سعیر**، پانچواں **سقر**، چھٹا **جحیم** اور ساتواں **هاویه**۔ ان کے علاوہ اور بھی نام مذکور ہیں جو انہیں میں کے بعض خاص گوشے اور حصے ہیں۔ مثلاً ویل، غی اور زمہریر وغیرہ۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل مطلوب نہیں۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہر قسم کی توضیح و تفصیل موجود ہے اور انواع و اقسام کے عذاب کا ذکر ہے۔ مختلف قسم کے بد سے بدتر کھانے پینے کی چیزوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ جیسے کہ ضریع و زقوم اور حمیم و غساق اور غسلین قطران وغیرہ۔

یہاں تو صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہر ایک دوزخی کا عذاب اپنے ہی حال اور حجاب کے موافق ظہور میں آئے گا۔ مثلاً کفار کیلئے عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور عَذَابُ الْحَرِيْقِ (بہت بڑا عذاب اور جلنے کا عذاب) کے الفاظ فرمائے ہیں۔ منافقین کے لئے عَذَابٌ اَلِيْمٌ (دردناک عذاب) اور گندے کام

کرنے والوں کیلئے عَذَابٌ غَلِیظٌ (گندا عذاب) کی وعید فرمائی ہے۔ سود خوار کے متعلق فرمایا:

"لَایَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذَالِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اِنَّمَاالْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" [البقرۃ:۲۷۵]

"نہیں کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ شخص کہ باؤلا کرتا ہے اس کو شیطان آسیب سے۔ یہ اس واسطے ہے کہ انہوں نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ بیع بھی مثل سود کے ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔"

پاگلوں اور خبطیوں کی طرح کھڑا ہوگا۔ کیونکہ وہ خداوند جل وعلا کے صریح احکام میں نفس کی شرارت سے تاویل کرتا ہے۔

یتیموں کا مال کھانے والے کے متعلق فرمایا کہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس جس نوعیت کے حجاب میں محجوب ہوا، اسی کیفیت سے عذاب کا ظہور ہوگا اور ان میں جس قدر زیادہ سخت ہوگا اسی قدر زیادہ اسفل اور سخت عذاب میں گرفتار ہوگا۔ حتی کہ منافق سب سے نیچے ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" [النساء:۱۴۵]

"یقیناً منافق سب سے نچلے درکے آگ کے میں ہوگا۔"

مومنین نور ایمانی کی بدولت فسق وفجور کے اندازہ پر عذاب کی سختی اٹھا کر خلاصی پا جائیں گے اور کفار ومشرکین اور منافقین ابدی عذاب میں مستغرق رہیں گے۔

"یَوْمَ یَاتِ لَاتَکَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِہٖ فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ o فَاَمَّاالَّذِیْنَ شَقُوْافَفِی النَّارِلَھُمْ فِیْھَازَفِیْرٌوَّشَھِیْقٌ o خٰلِدِیْنَ فِیْھَامَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّامَاشَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَایُرِیْدُ o وَاَمَّاالَّذِیْنَ سُعِدُوْافَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا

"جس دن آئے گا نہ بولے گا کوئی جی مگر ساتھ حکم اس کے کے پس بعضے ان میں سے بد بخت ہیں اور بعضے نیک بخت ہیں۔ پس جو لوگ کہ بد بخت ہوئے پس بیچ آگ کے ہیں، واسطے ان کے چلانا ہے بیچ اس کے آواز باریک سے اور آواز موٹی سے، ہمیشہ رہنے والے بیچ اس کے جب

مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّامَاشَاءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَمَجْذُوْذٍ'
'[ہود:۱۰۸،۱۰۵]

تک کہ رہیں آسمان اور زمین مگر جو چاہے پروردگار تیرا۔ تحقیق پروردگار تیرا کرنے والا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ اور جو لوگ کہ نیک بخت کئے گئے ہیں پس بیچ بہشت کے ہیں ہمیشہ رہنے والے بیچ اس کے جب تک کہ رہیں آسمان اور زمین مگر جو چاہے پروردگار تیرا۔ بخشش ہے نہ کاٹی گئی۔"

جنت:

جنت باغ اور ہر قسم کے انتہائی آرام و آسائش اور تعیش کی جگہ کا نام ہے اور اس کے بھی سات بلکہ آٹھ درجے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے بہشت بھی کہتے ہیں۔ جو جنت ماویٰ، دارالمقام، دارالسلام، جنت خلد، جنت نعیم، جنت عدن کے نام سے مشہور ہیں اور آٹھواں فردوس ہے۔ کسی کے محلات چاندی سے بنے ہیں، کسی کے سونے سے، کوئی موتی سے تیار ہوا ہے اور کوئی صرف نور سے۔ قرآن مجید اور احادیث شریف میں ان کے نعمات وغیرہ ہر قسم کی کافی تفصیل موجود ہے۔ بہرکیف یہ بھی اہل جنت کے حال کے معنوں کی عبارت کے مطابق ہی ظہور پذیر ہوگا۔ میدان دنیا میں ہر ایک مومن کا حال مختلف ہے اور اسی کے موافق عمل۔ اور ہر عمل کا نتیجہ اس کی نیت سے وابستہ ہے۔

پہلا طبقہ مومنین کا مجاہدین سے ہے، اور دوسرا مشاہدین و مقربین سے۔ پہلا طبقہ باوجود ایمان وایقان رکھنے کے صفات بشریت کے مطابق تمام شہوات حیوانیہ کا حامل، تمام خواہشات انسانیہ کا طالب، ہر فخر وستائش کا شیدا اور تمام حظوظ ولذات کا فریفتہ، گویا نفس امارۃ بالسوء کا مرید ہوتا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ خوف خدا سے ڈر کر ان سب صفات سے نفور اور ان کی برائی سے دانا اور مفرور ہوتا ہے۔ مطابق شریعت عزاو فرمان ذوالجلال والاکرام:

"وَاَمَّامَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰیo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی"
[النّٰزعٰت: ۴۱،۴۰]

"اور اپر جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے آگے پروردگار اپنے کے اور روکا نفس اپنے کو خواہش سے پس بے شک جنت وہی ہے جگہ رہنے کی۔"

کے ان صفات میں مجاہد ہوتا ہے۔ اگر وہ اسی مقام اور اسی حال میں مرجائے تو اس کے لئے جنت حلال کر دی جاتی ہے۔ چونکہ فرمان عزیز الحکیم ہے:

"یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ وَّفِیْهَامَاتَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ وَاَنْتُمْ فِیْهَاخٰلِدُوْنَ"

[الزحرف: ۷۱]

"لئے پھریں گے اوپر ان کے طباق سونے کے، اور آبخورے۔ اور بیچ اس کے جو کچھ چاہیں اس کو نفس اور لذت پکڑیں آنکھیں۔ اور تم اس کے بیچ ہمیشہ رہنے والے ہو۔"

کہ جنتی نفس کی اشتہا کے مطابق جو کچھ چاہے گا پائے گا اور ہر طرح کی من مانی عیش میں ہوگا یعنی موافق حال طلب اور طلب اور خواہش کرنے والا اور اسی کے مطابق حصول اور مقصود کو پانے والا ہوگا۔ ہاں وہ چیزیں جو اس کے نفس میں بذاتہٖ دکھ دینے والی مثلاً حسد، کینہ وغیرہ باقی ہوں گی وہ عین نوازش اور رحمت سے دور فرما دیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

"وَنَزَعْنَامَافِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًاعَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ"

[الحجر: ۴۷]

"اور نکال ڈالا ہم نے جو کچھ بیچ سینوں ان کے تھا ناخوشی سے، بھائی ہو جائیں گے اور تختوں کے آمنے سامنے۔"

اور ایسے شخصوں کو اصحاب الیمین کا نام دیا یعنی جن کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوگا:

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ مَااَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ وَّفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ لَّامَقْطُوْعَةٍ وَّلَامَمْنُوْعَةٍ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ اِنَّااَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًاعُرُبًااَتْرَابًالِّاَصْحَابِ الْیَمِیْنِ ثُلَّةٌمِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّةٌمِّنَ الْاٰخِرِیْنَ"

[الواقعة: ۲۷ تا ۴۰]

"اور داہنی طرف والے، کیا ہیں داہنی طرف والے بیچ بیریوں کانٹے دور کئے ہوئے اور کیلے تہہ بہ تہہ، اور سایہ لمبا، اور پانی گرتا ہوا اور میوے بہت نہیں کاٹا گیا اور نہ منع کیا گیا، اور بچھونے بلند تحقیق ہم نے پیدا کیا عورتوں ان کی کو پیدا کرنا پس کیا ہم نے ان کو کنواری، سہاگ والیاں، ہم عمر واسطے داہنی طرف والوں کے۔

جماعت کثیر پہلوں میں سے اور جماعت کثیر ہے پچھلوں میں سے۔''

دوسرے طبقہ کے لوگ بھی کسی قدر انہی سے مطابقت رکھنے والے ہوں گے لیکن یہ ان سے سبقت کرنے والے یعنی آگے نکل جانے کی وجہ سے ان سے مقرب ہوں گے۔اور یہ اس لئے کہ وہ میدان دنیا میں صرف مجاہد ہی نہ رہے بلکہ اس مجاہدہ کے حصول کو پائے ہوئے یعنی تغیر حال کے مفاد کو حاصل کر چکے ہوں گے۔ان کا حال نفس لوامہ کے موافق ہوگا۔گاہے لینت قلب سے حظ اٹھانے والے اور گاہے اس سے بیگانگی کو پانے والے یعنی کبھی تو دنیا و مافیھا سے اعراض اور اس کے عیوب سے نفور اور کبھی اس کے فکر میں مشغول۔بمصداق:

گاہے در دوزخ روی سازی مقام　　گاہے در جنت روی اے خوش خرام[1]

بموجب فرمان ایزد متعال ذوالجلال والاکرام:

"وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ"　[الرحمن:۴۶]

''اور واسطے اس شخص کے کہ ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے آگے رب اپنے کے دو باغ ہیں۔''

دو جنتوں کے صاحب ہیں۔اور اس لئے ایسے شخص دو بلا میں مبتلا ہوتے ہیں۔باوجود اپنے حال سے علم رکھنے کے استقامت سے عاجز ہوتے ہیں۔معصیت اور ثواب کو پہچاننے والے،ہر نشیب و فراز کو جاننے والے،نفس کی حرکات سے بیزار اور یاد الٰہی میں قرار پانے والے ہوتے ہیں۔جنت نعیم کے فدا،نعمت عظمٰی کے شیدا،اپنے اعمال میں بے ریا،اپنی کشتی ہستی کے ناخدا،طالب رضا،اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے حال سے دو وجہ پر متحیر اور مبتلا،ایک تو پرہیز اور اتقا کے کامل ہونے سے خائف،دوسرے اعمال کو محل قبولیت میں مشرف ہونے سے ترساں اور اپنے آپ سے نالاں،بمصداق:

گر نیفتادم ندیدم کعبۂ مقصود را　　درمیان ماہمیں استادگی دیوار بود[2]

۱۔ کبھی تو دوزخ میں جاتے ہوئے اپنا مقام بناتا ہے اور کبھی اے خوش خرام تو جنت میں جاتا ہے۔

۲۔ اگر میں (خشیت الٰہی سے) نہ گروں تو میں کعبہ مقصود کو نہیں دیکھوں گا ہمارے درمیان یہی گرنا ہی دیوار ہے۔

ایسے لوگوں کو اَصۡحَابُ الۡمَیۡمَنَه کا نام دیا ہے یعنی داہنی طرف والے اور ان کے حق میں فرمایا ہے:

"وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ o اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ o فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ o ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ o وَقَلِیۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ o عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ o مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡهَا مُتَقٰبِلِیۡنَ o یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ o بِاَکۡوَابٍ وَّاَبَارِیۡقَ وَکَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ o لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَلَا یُنۡزِفُوۡنَ o وَفَاکِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ o وَلَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ o وَحُوۡرٌ عِیۡنٌ o کَاَمۡثَالِ الـلُّؤۡلُؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ o جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ o لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِیۡمًا o اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا"

[الواقعة: ۱۰ تا ۲٦]

"اور آگے نکل جانے والے آگے ہیں سب سے، یہ لوگ مقرب ہیں بیچ بہشتوں نعمت کے۔ بڑی جماعت ہے پہلوں میں سے اور تھوڑی پچھلوں میں سے اوپر چارپائیوں سونے کی تاروں سے بنی ہوئی کے ہیں۔تکیہ کئے ہوئے اوپر ان کے آمنے سامنے پھریں گے اوپر ان کے لڑکے ہمیشہ رہنے والے ہاتھ آبخوروں کے اور آفتابوں کے اور پیالوں کے شراب صاف سے۔نہیں سر دکھائے جائیں گے اس سے اور نہ بیجا بولیں گے اور میوے اس قسم کے کہ پسند کریں۔اور گوشت پرندوں کے اس قسم سے کہ چاہیں گے۔اور عورتیں ہیں بڑی آنکھوں والیاں مانند موتیوں چھپائے ہوئے کے۔بدلہ اس چیز کا کہ تھے وہ کرتے نہیں سنیں گے بیچ اس کے بیہودہ اور نہ گناہ کی باتیں مگر کہنا سلام ہے سلام ہے۔"

ان کے علاوہ قرآن مجید میں جگہ جگہ پر ان دونوں گروہوں کیلئے مولیٰ کریم نے مجمل اور مفصل تعریف سے جنت کے وعدے فرمائے ہیں۔اور کہیں ان کے اہل کو ابرار کے نام سے ذکر کیا ہے کہیں متقین کے نام سے کہیں صابرین اور شاکرین وغیرہ۔اور جنت کے یہ ساتوں درجے مطابق اعمال واخلاص ہر ایک کے حسب حال عنایت فرمائیں گے۔

تیسرا طبقہ:

یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی مناسبت نبیوں اور رسولوں کے حال سے ہے۔ان کا جینا،ان

کا مرنا، بلکہ کھانا، پینا، سونا اور چلنا پھرنا، تمام حرکات وسکنات لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا مصداق ہوتی ہیں۔ان کا بیان نہ تقریر سے ہوسکتا ہے نہ تحریر سے۔دنیا و مافیھا سے دور، ذکر اللہ سے مسرور، طالب خدا۔رغبت کی گئی چیزوں سے دل کو ہٹائے ہوئے، ان کے اثرات سے خلاصی پائے ہوئے، اپنے قلب اور اس کی محبت کو خدا سے لگائے ہوئے، مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰى کے معنوں کو پائے ہوئے فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کے سبق سے راستہ کے خس وخاشاک کو ہٹائے ہوئے، ولایت کے میدان میں، قدم ثبات کو جمائے ہوئے، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے اعراض، دارین کی اغراض سے اجتناب، يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کی دولت کو پائے ہوئے، طلب خدا اور اس کی رضا میں جان پر کھیلنے والے ہوتے ہیں۔ان کا حال فرمان مولیٰ کریم:

"اُولٰئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ"

[المؤمنون: ١٠، ١١]

"یہ لوگ وہی ہیں وارث جو ورثہ لیں گے جنت فردوس، وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

کے موافق ہے۔اور یہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور بلند ترین مقام ہے جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے باب صفۃ الجنۃ میں حدیث ہے:

"وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِي الْجَنَّةِ مِائَةُ دَرَجَةٍ مَابَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَابَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ الْفِرْدَوْسُ اِعْلَاهَا دَرَجَةً مِنْهَا تَفْجُرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ الْاَرْبَعَةُ وَمِنْ فَوْقِهَا يَكُوْنُ الْعَرْشُ فَاِذَا سَأَلْتُمْ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ"

[رواہ الترمذی]

"اور روایت ہے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بہشت میں سو درجے ہیں درمیان ہر دو درجوں آسمان اور زمین کے ہیں اور فردوس سب جنتوں سے بلند تر ہے از روئے درجے کے۔اسی سے رواں کی جاتی ہیں چاروں نہریں بہشت کی اور اوپر فردوس کے عرش ہے۔پس جب مانگو تم اللہ تعالیٰ سے تو مانگو اس سے فردوس۔"

اور ایک حدیث شریف میں اس کے مفاد کی اس طرح صراحت فرمائی ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَدْنٰی اَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً لَّمَنْ يَّنْظُرُ اِلٰی جِنَانِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَنَعِيْمِهٖ وَخَدَمِهٖ وَسُرُرِهٖ مَسِيْرَةَ اَلْفِ سَنَةٍ وَّاَكْرَمَهُمْ عَلَی اللّٰهِ مَنْ يَّنْظُرُ اِلٰی وَجْهِهٖ غُدْوَةً وَّعَشِيَّةً ثُمَّ قَرَاَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمَذِیُّ

[مشکوٰۃ باب فی رویۃ اللہ تعالیٰ]

"روایت ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ تحقیق ادنیٰ بہشتوں کا از روئے مرتبہ کے البتہ وہ شخص ہے کہ دیکھے گا طرف اپنے باغوں کے اور اپنی عورتوں کے اور اپنی نعمتوں کے اور اپنے خدمت گاروں کے اور اپنے تختوں کے مقدار مسافت ہزار برس اور گرامی تر ان کا نزدیک اللہ تعالیٰ کے وہ شخص ہوگا کہ دیکھے گا طرف منہ مبارک اس ذات پاک کے صبح اور شام، پھر پڑھی حضرت نے یہ آیت: کتنے منہ اس دن تروتازہ اور خوش وخرم ہوں گے طرف رب اپنے کے دیکھنے والے۔"

اسلام وایمان اور دین الحق کا مفاد اصل الاصول مقصود کا حصول منعم حقیقی کے سوانہیں ہے کیونکہ کل نعمات دینی ہوں یا دنیوی منعم حقیقی کے مقابلہ میں بیگانگی کا حکم رکھتی ہیں۔ تو جب تک تمام حصول دنیا وآخرت سے بیگانگی نہ ہو، مولیٰ کریم کے ساتھ محبت اور وفا میں یگانگی حاصل نہیں ہوسکتی۔ بمصداق:

سب سے بیگانہ ہے اے یار شناسا تیرا
حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

اور یہ اس لئے کہ محبت میں ہر غرض حجاب ہوا کرتی ہے۔ ایسے شخصوں کیلئے دونوں جہان راستہ کا حجاب ہی ہوتے ہیں۔ ان کا آرام واطمینان سوائے ذات پاک کے کسی حصول سے نہیں ہوسکتا۔

مپندار این کہ مہرت از دل عاشق رود ہرگز

چومیرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

مطابق فرمان ایزد متعال اِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَهٰهَا اپنے رب کی طرف ان کی انتہا ہے اور اسی ذات کے ساتھ وہ مطمئن۔ اس لئے ان کے موافق حال فرمان ذوالجلال والاکرام ہے:

"یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۝ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً ۝ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ" [الفجر:۲۷ تا ۳۰]	"اے نفس مطمئنہ! پھر جا طرف پروردگار اپنے کے کہ خوش ہے تو پسند کی گئی پس داخل ہو تو بیچ بندوں میرے کے اور داخل ہو بیچ جنت میری کے۔"
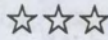
ضمیمہ

الٰہیات

توحید

توحید وحدانیت پر حکم کے سوانہیں ہے۔ یعنی کسی غیر کے حکم کے سوااپنی وحدانیت پر حاکم ہونااور وحدانیت میں ثابت ماسوائے کا کمال رکھنااور اپنی ذات سے ہر قدرت کے ساتھ قادر ہونا ہوتا ہے۔ اور یہ سب تعریف اس لم یزل ولایزل، بے مثل وبے مثال، ذوالجلال والاکرام ہی کیلئے ہے۔ گو توحید میں سوائے حال کے کلام کرنا جہالت ہے اور اس کے ادراک میں عقل محض عاجز اور اس پر ایمان رکھنا صحت کے ساتھ فرض ہے ازیں سبب اس کی معرفت میں بندوں کیلئے جس قدر تنگی واقع ہوئی ہے اور کسی علم ویافت میں نہیں ہوئی۔ اور یہ اس لئے کہ عقل کی دوڑ عالم معلومات تک محدود ہے اور معرفت کا حصول میدان معروفات کے سوانہیں ہے۔ اسی وجہ پر تحریر وقال بغیر حال کے سوائے خطا کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم توحید کا بیان تین نوع پر منقسم ہے:

(۱) توحید فی الذات (۲) توحید فی السر (۳) توحید فی الخلق

توحید فی الذات:

الان کما کان جس کا نہ اول نہ آخر، نہ ابتداء نہ انتہا، نہ کمی نہ بیشی۔ تغیر وتبدل سے منزہ، عروج ونزول سے مبرا، ظہور وبیان سے ورا، ذات معلّی کے بغیر نہ کسی کا علم، نہ کوئی لوح نہ قلم، نہ کوئی ملک نہ جن، نہ

زمین نہ آسمان، سوائے متحقق بالذات کے نہ کسی کا علم نہ کسی کا نشان۔ محض اپنی وحدانیت میں تنہا۔ عبادت کے میدان میں نہ کوئی عباد نہ معبود، نہ ساجد نہ مسجود، نہ واجد نہ موجود، نہ خالق نہ مخلوق، نہ سابق نہ مسبوق، نہ مردود نہ مقبول، نہ اللہ نہ رسول، نہ نزدیک نہ دور، اپنی ذات معلیٰ میں صفت بالذات بلاظہور کے ساتھ احد، نہ کوئی حصر نہ حد، کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ ۱

بمصداق:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توحید فی السر:

جب اس خالق کائنات نے ذات کا ظہور چاہا تو اول لوح محفوظ اور قلم کی طرف مرید ہوئے اور کَانَ اَمْرُاللّٰہِ مَفْعُوْلًا ۲ کی قادریت نے کلمہ طیبہ سے نقش ونگار توحید کا ظہور فرمایا یعنی لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ ۳ کا حکم نوری تخلیق میں رونق افروز ہوا۔

اب یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب لوح محفوظ پر سوائے کلمہ طیبہ کے کوئی نوشت نہ تھی، یا صاف معنوں میں سوائے ذات احد کے کوئی شے نہ تھی، تو لا کس کی نفی پر دال تھا؟ نحو کے قاعدے کے لحاظ سے لانفی جنس کا ہوتا ہے۔ جب غیر تھا ہی نہیں تو پھر یہ نفی کس الہ کیلئے ہوئی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ نحو کے لحاظ سے نفی کی نفی اثبات پر دال ہے جو اثبات کی تصدیق کے سوا کوئی مفاد نہیں رکھتی۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لا محض اثبات کا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص ایک مکان میں تنہا کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں کوئی میرے سوا اس مکان میں۔ تو اس کی یہ نفی اس کی تنہائی اور احدیت کیلئے اثبات کا حکم رکھے گی۔

توحید فی الخلق:

اس کے دو رخ ہیں، ایک مولیٰ کریم سے مخلوق کی طرف اور دوسرا مخلوق سے اللہ تعالیٰ کی طرف۔

۱۔ کہہ وہ اللہ ایک ہے۔ ۲۔ حکم اللہ کا کیا گیا۔ ۳۔ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

ذات معلیٰ کی طرف سے مخلوق کی جانب قادریت اور معیت کی رو سے توحید کا ظہور ہے جس کا علم سوائے حال اور عرف کے محال ہے۔ تاہم اصل الاصول توحید اور اس کی حقیقت اس کے سوا مطلق نہیں ہے۔

دوسری بنی نوع انسان سے ذات معلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا حصول حجابات کے دور ہونے کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کئی وجہ پر ہے جن میں سے دونوع معروف ہیں۔ ایک تو دلیل اور علم الیقین کی رو سے یُؤمنون بالغیب کے مطابق غیب پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور دوسرے عین الیقین کی رویت سے حق الیقین تک پہنچنے والے ہوتے ہیں لیکن صرف دلیل سے توحید میں کلام سوائے دلیل عینی کی رویت پر جہالت ہے۔ اور رویت سے توحید کلام حسب الحال صحیح۔ بمصداق:

ہر کہ نادیدہ نام او گوید
مشرک ست وفضول و ناہموار

اور یہ اس لئے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ایقان کے میدان میں محض تخیل، ظن اور تصور زعمی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اور وہ لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثل ان تمام اوہام سے منزہ اور مبرا ہے۔ گو ذات معلیٰ پر مع صفات کے ایمان رکھنا اور مطابق احکام اسلام اور شریعت پر عمل کرنا باعث نجات اور حصول نعمات کا مقتضی ہے۔ لیکن اصل مقصود اور حقیقت فی الدنیا وفی الاخرۃ مفقود اور صحت حقیقت اس سے ورا، خصوصاً توحید میں کلام اور تعریف حقیقت کے خلاف اور اس پر حکم لاحاصل۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ اصل کے خلاف ہوگیا ہے اور ہر جائز سبیل کو نادانی کی وجہ سے شرک قرار دیا ہے۔ حالانکہ بغیر سبیل کے کوئی فعل بھی درست نہیں ہوسکتا۔ سنت اللہ اسی طرح جاری اور ساری ہے اور اسی طرح رہے گی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [۱] کے مطابق تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مولیٰ کریم نے اپنی ذات معلیٰ کے ظہور کیلئے اسباب تخلیق کو ملازم کیا ہے۔ یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ ذات معلیٰ مع اپنی صفات ذاتیہ کے وحدانیت میں واحد تھی تو ظہور ذات کیلئے عالم ارواح کی طرف مرید ہوئے۔ پھر اس کے ظہور کیلئے اسباب حدث کی طرف ارادہ فرمایا تو کل موجودات میں اپنی وحدانیت کا ظہور صفت بالفعل کی صورت میں ہویدا کیا۔ ان سب منازل میں

۱۔ ہرگز نہ پائے گا تو اللہ تعالیٰ کے طریقے میں تبدیلی۔

حدث کے سوا قدم کی حقیقت پر توحید واجب الوجود کے رو سے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ [1] کے مترادف اپنی تعریف میں معروف ہوئے مطابق هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اپنے کمال علم میں اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا کی قدرت کاملہ سے محاط ہوئے۔ مطابق کلام عارفاں ''جو حدث سے قدم کونہیں پہچانتا اپنی گفتار میں جاہل ہوتا ہے۔'' یہ مفاد حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اس ذات پاک کی توحید ذاتیہ کا انحصار محض ذات سے ہے۔ اور ظہور توحید سری ہو یا ظاہری صفت بالذات کے تصرف سے صفت بالفعل کی طرف منسوب ہے۔

گو بے مثال کیلئے ہر مثال بیگانگی ہے تاہم فہمید کیلئے یوں قیاس کرنا چاہئے کہ کوئی اصل تغیر کا محل نہیں رکھتی، اور فرع کیلئے تغیر روا ہوتا ہے۔ اصل فرع کے سوا اپنی صحت حال پر استقلال رکھتا ہے اور فرع سوائے اصل کے کوئی شے نہیں ہے۔

لیکن اس مثال سے یہ مفاد حاصل کرنا چاہیے کہ اس اصل اور فرع اور اس کی مثال سے وہ ذات معلیٰ پاک ہے۔ کیونکہ ہر صفت ذاتیہ کے تصرف سے صفت بالفعل اس کے فعل کے سوا ذات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ ہر آن، ہر زمان، ہر صورت و حقیقت میں خداوند کریم اپنی احدیت میں الان کما کان ہی ہیں۔ محض ذات کو مخلوق سے خالقیت کی نسبت ہے۔ جیسے رب کو ربوبیت سے، قدرت کو قادریت سے، ارادہ کو مرید سے اور حیاتی کو حی سے مناسبت ہے۔ یہ تمام بالفعل کا ظہور ہے۔ اور صفت بالفعل کا تعلق صفت بالذات سے ہے، اور صفت بالذات کا ذات سے۔ ان سب صفات فعلیہ و ذاتیہ کا اصل الاصول ذات محض ہے، اس لئے ہر حدث اور تخلیق منازل کے نشیب و فراز سے نزول و عروج کے رو سے تعلق واحد ہے۔ تعلق ذاتیہ کیلئے یہ منازل سری یا ظاہری، ذات کیلئے قرب اور بعد کا باعث نہیں، یہ ہمارے عارضہ کی وجہ سے ہے اور وہ اس طرح کہ ہر ایک اپنے حال کی وجہ سے ایک مقام کا مقیم ہے، نزول ہو یا عروج، کفر ہو یا اسلام بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [2] کی وجہ پر اپنی سرشت کے مطابق تقدیر معلق کے رو سے، یا حد سے گزر جانے کے بعد صفات فعلیہ کے تصرف سے کسی نہ کسی صفت رحمی یا غضبی، نوری یا ناری، محبی یا عدوی، ہر مقام و محل

۱۔ تم جدھر بھی پھرو ادھر ہی منہ اللہ تعالیٰ کا۔ ۲۔ بسبب اس چیز کے کہ کماتے تھے۔

میں خداوندی صفت غفاری یا جباری سے ہرایک تعلق رکھتا ہے۔ بدیں وجہ وحدانیت کا تصرف اس کے حال کے مطابق من اللہ ہوا کرتا ہے۔اس لم یزل کی احدیت کے قرب میں کسی صفت یا فعل کی وجہ سے دوری کا مقتضی نہیں ہوسکتا۔

یار نزدیک تر از من بہ من ست

ویں عجب ترکہ من از وے دورم

کیونکہ حجابات کا حائل ہونا ہماری ہی طرف سے اور ہمارے ہی لئے ہے۔ خداوند جل وعلا کی ذات اور احدیت کیلئے نہ کوئی حجاب ہے اور نہ کوئی بعد اور نہ ہی روا ہوسکتا ہے۔ ہرایک کا مقام اپنے حال کے رو سے میدان احدیت میں معلق ہے۔ مثلاً کافر کو کفر کی وجہ سے ذات کے ساتھ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ [1] کی نسبت ہے۔ اور منافق کو اپنے نفاق کی وجہ سے اور فاسق کو اپنے فسق کی وجہ سے۔ مومن باعمل کو اپنے ایمان سے، ابرار کو اپنے نیک اعمال سے اور مقرب کو قرب سے، اور ولی کو دوستی کے رو سے، صدیق کو صدق کی وجہ سے، نبی کو نبوت اور مرسل کو رسالت کی وجہ پر ذات اور احدیت سے نسبت ہے۔ گو من جانب اللہ جل شانہ احدیت کی رو سے کوئی فرق نہیں مگر تعلق ذاتی کے سوا صفاتی کا از حد اختلاف ہے اسی لئے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ہمارے ہی عارضہ کی وجہ پر تفصیل ہے۔ ہمارا ہر وصف خداوند تعالیٰ کی صفات کا نتیجہ ہے اور اللہ جل شانہ کی شان ربوبیت کا فعل ہمارے ظاہر و باطن میں متصرف ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک توفیق سرشتی کی وجہ پر، دوسرا اضافیہ۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ" [الانعام: ۱۵۱]

''ہم روزی دیتے ہیں تم کو اور ان کو۔''

"نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ٥ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ٥ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ" [الواقعة: ۵۷تا۵۹]

''ہم نے پیدا کیا ہے تم کو پس کیوں نہیں مانتے تم۔ کیا پس دیکھا تم نے جو منی ڈالتے ہو تم، کیا تم پیدا کرتے ہو اس کو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں''

۱۔ پس دوری ہے واسطے اس قوم کے جو ایمان نہیں لاتی۔

''اَفَرَءَیْتُمْ مَّاتَحْرُثُوْنَ ٥ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ''[الواقعة:٦٣،٦٤] ''کیا پس دیکھا تم نے جو بوتے ہو کیا تم کھیتی کرتے ہو اس کو یا ہم کھیتی کر دیتے ہیں؟''

ان آیات بینات سے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ظہور ہوتا ہے جو اس کے فعل کے مترادف ہے۔ صفت بالفعل کا ظہور الی الخلق ہے جو محدث اور تغیر کا محل ہے اور باوجود اسفل اور مذموم ہونے کے قابل ستائش بھی ہے۔ کیونکہ ہر تقسیم، ہر نوع علم، ہر ظہور بلکہ معرفت کا سبب ہے اور مولیٰ کریم کا مقتضی اس حدث سے حصول علم اور عرف ہے تا کہ اس حدث اور نزول سے عروج کی طرف فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ [1] کا سبق حاصل کرے اور حدث سے قدم کو پہنچانے کیلئے توفیق من اللہ کے راستہ مقصود کو پہنچے، بندہ اور اللہ جل شانہ کے درمیانی علم کا عرف حاصل کرے۔

اسفل سے لے کر اعلیٰ تک اور اعلیٰ سے ذات پاک تک جس مقام یا جس محل میں بفضلہٖ تعالیٰ مقیم ہوگا اس کی توحید فی الذات کی حقیقت اس پر عیاں اور منکشف ہوتی جائے گی۔

یاد رہے کہ عالم موجودات سے عالم محسوسات اور عالم محسوسات سے عالم معلومات اور عالم معلومات سے عالم معروفات تک مشیت ایزدی اور اس کے فضل سے رسائی ہوتی جاتی ہے اس سے آگے انسان کی رسائی نہیں ہے۔ ہاں جس کو چاہے کہ اپنی کمال عنایت سے عالم قدس کے پرتو سے محو کر دے۔ ایسے شخص کی نظر میں ادنیٰ مقام سے اعلیٰ تک، اسفل سے ارفع تک کا کوئی حجاب نہیں رہتا۔ اس کے علم و دانش میں توحید باری تعالیٰ کا عرف فی الخلق، فی السر اور فی الذات ہو جاتا ہے۔ اور صفات کا فرق ذات سے اور حدث کا قدم سے اور فعل کا فاعل سے فرق کا متمیز ہو جاتا ہے، تب عارف اور توحید کا تاجور ہوتا ہے۔ پس ایسا شخص معلم التوحید، صاحب طریقت اور قابل ارشاد ہوتا ہے۔

١۔ پس دوڑو طرف اللہ کی۔

توحید میں تعلیم

توحید میں تعلیم دووجہ پر ہے: ایک منقولی اور دوسری حالی۔ منقولی تو جیسا اوپر گزر چکا ہے محض توحید پر ظن ہوا کرتا ہے، جو عوام الناس کیلئے سوائے سادگی کے کچھ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ اور اس علم الیقین کے میدان میں علم و دانش کی دوڑ سوائے خطا کے کوئی اصل نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس میں جو کچھ بھی ہم کہیں گے یا کریں گے وہ ہم خود ہی ہوں گے۔ اور توحید کے راستہ میں بہت بڑا احجاب ہے۔ بمصداق:

تا نیفتادم ندیدم کعبہ مقصود را
درمیان ما ہمیں استادگی دیوار بود

یہی وجہ ہے کہ فرمان مولیٰ کریم ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ [۱] کی توضیح کو اپنے علم و عقل کے ڈھانچہ میں ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہوگئے ہیں۔ یعنی کہ ''خداوند تعالیٰ کرسی پر بیٹھے ہیں اور کرسی چڑ چڑ کرتی ہے اور وہاں سے ہر جگہ ناظر ہیں، اور اپنے علم کی قدرت سے سوائے ذات کے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔'' گویا ہر نشیب و فراز، نشست و برخاست، نزول و عروج، فراغت و شغل، بلکہ تغیر و تبدل کو اس بے مثال کے لئے اپنی مثل روا رکھا ہے۔ اور یہ محال ہے۔ کیونکہ اگر اسی طرح مان لیا جائے تو ایمان کے راستہ میں ایسی مشکل واقع ہوگی جسے عبور کرنا ناممکن ہو جائے گا اور بت پرستی و خدا پرستی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْاِعْتِقَادِ السُّوْءِ۔ اور وہ اس طرح کہ لامکان کیلئے مکان و جہت، حرکات و سکنات اور مثل خلق کے جسم تصور کرنا پڑے گا۔ حالانکہ وہ ذات پاک ان عوارضات سے بلند و برتر ہے اور یہ صفات اس لایزال کے لائق نہیں ہیں۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا [۲]

۱۔ پھر عرش پر استویٰ فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

۲۔ پاک ہے وہ (اللہ) اور بلند اس چیز سے کہ وہ کہتے ہیں بہت بلند بہت بڑا۔

دوسری تعلیم حالی، بخاری شریف میں ہے:

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَقَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰـهُ عَلَیْـهِ وَسَلَّمَ وِعَـائَیْنِ فَـاَمَّا اَحَدُهُمَافَبَثَثْتُهٗ فِیْكُمْ وَاَمَّاالْاٰخَرُفَلَوْبَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰـذَاالْبَلْـعُـوْمُ یَعْـنِـیْ مَـجْرَی الطَّعَامِ رَوَاهُ الْبَخَارِیُّ

[مشکوٰۃ کتاب العلم]

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (علم کے) یاد کئے پس ایک ان میں سے تو پھیلایا میں نے اس کو بیچ تمہارے اور دوسرا پس اگر پھیلاؤں میں اس کو تو کاٹا جاوے یہ گلا یعنی جگہ جاری ہونے طعام کی۔ روایت کی یہ بخاری نے۔"

گویا یہ علم اظہار کے قابل نہیں ہے اور اس کی تعلیم حالی طور پر روا ہے نہ قالی۔ اور اس کا حاصل کرنا فرض عین ہے۔ بمصداق: اقوال بزرگاں کہ "حال کی تقلید حرام ہے۔" کیونکہ سوائے حال کے حال کی تقلید تصنع ہوتی ہے اور اپنے اقوال اور خیال میں کذب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ یہ علم حجت ختم کرنے والا ہے۔ اور جو علم نفع دینے والا ہے وہ انسان کے قلب سے وابستہ ہے۔ "علم درسی نہ بود، در سینہ بود۔"

علم انوار است در جان رجال	نے زراہ دفتر ونے قیل و قال
علم درسینہ بہ سینہ آمدہ!	علم بے کینہ خزینہ بود

یہ من اللہ صدر مبارک نبی امی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تفویض کیا گیا جو سلسلہ وار سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے اور تا قیامت اسی طرح سینہ بہ سینہ چلا جائے گا۔ اس سے نسبت رکھنے والے کم وبیش حصول سے مسرور ہیں، اور دوسرے بَلْ كَذَّبُوْابِمَالَمْ يُحِيْطُوْابِعِلْمِهٖ [1] کی وجہ سے جھٹلانے والے، اور اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْارَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ [2] کے مطابق انکار کرنے والے محروم۔

اے عزیز! حصول اس کا محض فضل ایز د متعال پر منحصر ہے لیکن اس پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ ورنہ

۱۔ بلکہ جس چیز کا علم احاطہ نہ کر سکا اسے جھٹلا دیا۔

۲۔ کیا نہیں پہچانا انہوں نے رسول اپنے کو پس وہ واسطے اس کے انکار کرنے والے ہیں۔

دارین میں رسوائی کا باعث ہے۔ بمصداق:

اگر حاصل نباشد ہم یقین را مدہ از دست ورنہ ازجو دے
نداری گر یقین انکار حق است یقین داں بردلت ظلمت فرو دے

جاننا چاہیئے کہ جس طرح ظاہری علوم کیلئے استاد کی ضرورت ہے اسی طرح اس علم ودانش کیلئے بھی استاد کی ضرورت اور حاجت ہے۔ظاہری علم کی ابتداء ''ب۔ت'' سے ہوتی ہے جس کی انتہا معقول منقول تک کا حصول ہے، لیکن اس علم ودانش کے لئے حروف والفاظ اور عبارت کی احتیاج نہیں ہوتی ہے۔ ہر علم کا حصول من اللہ ہے۔لیکن اس علم کا حصول ہی اللہ جل شانہ ہے جس سے مقصود معرفت الٰہی اور مشاہدہ لامتناہی ہے اس لئے عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کلام الٰہی اور ذات معلّٰی کی صفت بالذات ہے جس کا ظہور کاغذ، حروف اور الفاظ کی صورت میں عیاں ہے۔قرأت کے لحاظ سے یہ سب اسباب کلام ہیں۔لیکن معانی انوار کے مصداق ہیں۔اور یہ اختلاف بمصداق قول بزرگی۔

علم گر بر تن زنی نارت کند علم گر بر دل زنی نورت کند

کے موافق ہے جو ہمارے عارضہ کی وجہ پر ہے۔ورنہ ظاہری وباطنی معنوں سے پر اسرار قرآن حکیم اظہر من الشّمس ہے۔صاحب حال ظاہری اور باطنی معنوں سے حسب استعداد واقف ہوتے ہیں اور ظاہری علماء،صرف ظاہر پر رہ جاتے ہیں،اس لئے حقائق الٰہیہ اور معانی کی حقیقت میں خطا کرنے والے ہوتے ہیں۔اس علم وعرف کے حصول کے لئے عارف باللہ کی ضرورت ہے جس کے سوا یہ حل ناممکن ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

''اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَابَیْنَھُمَافِیْ سِتَّةِاَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا'' [الفرقان: ۵۹]

''جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ درمیان ان دونوں کے ہے بیچ چھ دن کے پھر قرار پکڑا اوپر عرش کے وہ رحمٰن ہے۔پس سوال کر اس کا کسی باخبر سے۔''

اس عقدہ کو حل کرنے کیلئے اور اختلاف کو مٹانے کیلئے کیا ہی بہتر فیصلہ فرمایا ہے کہ اگر اس مالک حقیقی کے عرف سے کچھ حصول چاہتے ہو تو کسی خبر والے سے دریافت کرو۔

یوں تو کئی دفعہ مختلف مقامات پر ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن اس جگہ ایسی تفصیل سے ارشاد واضح ہے کہ کوئی دقیقہ فروگزاشت ہی نہیں رہا۔ یعنی زمین و آسمان وَمَا بَیْنَهُمَا کا بنانا اور پھر اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا ذکر فرما کر اَلرَّحْمٰنُ کے ارشاد کے بعد فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا کا حکم کرنا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ علم وحصول اور یہ عرف ودانش کسی باخبر سے دریافت کرو۔ صرف دلیل منقولی سے یہ علم حاصل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ یہ معرفت الٰہی ہے جو حال کے سوا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ نیز یہ روشن امر ہے کہ قرآن شریف خبر ہے نہ کہ خبیر۔ اس علیم وخبیر کی طرف سے امر ہے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ یہ عبارت سوال کرنے کا محل نہیں ہے۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ ان حقائق الٰہیہ کے علم کیلئے صرف یہ تحریری کلام کافی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے عینی دلیل کی ضرورت ہے جو خدائی معلموں کے بغیر محال ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ظاہری دلیل معرفت الٰہی میں خطا کے سوا نہیں ہے اور یہی اس غلطی کا سبب ہے کہ عرش معلیٰ کو اپنے قیاس وتصور کے ڈھانچے میں ایک تخت اور اس پر ذات باری تعالیٰ کا قیام، اور وہاں سے زمین وآسمان کا ناظر ہونا قرار دے رکھا ہے۔ جس سے جہت اور مکان لازم آتا ہے۔ تحت اور فوق کے ثبت کی اونچ نیچ میں پڑ گئے ہیں جو اس ذات کے لائق نہیں ہے۔ شاید انہوں نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ[1] کو غور سے تلاوت نہیں کیا ہے۔ کیونکہ جب کرسی مقدس کی وسعت زمینوں آسمانوں سے زیادہ ہے اور عرش معلیٰ اس سے بھی وسیع تر، تو پھر مکان اور جہت وقیام کس بنا پر اور کہاں درست ہو سکتا ہے؟

کرسی کا بیان تفسیر درمنثور میں ہے کہ: ”فریابی اور عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور دارقطنی اور طبرانی اور ابوالشیخ اور بیہقی اور خطیب نے نکالا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے کہا کہ کرسی وضع قدمین ہے اور عرش کا اندازہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کو حاکم نے بھی نکالا اور صحیح بتایا۔“

۱۔ سما لیا ہے کرسی اس کی نے آسمانوں اور زمین کو۔

اور روایت کیا ابن جریر اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ اور بیہقی نے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، نہیں ہیں ساتوں آسمان بہ نسبت کرسی کے مگر جیسا کہ ایک چھلا پڑا ہوا بیچ زمین بیابان کے۔''

بایں ہمہ ان کیلئے ان کا علم ہی حجاب ہو گیا ہے اور اسی اپنے زعم کو معراج کمال سمجھ بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سعی کے قدم کٹ چکے ہیں اور میدان معرفت میں حصول سے محروم ہو چکے ہیں۔ ورنہ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۱؎ کی دولت انسان کے لئے مولیٰ کریم کی طرف سے جاری ہے اور تا قیامت جاری وساری رہے گی۔

توحید پر عمل:

اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی معبود تمہارا معبود واحد ہیں۔ اس ذات پاک کی عبادت کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

انسان کیلئے عبد کے نقطہ سے بڑھ کر کوئی مدارج نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کا کل فنا نہ ہو جائے، نسبت عبودیت جو عبد کو معبود کے ساتھ مخصوص ہے صحیح نہیں ہو سکتی۔

دریائے دجلہ میں ایک اللہ کا بندہ یعنی ''عبداللہ'' بے کس و بے بس غرق ہوا جارہا تھا۔ کنارہ پر سے کسی شخص نے اس کو پکارا ''اے بندہ خدا! تو چاہتا ہے کہ میں تجھ کو کنارہ پر کھینچ لاؤں؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیا تو ڈوبنا چاہتا ہے؟ کہا نہیں۔ بولا، کیا اسی حال میں بہا جانا چاہتا ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔ آخر اس شخص نے ان کو باہر نکال لیا اور پوچھا کہ یہ تیرا کیا حال ہے؟ فرمایا کہ میں اللہ جل شانہ معبود یکتا کا بندہ ہوں اور بندہ کو چاہنے سے کیا واسطہ؟''

ہر چہ رود بر سرم چوں تو پسندی رواست — بندہ چہ دعویٰ کند حکم خداوند راست

اے بھائی! عوام کے نزدیک عبادت اطاعت ہے جو کسی حد تک درست ہے لیکن اطاعت کئی نوع پر منقسم ہے۔ جو عبودیت کے میدان میں سوائے فرماں برداری کے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور وہ اس لئے

۱۔ نہیں ہے واسطے انسان کے مگر وہ کچھ کوشش کرے۔

کہ عبد سے اطاعت کا ہونا لازمی امر ہے۔اور اطاعت سے عبد کا ہونا ضروری نہیں۔اطاعت میں کسی حد تک اختیار رہوتا ہے،لیکن عبدیت میں مشیت ایزدی کے تصرف سے اختیار محو ہو جاتا ہے اور فاعل حقیقی کا فعل ایسے شخص کے ضمیر میں اضافیہ کا حکم رکھتا ہے اور اِلٰهُـكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی معبود حقیقی کی حقیقت عبد کیلئے واحد ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ طوعاً اوکرہاً سب کی سب مخلوق بندہ ہونے کی حیثیت سے بے اختیار ہے۔لیکن انسان کا معاملہ مولیٰ کریم کے ساتھ خاص ہے۔عوارضات کی وجہ سے حالات کے رو پر سخت اختلاف ہے۔عوام کا ایمان باوجود نادانی کے نہایت مضبوط،بلادلیل اور بحث وتنقید سے پاک،اعلیٰ فوقیت رکھنے والا،بے باک،مائل بـمشاهـده صنعت اور عمل کے لحاظ سے رجا اور خوف کے پردوں میں پرورش پانے والا ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب قال:قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ کی دلیل پکڑنے والے اور علم ودانش ظاہری سے توحید اور احکام شریعت پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔اس میدان دلیل میں دوگروہ مختلف ہیں۔ایک تو جواز سبیل ووسیلہ اور اسباب کے قائل نہیں ہیں۔اور یہ خطا پر ہیں۔کیونکہ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ظہور ذات سبحانہ بھی سوائے اسباب کے نہیں ہوا ہے۔بلکہ ظہور کے لئے اس عزیز الحکیم نے اسباب کو لازم کیا ہے۔اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ مقام میں اسی مقام کے مطابق تعلیم ہوا کرتی ہے۔صاحب اسباب کو مسبب کی طرف سوائے اسباب کے چارہ نہیں ہے مگر ہر فعل کو اس فاعل حقیقی نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔لیکن اسباب کو دلیل یعنی رہنما کے لقب سے نامزد کیا ہے۔كَـمَـا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"اَلَـمْ تَـرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّالظِّلَّ وَلَوْشَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًاثُمَّ جَعَلْنَاالشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا"
[الفرقان:۴۵]

''بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس طرح دراز کر کے پھیلاتا ہے۔اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا۔پھر ہم نے اس پر سورج کو راہنما بنایا۔''

اس طرح سورۂ فیل میں فعل تو اپنا فرمایا لیکن ابابیلوں کو ملازم اور دلیل ٹھہرایا۔ اور اس قسم کی بہت سی آیات کلام مجید میں مذکور ہیں۔ لیکن باوجود ان دلائل فصیح و بلیغ اور آیات بینات کے منکرین کے سر پر توحید کا ایسا بھوت سوار ہے کہ سرسام توحید نے ہوش وحواس کو باقی رہنے ہی نہیں دیا ہے، اور بلاسوچ سمجھے حق وناحق دونوں کا انکار کر دیا ہے۔ مثلاً شاہ اسماعیل صاحب دہلوی اپنی تصنیف ''تقویۃ الایمان'' میں رقم طراز ہیں:

''......یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خودبخود ہے، خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے۔ ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔''

اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا یا خودبخود ان کاموں کی طاقت سمجھنا تو واقعی شرک ہے۔ کلام تو صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت کے انکار میں ہے۔ خدا جانے نص قطعی کو غور سے مطالعہ نہیں کیا ہے، یا اس کے معانی میں تدبر و تعمق کو کام میں نہیں لائے ہیں۔ ورنہ یہ عبارت اور اس کا حکم سراسر فرقان الحمید کے خلاف وارد ہو رہا ہے، جو سراسر جہالت پر دال ہے۔

حضرت جمال الدین صاحب کیلانی قدس سرہٗ اپنے بیاض شریف میں فرماتے ہیں کہ:

''ابلیس لعین نے دو گروہوں کو جدھر ان کے نفس کا میلان پایا ہے دھوکا دیا ہے۔ حضرات شیعہ کو محبت اہل بیت اور آل اطہار کا دھوکا دیا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ محبت کیا ہے اور اس کا عمل کس طرح ہوا کرتا ہے۔ اور محبت کے اصل اور حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور حضرات وہابیہ نجدیہ کو توحید کا دھوکا دیا ہے، اور وہ نہیں جانتے کہ توحید کس کو کہتے ہیں اور اس کی حقیقت سے ناشناسا اور اعمیٰ ہو رہے ہیں۔''

حدث اور قدم کا فرق نہیں کر سکتے، ذات اور صفات کو نہیں جانتے اور اس کے اصل اور فرع کو نہیں پہچانتے۔ ورنہ معاملہ کی صحت کے اسباب اور انکشاف، حقیقت کی سندات اظہر من الشمس ہیں جو صاحب حال کے عمل کے مترادف ہیں۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ:

"وَاِذْتَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ وَاِذْتُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ"

[المائدة: ۱۱۰]

''اور جب تو مٹی سے پرند کی سی مورت میرے حکم سے بناتا پھراس میں پھونک مارتا تو وہ میرے حکم سے اڑنے لگتی۔اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے شفا دیتا اور جب تو میرے حکم سے مردوں کو زندہ نکالتا۔''

اب نور ایمانی کے ترازو میں وزن کرنا بعیداز تحقیق نہ ہوگا کہ مردے کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو بحکم خدا اچھا بھلا کر دینا اور خصوصاً مٹی کا جانور یعنی بت بنا کر اس میں پھونک مارنا، جو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بت بنانے اور اس میں نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ 'فاعل حقیقی کے فعل کے مترادف ہے۔ بلکہ بالکل مماثلت معلوم ہوتی ہے جو قطعاً ناممکن اور حرام ہے۔ظاہری صورت حال سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولیٰ کریم کا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مٹی سے بت بنا کر اس میں روح پھونکنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی اسی طرح مٹی سے بت بنا کر اس میں نفخ روح کرنے میں مماثلت تب ہو سکتی ہے۔ کہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام کی مثل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اذن بھی کسی شخص کی طرف وارد ہو، اور یہ محال ہے۔

اس تصرف یا طاقت کو حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کی طاقت کا نتیجہ خیال کریں یا خداوند تعالیٰ کی دی ہوئی ہمت کا مظہر سمجھیں؟ یا دونوں صورتوں کو کفر اور شرک جانیں؟ جیسا کہ تصرف فی التوحید منکرین کی زبان سے اوپر گزر چکا ہے، کس چیز پر اعتقاد رکھیں؟ شخصی تقلید کو حرام سمجھتے ہوئے ایک شخص کی رائے کو مقدم رکھیں، یا فرمان الٰہی کو ترجیح دیں جو قرآن مجید میں بالکل عیاں اور لَارَيْبَ فِيْهِ [1] کا تاج سر پر لئے کھڑا ہے؟ اور صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام باذن اللہ تعالیٰ یہ کام کرتے تھے۔ اور ہر ایک کلمے کے ساتھ اپنے امر یا اذن کی (جو فاعل حقیقی کے فعل کی شہادت پر دال ہے) لازم رکھا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذات پاک نے اپنے کمال لطف سے اپنے بندہ کے ضمیر میں اپنی قدرت اجازت

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

کو جاری رکھا ہے اور قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے مترادف روح اللہ کے خطاب سے مزین فرمایا ہے۔

شرک کی تشریح:

اس میں کلام نہیں کہ شرک ایک نا قابل عفو جرم اور ظلم عظیم ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَايَغْفِرُاَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُمَادُوْنَ ذَالِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ" [النساء:۴۸]

"بے شک اللہ نہیں بخشتا یہ کہ شریک لایا جائے ساتھ اس کے اور بخشتا ہے سوائے اس کے واسطے جس کے چاہتا ہے۔"

یوں تو شرک کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن قرآن شریف کے رو سے اصل الاصول کے لحاظ سے تین وجہ پر بیان ہے: (۱) شرک فی الذات (۲) شرک فی الصفات اور (۳) شرک فی العبادت

شرک فی الذات:

یہ کہ اس ذات احد وصمد کیلئے کوئی اوپر، نیچے یا برابر کا رشتہ روا رکھنا۔ جیسے ماں، باپ اور بیٹا بیٹی یا بھائی بہن وغیرہم۔ جیسا کہ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور حضرت مریم علیہا السلام کو اس کی بیوی قرار دیا:

"قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ" [التوبة: ۳۰]

"یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔"

تو فرمایا کہ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ اور فرمایا: اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ۔ یعنی کہ "پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کیلئے بیٹا۔" اور "کیسے ہو اس کیلئے بیٹا حالانکہ وہ بلند و برتر، بیوی سے بھی منزہ ہے۔" بلکہ اس قسم کے تمام فاسد اور باطل عقائد سے پاک کرنے کیلئے اپنے کلام پاک میں نہایت جامع کلمات سے یوں تعلیم فرمائی:

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ o وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" [اخلاص: ۱ تا ۴]

"کہو (اے میرے حبیبؐ) وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے، نہیں جنا اس نے اور نہ جنا گیا۔ اور نہیں ہے واسطے اس کے برابری کرنے

والا کوئی۔"

شرک فی الصفات:

ا۔ اس خالق یکتا کی صفات میں کسی مخلوق کو اس کے برابر سمجھنا۔ یا

۲۔ کسی مخلوق میں بغیر اس معطی کی عطا کے از خود ذاتی طور پر کوئی تھوڑی یا بہت طاقت جاننا۔

۳۔ یا اس بے مثل و بے مثال، لم یزل ولایزال کی کسی ایک صفت میں کسی مخلوق کے لئے اس سے مماثلت روا رکھنا۔ جیسا کہ فرمایا:

"لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ" [الشوریٰ: ۱۱]

"نہیں ہے مثل اس کی کوئی چیز۔ اور وہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

شرک فی العبادت:

یعنی سوائے اس رب العالمین اور اللہ واحد کے کسی اور کی عبادت کرنا، چنانچہ فرمایا ہے:

"وَلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا" [الکھف: ۱۱۰]

"اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔"

اس کے سوا ہر قسم کی استمداد کا جواز ہے۔ جس کا ثبات تعلیماً اور عملاً قرآن مجید میں موجود ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"وَمَا لَکُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ ھٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ الظَّالِمِ اَھۡلُھَا وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا وَّاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ نَصِیۡرًا" [النساء: ۷۵]

"اور تم کو کیا ہوا ہے کہ (موذی اور ظالم لوگوں سے) خدا کی راہ میں اور ان بے چارے مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کر کہیں اور جگہ لے جا کہ یہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا، اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار بنا کر بھیج۔"

قابل غور امر یہ ہے کہ وہ بے کس اور بے یار و مددگار قادر مطلق سے اور امداد و نصرت کیلئے کسی حامی و مددگار کو طلب کرتے ہیں۔ چاہیے تھا کہ وہ غیر خدا کی مدد مانگنے کے سبب سے خطاوار ٹھہرائے جاتے، اور ان کو وعید کی رو سے تنبیہ کی جاتی اور ان کی مدد بھی نہ کی جاتی، اور نہ ہی کسی کو ان کی حمایت و نصرت کیلئے حکم صادر کیا جاتا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ان بے کس ولاچار مرد، عورتوں اور بچوں کی التجا تو کئی معنوں پر محمول کی جاسکتی ہے لیکن نبی مرسل، پیغمبر اولوالعزم، صاحب اعجاز، تمام مخلوق سے برتر، تمام بنی نوع انسان سے برگزیدہ، اسرار الٰہیہ کے حامل، صاحب معارج و مدارج، خلقت کے حامی و رہنما، دین و اسلام کے پیشوا تو ان عوارضات سے مبرا و منزہ تھے۔ بایں ہمہ جب مخالفین کے غلبہ سے مجبور ہوئے اور ان کے مقابلہ میں نصرت چاہی تو یوں پکار اٹھے:

"مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ" [ال عمران: ۵۲]

''کوئی ہے اللہ کی طرف سے جو میری مدد کرے؟''

تو ان حواریوں نے جواب عرض کیا:

"نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" [ایضاً]

''ہم مددگار ہیں اللہ کے۔''

تو ایسا فعل جو شرک کا مقتضی ہو، ایک اولوالعزم مرسل سے صادر ہونا محال ہے۔ بلکہ مرسلین کی نسبت ایسا گمان کرنا بھی سوء اعتقادی اور جرم ہے۔ لہٰذا ماننا ہی پڑے گا کہ یہ سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گی۔

اے عزیز! خداوند کریم اپنے فضل سے تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، صحت حال اس امر میں اس طرح پر ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سرتا پا شرک ہے۔ اور فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جائز بلکہ دین ہے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں صاف معنوں میں اللہ جل شانہ کیلئے ہر سعی اور کوشش سے مستعد ہونا ہے۔ اور مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مقصود اللہ جل شانہ کے سوا کسی غیر سے استمداد یا کسی بت سے استعانت ہے۔ اور یہ شرک اور حرام ہے۔ اور فی سبیل اللہ مطابق فرمان مولیٰ کریم:

"یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوْااتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْااِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَوَجَاهِدُوْافِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"[المائدۃ:۳۵]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہوڈرو اللہ تعالیٰ سے اور ڈھونڈو طرف اس کے وسیلہ اور جہاد کرو بیچ راہ اس کی کے تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

اور یہ بہر حال دو وجہ پر منقسم ہے۔ اعلیٰ ہستیوں کی ادنی کی طرف اور ادنی کو اعلی کی طرف سبیل الی اللہ ہوا کرتی ہے۔ یعنی امت کو انبیاء ومرسلین کی طرف خدمت کی رو سے مال وجان کے ساتھ جہادی وجہ پر، اور مرسلین کو تعلیم احکام اور فیض وروحانیت کی رو سے مشاہدہ ولقا اور قرب خداوندی کی وجہ پر۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ بظاہر حفاظت کے لئے حواریوں سے حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کا فرمانا: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ یعنی کوئی ہے جو مدد کرے میری فی سبیل اللہ؟ اور ان کا حسب توفیق جواب دینا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ یعنی ہم مددگار ہیں فی سبیل اللہ۔ جیسا کہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام فرماتے ہیں:

"یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اِنْ تَنْصُرُوااللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ" [محمد:۷]

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، اگر مدد کرو گے تم اللہ کی مدد کرے گا وہ تمہاری اور ثابت رکھے گا قدموں تمہارے کو۔"

اور یہ مسلمہ امر ہے کہ خداوند کریم کسی کی مدد سے مستغنی ہیں۔ اور خدا کی مدد کسی وجہ سے روا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ مدد فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو اسلام اور دین میں انبیاء ومرسلین کی مدد کرتا ہے درحقیقت وہ خدا کی مدد کرتا ہے۔ اور جو کچھ اس کو انبیاء ومرسلین سے فیض وبرکت کی وجہ پر پہنچتا ہے دراصل اللہ کریم ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا فیض، وہی روحانیت کے کرشمے، اندھے مادرزاد اور کوڑھی وغیرہ کو اچھا بھلا کر دینا اور تعلیم روحانیت اظہر من الشمس ہے۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ نص صریح سے اعلیٰ کو ادنیٰ سے بظاہر طاقت سے، اور ادنیٰ کو اعلیٰ سے بباطن ہمت سے استمداد واعانت عمل کے میدان میں ثابت ہو چکی ہے۔ ہر طاقت بظاہر اور ہمت بباطن من اللہ ہی ہے اور اس کے سوا سمجھنا انکار حق ہے۔ خواہ آزمائش کے میدان میں سرشتی توفیق سے جس کو اپنے زعم

میں اپنی طاقت خیال کریں یا بِـمَا کَانُوْ ایَکْسِبُوْ نَ کی وجہ سے اضافیہ تصرف خداوندی کا مظہر سمجھیں، سب کا سب من الحق ہی ہے جو فاعل حقیقی کے فعل کا نتیجہ ہے۔ بعض کو اپنے بندوں میں سے ایسا خاص کیا ہے کہ ان کے ارادے ان کے ضمیر میں باقی ہی نہیں رہتے۔ کوئی فعل سوائے امر الٰہی کے ان سے سرزد نہیں ہوسکتا۔ ان کا کل فنا ہو چکا ہوتا ہے، اور ان کی بشریت صفات الٰہیہ سے متصف ہو جاتی ہے۔ مولیٰ کریم نے ان کو اپنے کام کیلئے تنہا کیا ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے علم سے بہرہ ور کرے، جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کوئی علم نہیں رکھتا۔ بعض نے کہا ہے کہ صرف دل میں یہ خیال ہی گزرا تھا کہ حکم ہوا کہ جاؤ میرے ایک بندے سے جا کر ملو اور علم سیکھو۔ قرآن مجید کی سورۂ کہف میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت سا سفر طے کرنے کے بعد مجمع البحرین پر پہنچے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کر کے اپنا مدعا ظاہر کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ معاملہ آپ کے حیطہ علم سے باہر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اپنے صبر کا یقین دلایا اور دونوں چل پڑے۔

"حَتّٰیٓ اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا o قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا"

[الکہف: ۷۱،۷۲]

"حتیٰ کہ جب دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے (تو خضر نے) اس کو پھاڑ دیا۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کیا تو نے اس کو اس لئے پھاڑ دیا کہ اسکے سواروں کو غرق کر دے؟ تو نے یہ ایک بھاری کام کیا۔ (خضر نے) کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھول کا عذر کیا تو پھر دونوں چل پڑے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

"فَانْطَلَقَا حَتّٰیٓ اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّةً بِغَیْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّکْرًا

"پھر چلے دونوں، یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے پس مارڈالا اس کو، کہا کیا مار ڈالا تو

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا" [الکھف: ۷۴، ۷۵]	نے ایک جان پاک کو بغیر بدلے جان کے۔ البتہ تحقیق لایا تو چیز بری، کہا (خضر نے) کیا نہ کہا تھا میں نے تجھ کو یقیناً تو نہیں کر سکے گا میرے ساتھ صبر۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا اگر اب بھی میں صبر نہ کر سکا اور آپ سے کچھ پوچھ بیٹھا تو بے شک آپ مجھے ساتھ نہ رکھیئے گا۔ کیونکہ میری طرف سے عذر پورا ہو جائے گا۔

"فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَآ اَتَیَآ اَهْلَ قَرْیَةِ ن اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ قَالَ لَوْشِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا o قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ" [الکھف: ۷۷، ۷۸]	"پھر دونوں چلے، حتی کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس آئے اور ان سے کھانا مانگا، انہوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا۔ پھر پائی ان دونوں نے اس (گاؤں) میں ایک دیوار کہ گرا چاہتی تھی۔ پس (خضر علیہ السلام) نے سیدھا کھڑا کر دیا اس کو۔ کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) کہ اگر چاہتا تو البتہ لیتا اس (کام) پر مزدوری ۔ کہا (خضر علیہ السلام نے) یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان۔"

مدعا اس بیان سے یہ ہے کہ ناحق کشتی کا پھاڑنا اور بے گناہ لڑکے کا قتل کرنا اور بلا وجہ ایک دیوار کا کھڑا کرنا سب بظاہر شرع شریف کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام صبر نہ کر سکے۔ اور کرتے بھی کیسے جب تک ان کو ان اسرار سے مطلع نہ کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون شریعت کے رو سے سراسر حق پر تھے۔ لیکن ایسے شخصوں کیلئے بظاہر شریعت کی قید نہیں رہتی ہے۔ شریعت دراصل ہمارے لئے کسی حد کی پابندی کا نام ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظام عالم کی درستی کیلئے من اللہ مقرر کی گئی ہے۔ مگر ایسے

شخصوں کے لئے شریعت بھی الگ ہوا کرتی ہے۔شریعت ہر چند اوامر ونواہی یعنی احکام خداوندی کی ادائیگی اور پابندی کے سوانہیں ہے۔اور ایسے شخصوں کا کوئی فعل بھی اپنے ارادہ سے نہیں ہوا کرتا ہے۔یہ مامور [١] من اللہ ہوتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان تینوں امور کی علت وتاویل بیان کرنے کے بعد فرمایا وَمَافَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِی (اور یہ کچھ میں نے اپنے حکم سے نہیں کیا۔) یہ سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری وساری رہے گی کہ ہر کام میں اس کا رہنما اور پیشوا بنایا جائے اور ہر محل ومقام میں اسی کے موافق تصرف من اللہ ہو۔ورنہ دست غیب سے کشتی کا پھاڑنا اور بلا وجہ لڑکے کی روح اپنے حکم سے قبض کر لینا اور ایسے ہی بغیر اسباب کے دیوار کا کھڑا کر دینا بعید از قدرت نہ تھا۔اور یہ سراسر حال ہے جس کی تقلید قطعاً حرام ہے۔

طبقہ جہلا جو حال سے قطعاً کچھ نسبت نہیں رکھتے اور اسرار الٰہیہ سے ان کو کچھ نصیب نہیں ہوتا،شریعت غرا کے خلاف (جو بلا شبہ اس عمارت کی بنیاد ہے) اپنے زعم میں مدارج ومعارج کے بالاخانے میں جاگزیں ہونے کے مدعی وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ [٢] کے مطابق محض اپنی خواہشات سے مامور بن بیٹھتے ہیں ماموریت کا حال تو درکنار اس کے معانی تک کے واقف نہیں ہوتے۔محض میدان شریعت

١۔تعریف مامور: جاننا چاہئے کہ مامور کا ترجمہ ہے امر کیا گیا۔اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ایسے عباد اللہ کا کوئی کام شریعت غرا کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔فرق صرف اتنا ہوا کرتا ہے کہ عوام شریعت سرشتی توفیق (جس کے دورخ خیر وشر کے مقتضی ہیں) ضرورت نفسانی وروحانی کے پورا کرنے کیلئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے واسطے حدود مقررہ ہوتی ہیں۔جس پر انسان عمل کر سکے اور کسی امر کی تنگی واقع نہ ہو۔لیکن مامور کیلئے امر الٰہی کے بغیر کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔نفسانیت کو جڑ سے اکھیڑ کر روحانیت کا شجر ان کے وجود با جود میں نشو ونما پاتا ہوا ثمر سے بار آور ہو جاتا ہے جیسا قرآن مجید میں صاف ذکر ہے کہ مافعلته عن امری یعنی میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیے ہیں۔بلکہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس لم یزل ولا یزال کی طرف ہی سے ہے۔ایسی ہستیوں کو مولیٰ کریم نے اپنے کام کیلئے تنہا کیا ہے اور اس سے مقصود سنت اللہ کا اجرا ہے۔١٢

٢۔اور پیروی کی اپنی خواہش کی تو مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے۔

اور فرماں برداری کی حد سے تجاوز کرنے کو معیار عشق الٰہی قرار دے رکھا ہوتا ہے۔ حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش قدس سرہٗ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ ''جو شریعت کے حکموں کو فنا کرے لوگوں کے نزدیک ولی ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک وہ شیطان ہے۔'' اس زمانہ میں حضرتنا و مولانا شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مطابق حال یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ''آج کل تو مطابق فرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم اخیر زمانہ آئے گا، اندھ اندھیر پڑ جائے گا۔'' معاملہ بالکل اصل سے خلاف ہو گیا ہے۔'' نہ صرف نافرمان، بدعتی اور مخالفین احکام اللہ و رسول ہی حق سے انکار کرنے والے ہیں، بلکہ میدان شریعت میں عمل کے لحاظ سے اس قدر تفاوت ہو چکا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ فقہ کا انکار کرنے والے ''اہلحدیث'' ہونے کے دعویٰ دار ہیں اور حدیث شریف کے منکر ''اہل قرآن'' کہلاتے ہیں، اور قرآن مجید سے برطرف جانے والے ''مومن'' اور اللہ و رسول کے برخلاف چلنے والے اور تمام حدود شرعی کو توڑنے والے ''ولی'' الامان۔

مقصود اس بیان سے یہ ہے کہ مامور من اللہ شریعت عزا کے خلاف نہیں ہوتے بلکہ ان کا ہر فعل دراصل شریعت یعنی امر الٰہی کے موافق ہوا کرتا ہے۔ ان کے ارادے ان سے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی فعل بھی امر خداوندی کے سوا نہیں ہوتا ہے۔ جیسا پیچھے گزر چکا ہے۔

اعتقاد فی التوحید:

اعتقاد دراصل کسی چیز پر ایقان یعنی ایمان رکھنا ہوتا ہے۔ اور اس جگہ اعتقاد فی التوحید سے مراد اللہ جل شانہ کی وحدانیت پر ایمان کے سوا نہیں ہے، جو دو حصوں پر منقسم ہے۔ اول ''ظن'' دوسرا ''رویت''۔ ظن کا مثبت دلیل تک ہے اور رویت کا انحصار حقیقت پر۔ شرع شریف کے حکم سے اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال، قادر ذوالجلال والاکرام کی ذات پر مع صفات تامہ کے ایمان یعنی ایقان رکھنا اعتقاد فی التوحید کی دلیل ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ توحید فی الذات بلا ظہور اَلآنَ کَمَا کَانَ کی مقتضی ہے جس کے علم و حال سے نہ کوئی واقف ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ کیونکہ یہ تصدیق بالحال ہے جو الی الخلق مردود ہے۔ جیسا کہ تصدیقات کے بیان

میں پہلے مفصل ذکر کیا جاچکا ہے۔دوسرا توحید فی السر ہے ،جو روحانیت یعنی عالم ارواح کے میدان میں ظہوراسرار رکھتی ہے۔تیسری توحید فی الخلق ہے جس کا ظہورتام موجود ہے۔

یادرکھنا چاہیے کہ مولیٰ کریم کی صفات دووجہ پر عیاں ہیں:

اول صفات بالذات جیسے (۱) حی (۲) قدیر (۳) سمیع (۴) بصیر (۵) علیم (۶) کلیم (۷) مرید، یہ صفات بالذات ہیں جن کو ذات معلیٰ سے ایسا اتحاد ہے جو کبھی منفک نہیں ہوسکتا۔عقائد نسفی والوں نے ذات اور صفات میں تعدد کے خوف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلاوجود برزخ کوروا رکھا ہے۔ورنہ دراصل یہ صفات تابع ذات محض ذات ہی ہیں۔

دوسری صفات بالفعل ہیں ،جن کا ظہورالی الخلق ہے۔جیسے خالق ،رازق ،رحمن ،رحیم ، کریم ،حکیم ،غفور ،ستار ،جبار ،قہار مثلھم گومخلوق میں سے حضرت انسان کو خداوند کریم نے مطابق فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ [۱] الا یہ اپنی صفت یعنی سرشت پر تخلیق کیا ہے،اورصفات ذاتیہ سے اس کو ایسا اتحاد ہے جس کی تمیز محال ہے۔تاہم تخلیق کے میدان میں اپنے مقام ومحل کے رو سے صفت بالفعل ہی کے مترادف ہے۔

مخلوق حدث کا محل ہے اورذات باری تعالیٰ قدیم۔اس عزیز الحکیم کی قدرت کاملہ کا ظہوراورعلم وتقسیم اسی اسباب حدث سے وابستہ ہے۔کیونکہ قبل ازیں عالم امر کے میدان میں سوائے انبیائے کرام کے کوئی علم نہیں رکھتا تھا۔اوراس علیم وخبیر کی خبر کے بغیر آج بھی اس سے جاہل ہے۔اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جو اپنے سے جاہل ہے۔وہ اپنے غیر سے اجہل ہوا کرتا ہے۔اس لئے اعتقاد فی التوحید میں اسلام کے احاطہ میں دوگروہ ہورہے ہیں۔ایک صاحب حال ہیں جن کو بفضلہٖ تعالیٰ حسب استعداد رویت نصیب ہے اوروہ عارف باللہ ہیں۔دوسرے محض ظن کے ٹٹو پرسوار تنقید کے دریا میں ظاہری دلیل کے بھنور میں غوطہ زن ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ دلیل ظاہری محکمات سے ہے جو عوام وخواص کیلئے نہایت ضروری ہے اوراسی پر مذہب کا انحصار ہے۔صاحب حال اس دلیل سے عینی دلیل کے مشاہدہ سے تقویت حاصل کرکے مسرور

۱۔بناوٹ خدا کی وہ ہے کہ بنایا اس پر آدمیوں کو نہیں بدلنا واسطے پیدائش خدا کے۔

ہونے والے ہوتے ہیں۔اور محض ظاہری دلیل سے اس لم یزل ولایزال کی ذات معلّٰی میں کلام کرنے والے اکثر خطا کار ہوتے ہیں۔ [1] یہی وجہ ہے کہ خلف وعید کے مسئلہ میں علمائے دین متین سخت اختلاف میں پڑ گئے اور بجائے

ردامکان کذب

کرنے کے امکان کذب باری تعالیٰ کے قائل ہوگئے۔معانی اصل کے خلاف کے مقتضی ہوئے اوراس بیان میں کتابیں لکھ دی۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ" [لقمن: ۲۰]

''اور بعض لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ جھگڑا کرتا ہے بیچ خدا کے بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے۔''

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں: فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کے میدان میں انسان کی دوڑ عمل کے رو سے عالم امر تک ہے۔اور یہ عروج اور منازل مدارج حجاب کے دور ہونے کے سوانہیں ہے۔ہر مقام وحال میں ہر انسان مافی الضمیر کا معائنہ ومشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے۔گو آفتاب حقیقت کی شعاعیں اس کے آئینہ قلب کو منور کرتی ہیں، تاہم وہ اپنے حال کے میدان سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا۔اس کی مثال اس طرح پر ہے کہ آنکھ باوجود صحیح وسالم ہونے کے سوائے آفتاب کی ضیاء کے روشن نہیں ہوسکتی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔یا یوں سمجھئے کہ باوجود روشنی حاصل کرنے کے جس طرح کی عینک سے آنکھ معائنہ کرے گی ویسی ہی ہر چیز کی رنگت پائے گی۔جن اصحاب کو بصارت قلبی سے حصہ نہیں ہے اور صرف ظاہری دلیل ہی پر ان کا انحصار ہے، اور محض ظن جو معرفت کے میدان میں مطابق کلام الٰہی اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [2] کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ان صاحبان کی غلطی کا سبب یہی ہے۔وہ موافق وسعت انسانی مافی الضمیر ہی کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کا ایقان اس کے سوانہیں ہے۔ایسے انسان جو کچھ بھی کہتے

۱۔ قبل ازیں معرفت الٰہی کے ضمن میں یہ بیان گزر چکا ہے۔لہٰذا دوبارہ تحریر کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔

۲۔ بے شک ظن حقیقت سے کچھ بھی مستغنی نہیں کرتا۔

ہیں اپنی ہی تعریف کرتے ہیں، اور خدائی صفات ذاتیہ اور فعلیہ کو اپنے ہی معیار پر دلیل پکڑتے ہیں، جو سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ اور یہ اس لئے کہ حدث کے سوائے صفات فعلیہ مولیٰ کریم کے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یعنی حدث کو قدم سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ گو تعلق ذات باری تعالیٰ کسی محل و مقام سے بعد و قرب کا مقتضی نہیں ہے۔ یہ محل و مقام بعد و قرب ہمارے ہی عارضہ کی وجہ سے ہے تا ہم انسان کو اپنے علم و حال کے سوائے (جو کچھ مافی الضمیر رکھتا ہے) کوئی ادراک نہیں ہے معرفت الٰہی اور اس میں کلام تو درکنار، مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کے حال سے کماحقہ علم محال ہے۔ اس کو یوں سمجھنا باعث تصدیق ہوگا کہ ایک شخص کو بخار یا دردسر ہے، اور وہ اس میں بے قرار ہے۔ تو معائنہ کرنے والا جو کبھی خود بخار میں مبتلا ہوا ہوگا یا اس کو دردسر ہوا ہوگا اس پر بیمار کی تکلیف کا قیاس کرے گا۔ لیکن کیفیت درد یا بخار اس بیمار کی سے کچھ علم حاصل نہ کر سکے گا۔

مولیٰ کریم کی کسی صفت (فعلیہ ہو یا ذاتیہ) کے علم کا حصول قطعاً ممکن نہیں ہے۔ اور اس پر حکم کرنا جہالت بلکہ ظاہراً مکابرہ ہے۔ دیکھئے! حدث تغیر کا محل ہے، اور اس ذات پاک کیلئے تغیر روا نہیں ہے۔ گو اس بے مثل و بے مثال کیلئے کوئی مثال درست نہیں آسکتی۔ تا ہم فہمید کیلئے چارہ نہیں کہ اصل میں تغیر روا نہیں ہے لیکن فرع سراسر تغیر کا محل ہے۔ مولیٰ کریم نے اپنے کلام پاک میں ہماری دانش کیلئے ارشاد فرمایا ہے:

"وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" [الذّٰریٰت: ۲۱]

''اور بیچ جانوں تمہاری کے، کیا پس تم دیکھتے نہیں؟''

تو جاننا چاہئے کہ ہمارے نفوس اور روح کی مثال اظہر من الشمس ہے جس کو قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ [۱] کے ارشاد سے مزین فرمایا ہے۔ وجود تغیر کا محل ہے اور روح اصل الاصول۔ تمام صفات (سماعت و بصارت اور تکلم وغیرہ) کا موصوف روح ہی ہے اور وجود میں کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ [۲] کی سنت پر کام کر رہا ہے۔

۱۔ کہہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔

۲۔ ہر کوئی اپنی شکل پر عمل کرتا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ روح امر الٰہی سے عالم امر کے میدان میں روحی تخلیق کے سوانہیں ہے جس میں ادراک عاجز ہے۔تو اس لم یزل ولا یزال کی ذات میں کسی وجہ سے حکم کرنا خطا کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ رہا دلیل اور نص سے تصور کے میدان میں ذات پاک اور اس کی کسی صفت کو متصور کرنا،سوتخیل اور ظن کے سوا نہ ہوگا جو حقیقت سے کوسوں دور ہی رہے گا۔اسی بناء پر قادریت ذوالجلال والاکرام کے ثبوت پر خلف وعید کے امکان اور اس کے ضمن میں امکان کذب باری تعالیٰ کا اطلاق جائز رکھا ہے۔ ہیہات! قادریت کے ثبوت کیلئے نص قطعی:

"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا" ''اورکون بہت سچا ہے اللہ سے بات میں۔''

[النساء:۸۷]

"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً" ''اورکون بہت سچا ہے اللہ سے بات میں۔''

[النساء:۱۲۲]

اور اپنے فرمان:

"اِنَّ اللّٰهَ لَايُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" ''یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

[آل عمران:۹]

کے خلاف خلف وعید اور امکان کذب کے قائل ہوئے جو اس ذات سبحانہ وتعالیٰ کے قطعاً لائق نہیں ہے۔کیا ان کو قادریت کے اثبات کیلئے اور کوئی وسائل نہیں مل سکے؟ اگر آریہ یا نصرانی اس قسم کا کلام کرتے تو زیبا تھا۔اب خلاف اسلام گروہ اس اعتقاد سوء سے مفاد اور سند حاصل کریں گے۔

اس امر کو تو یہ گروہ تسلیم کرتا ہے کہ نہ کبھی اس ذات پاک نے وعدہ کا خلاف کیا ہے اور نہ ہی کرے گا۔نہ کبھی معاذ اللہ جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی کبھی بولے گا۔صرف عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یعنی ''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔'' کی زبردست صفت اور تصرف کے اجرا کو روا رکھتے ہوئے دائرہ امکان میں قدم زن ہوئے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ مخلوق اس قادر مطلق کے تصرف میں سرتا پا محو اور بے اختیار ہے: يَفْعَلُ اللّٰهُ

مَایَشَاءُ [۱] اور یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ [۲] کی قدرت کاملہ کا احاطہ اس قدر وسیع ہے جس کی کوئی حد و حصر نہیں۔ فرمان مولیٰ کریم:

"اِنْ یَشَأْ یُذْهِبْكُمْ وَیَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍo وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ"	"اگر چاہے تو تمہیں لے جائے اور کوئی نئی مخلوق لے آئے اور یہ اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں۔"

[الفاطر: ۱۶، ۱۷]

اور یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ وَیَهْدِی مَنْ یَّشَاءُ یعنی (گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور ایسی آیات شریفہ تقدیر کے مترادف ہیں (جن کا بیان تقدیر کے عنوان کے تحت میں گذر چکا ہے) لیکن بلا وجہ سارے قرآن مجید میں ایک آیت بلکہ ایک لفظ بھی نہیں پایا جا سکتا۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ اور لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ [۳] مومن اور ولی کے لئے وعدہ اور منکرین کو بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ [٤] کی وجہ پر سخت وعید فرمائی اور بمصداق اُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ [٥] کی تاخیر فی الدنیا اور آخرت میں اَشَدُّ الْعَذَابِ یعنی نہایت سخت عذاب کا حکم ہو رہا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رحیم بھی ہیں اور قہار بھی، رحمٰن بھی ہیں جبار بھی، غیور بھی ہیں غفار بھی، عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ بھی ہیں ستار بھی۔ لیکن یہ سب کی سب صفات ہمارے حال و افعال کی وجہ پر ہیں ورنہ مطابق کلام اللہ:

"کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ"	"لازم کیا ہے اس نے اپنی ذات پر مہربانی کو۔"

[الانعام: ۱۲]

۱۔ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔ ۲۔ حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔

۳۔ اللہ سرپرست ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے طرف نور کی، اور نہیں خوف ہے اوپر ان کے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

٤۔ بسبب اس چیز کے کہ کماتے تھے۔

٥۔ مہلت دیتا ہوں ان کو یقیناً میری تدبیر دھیمی ہے۔

"وَلَوْيُؤَاخِذُاللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَاتَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَامِنْ دَآبَّةٍوَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَاجَاءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا"

[الفاطر:۴۵]

''اوراگر پکڑے اللہ لوگوں کوساتھ اس چیز کے کماتے ہیں نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا ولیکن ڈھیل دیتا ہے انکوایک وقت مقررہ تک پس جب آئے گا وقت مقرران کا پس تحقیق اللہ ہے ساتھ بندوں اپنے کے دیکھنے والا۔''

"وَلَايُظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا"[الکھف: ۴۹]

''تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

"وَمَاظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"[آل عمران:۱۱۷]

''اور نہ ظلم کیاان کواللہ نے ولیکن اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

مولیٰ کریم کسی پر ظلم نہیں کرتے ،اس لئے ثابت ہوا کہ یہ جو کچھ تغیر وتبدل کی صورت ہے ہمارے حال کی وجہ پر ہی نازل ہوئی ہے۔

باوجود ان امور کے ایک عجیب بات ہے کہ جن قوموں پر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوا اور ہلاک کردیئے گئے ، بعد ازسزا بَعْدًالِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ کا حکم ہوا ہے یعنی میرے قرب کے بدلے وہ دور کئے گئے ، رد کیے گئے ۔مولیٰ کریم کا معاملہ انسان کے ساتھ محبت کا ہے،اور قرب خداوندی انسان کے لئے سب سے اعلیٰ مرتبہ اور اصل مقصود ہے اسی طرح بُعد خداوندی اسفلیت اور محرومیت ہے۔ چنانچہ دوزخیوں کے حق میں اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍلَّمَحْجُوْبُوْنَ [۱] کا ارشاد اظہر من الشمس ہے جو حقیقت دوزخ پر دال ہے۔تو یہ قرب وبعد اور رحمت وزحمت ہمارے لئے ہے۔اس ذات پاک کے لئے (جیسا توحید فی الخلق کے ضمن میں گزر چکا ہے) روا نہیں ہے۔ ہاں مخلوق کیلئے اس کی رضامندی اور ناراضی ہے۔ اگر تمام مخلوق فرماں بردار ہوجائے یا دوسری صورت میں نافرمان ہوجائے تو اس ذات معلیٰ میں کمی بیشی کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ تمام اسباب ونقائص سے پاک ہے اور ہر طرح کے تغیر وتبدل سے مبرا ہے

اس سے یہ مفاد حاصل کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ جس طرح مولیٰ کریم کی ذات پاک کسی تغیر کا محل

۱۔ یقیناً وہ اپنے رب سے اس دن حجاب میں ہوں گے۔

نہیں ہے۔اسی طرح اس کی صفات میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوسکتا۔صفت فعلیہ ہو یا ذاتیہ، اپنی صفت کی ضد نہیں رکھتی۔صفت بالفعل، جیسے ''رحیم'' ہیں اور ''ظالم'' نہیں ہیں۔اور نہ ہی کبھی ہوں گے۔علیٰ ہذا القیاس!

قضیہ اول:

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی وجہ پر ہے۔

تو ہر چیز قبل از ظہور متحقق بالذات تھی۔جب قدرت کاملہ نے یَشَآءُ کو ارادہ کے سپرد کرتے ہوئے امر یعنی کُنْ (ہوجا) کا ایما فرمایا تو فَیَکُوْن (پس ہوگیا) کی صورت ظہور پذیر ہوگئی۔اور ہر چیز کا وجود جو شے کے مترادف ہے عیاں ہوگیا۔تب ارشاد فرمایا:

''وَمَاخَلَقْنَاالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَابَیْنَهُمَا اِلَّابِالْحَقِّ''[الحجر:٨٥] ''اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے مگر ساتھ حق کے۔''

یعنی متحقق بالذات سے عالم امر اور عالم امر سے تخلیق موجودات کو حق سے حق پر پیدا کیا گیا۔تو حق سے کذب کی نسبت مولیٰ کریم کی طرف تو در کنار، مخلوق کی طرف بھی روا نہیں ہے، مطابق کلام اللہ جل شانہ:

''مَااَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍفَمِنَ اللّٰهِ وَمَااَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍفَمِنْ نَّفْسِکَ'' [النساء:٧٩] ''جو کچھ پہنچتا ہے تمہیں بھلائی سے پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہنچتا ہے برائی سے تو وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے ہے۔''

قضیہٗ دوم:

اگر قادریت کے میدان ثبت میں ان کے مسلمات کو مان لیا جائے تو تین امور کو تسلیم کرنا پڑے گا: (١) قادریت۔(٢) امکان۔(٣) احتمال۔

اگر قادریت میں امکان کی نفی قادریت کی نفی قرار دی جائے تو ذات مولیٰ کریم کی قدرت یا کھلے لفظوں میں عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا مفاد اٹھ جاتا ہے اور یہ محال ہے۔اس لئے باوجود خلف وعید اور کذب کے عدم وجود کے مُقر ہونے کی صورت میں بھی امکان کی قید لازم آتی ہے اور وہ اس طرح پر کہ گویہ امر مسلمہ

ہے کہ باری تعالیٰ نے نہ تو کبھی وعدہ کے خلاف کیا ہے اور نہ ہی کرے گا، نہ کبھی جھوٹ بولا ہے اور نہ کبھی بولے گا۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ کسی فعل کے کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ کسی فعل کو کر ہی نہ سکتا ہو۔ اگر معاذ اللہ ایسا کہیں تو قادریت کل کی نفی جز کی نفی کے ساتھ منفی ہو جاتی ہے۔

اگر یہ امر معقول اور دلیل درست ہے کہ ذاتی مولیٰ کریم ہر نیک و بدفعل پر قادر ہیں تو لازم آئے گا اور کہنا پڑے گا کہ ہر فعل خواہ اس سبحانہ وتعالیٰ کے لائق ہو یا نہ ہو، اس کا ظہور عمل ممکن ہو۔ اگر قادریت کی صفت میں امکان کا اٹھ جانا عجز کی دلیل سے وابستہ ہو تو قرآن شریف پر بھی احتمال لازم آئے گا کہ اگر کذب کا امکان اس باری تعالیٰ کیلئے ہے تو کلام الٰہی میں (جس میں جھوٹ کا دخل ہر گز نہیں ہے، اور نص اس پر شاہد ہے) امکان کی وسعت میں جھوٹ کا احتمال [1] ہو۔ قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم ہے:

"تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا"

[مریم: ۹۰ تا ۹۲]

"قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اس سے اور زمین شق ہوجائے اور پہاڑ گر پڑیں کانپ کر، اس سے کہ دعویٰ کیا انہوں نے واسطے اللہ کے اولاد کا۔ اور نہیں لائق واسطے رحمٰن کے یہ کہ پکڑے اولاد۔"

۱۔ امکان کذب اور خلف وعید کی بحث بہت لمبی ہوگئی ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ تائیداً متکلمین کی کتب سے کچھ عبارتیں ساتھ ساتھ درج ہوتی چلی جائیں۔ لیکن ایک تو چونکہ وہ عربی میں ہیں اور عربی سے ناواقفیت حضرات کیلئے ان کا کچھ فائدہ نہیں اور اہل علم حضرات ان سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسرے خود صاحب "الانسان فی القرآن" نے قرآن مجید کے علاوہ اور منقولات سے حتی الامکان عمداً اجتناب کیا ہے، اس لئے ان کا اندراج غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا گیا ہے۔ البتہ جنہیں کچھ تردد ہو وہ کتب المسامرہ ص ۳۱ پر ممکنات کی بحث اور ص ۸۴ پر کذب کی بحث دیکھ لیں۔ بلکہ تفصیل سے ساری بحث کا مطالعہ کریں، ہاں ایک بات قابل غور ہے کہ باوجود مفہوم ایک ہونے کے متکلمین کی اصطلاحیں الگ ہیں اور آپ کی الگ۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ آپ نے ان سے استفادہ نہیں فرمایا اور نہ ہی آپ نے کبھی کوئی کتاب زیر مطالعہ رکھی (جیسا کہ دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے۔) بلکہ جو کچھ ہے عنایت الٰہی سے علم لدن اور القائے ربانی ہے جو سراسر کرامت پر دلیل ہے۔

"اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌوَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ"[الانعام: ۱۰۱]　"کس طرح ہو واسطے اس کے اولاد اور نہیں ہے واسطے اس کے جورو۔"

یعنی تثلیث کے قائلین کے حق میں فرمایا ہے، قریب ہے کہ آسمان زمین پھٹ جائیں کہ یہ خدا کی اولاد بناتے ہیں۔ جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے تو اولاد کیسے ہو؟ تو اس سے امکان کے ضمن میں احتمال ہوسکتا ہے کہ اگر اس کی بیوی ہو تو اولاد ہونا ممکن ہے۔ معاذ اللہ اس صورت میں صرف اس قدر ہی نہیں کہ امکان کذب اور خلف وعید ہی پر بس ہو۔ بلکہ ہر فعل جزوی کی نفی کل کی نفی پر دلالت کرسکتی ہے۔ مثلاً موت اور صُمٌّ وَّبُکْمٌ وغیرہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ!

تعریفِ کذب:

سب سے پیشتر جس چیز کی نسبت حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف کی جارہی ہے اس کا علم ہونا چاہیے اور یہ دو نوع پر منقسم ہے: ایک کسی چیز کے وجود کے عدم میں اس کا ثبوت دینا۔ دوسرا اقرار یا وعدہ کرنا اور اس کے پورا کرنے پر قادر نہ ہونا یا عمداً وعدہ پورا نہ کرنا۔

پہلی نوع کذب کئی وجہ پر منقسم ہے:

۱۔　کسی پر جھوٹا الزام دینا جس کو بہتان کہا جاسکتا ہے۔ خواہ کسی مطلب برآری کے لئے ہو یا اس کو حس کی وجہ سے نقصان پہنچانے کی خاطر ہو۔

۲۔　دوسرا خودستائی اور رعونت طبع کی وجہ پر نفسانیت کی رو سے ہوا کرتا ہے۔

۳۔　تیسرا کسی مصیبت کو ٹالنے یا کسی حاکم کے سامنے باوجود ارتکاب جرم کے سزا سے بچنے کیلئے انکار کی وجہ پر ہے۔

۴۔　چوتھا لغویات اور شہوت زبان کی بدعادت سے ظہور ہوا کرتا ہے۔

۵۔　پانچواں کسی کے بچاؤ یا ہمدردی کی وجہ سے کذب کو استعمال کیا جاتا ہے جس میں کسی قدر خیر کا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح دشمن کو جہاد کے موقع پر دھوکا دینا، یا صحیح بات میں مبالغہ کرنا وغیرہ وغیرہ ہوا کرتا ہے۔

بہر حال کسی چیز کے عدم وجود پر حکم کرنے کے سوا نہیں ہے۔ یہ عوارضات انسانیہ ہیں جو عیوب

ہیں۔ پھر خلف وعید کیسے جو وقوع کذب کو مستلزم ہے۔ وہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ان تمام عوارضات سے مبرا ومنزہ ہے۔ بلکہ ایسا شبہ کرنا بھی روانہیں ہے اور اس قسم کی نسبت ذات پاک کی طرف کرنا کفر ہے۔ کذب انسان کے لئے گناہ ہے اور نفس کا شیوہ:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

نیک صفات انسانیہ جو سراسر عنایت الٰہی اور عطائے غیر متناہی جن کا اتحاد معنوی اور نسبت مولیٰ کریم کے ساتھ وابستہ ہے ذات سے مماثلت نہیں رکھتی ہیں۔ مثلاً علم، کلام، حیات، قدرت، سماعت، بصارت، ارادہ۔ علم کو علیم سے، کلام کو کلیم سے، حیات کو حی سے، قدرت کو قدیر سے، سماعت کو سمیع سے، بصارت کو بصیر سے اور ارادہ کو مرید سے ایسا اتحاد معنوی ہے جس میں تمیز محال ہے۔ لیکن یہ صرف ابدی ہیں اور ذات مولیٰ کریم ازلی اور ابدی۔ باوجود ابدی ہونے کے انسان کی صفات ذاتیہ کو (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) ذات اقدس سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ بلکہ ایسا خیال کرنا بھی شرک ہے۔ اور وہ اس لئے انسان کی صفات مقام ومحل کے روسے تقسیم کے سوائے علم نہیں رکھتیں۔ اور اس ذوالجلال والاکرام کی صفات ذاتیہ کی تقسیم محال۔ سمیع ہیں مگر کان نہیں رکھتے۔ بصیر ہیں مگر آنکھ نہیں، کلیم ہیں مگر زبان کے محتاج نہیں۔ حــی ہیں لیکن اس کے لئے کسی ظرف کی احتیاج نہیں۔ علیٰ ھذ االقیاس! بلکہ ہر ایک صفت اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے۔ واصف کل لامحدود ہیں یعنی سمیع ہیں تو سارے ہی سمیع ہیں، اور بصیر ہیں تو کل، اسی طرح سب صفات میں کلیت کا حکم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی صفات کی ضد نہیں رکھتے۔ بلکہ ہر ایک صفت دوسری کی ضد نہیں، مقام وتقسیم سے مبرا ہیں۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَّھُوَالسَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ" "نہیں ہے مانند اس کے کوئی چیز اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

[الشوریٰ: 11]

سمیع وبصیر تو ہیں لیکن کسی چیز کی مثل سماعت وبصارت نہیں ہے۔ مثلاً حی بھی ہیں اور قدیر بھی ہیں۔ قادریت حَــیٌّ کے منافی نہیں ہوسکتی۔ اور حی قدرت کی۔ یعنی اس بات پر وہ ذات قادر نہیں ہے کہ مرسکے کیونکہ صفت حی قدرت رکھتی ہے اور قدرت صفت حَــیٌّ۔ بلکہ ہر صفتِ ذاتیہ ذات سے منفک نہیں ہے۔ نہ

ہوئی ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ دراصل صفات ذاتیہ ذات ہی ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ ذات کی صفت ہیں نہ کہ ذات۔لیکن ذات سے کسی صورت منفک نہیں ہیں۔

صفات ذاتیہ کے سوا ذات باری تعالیٰ میں کسی صفت بالفعل کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ صفت مرید کا ظہور صفت بالفعل ہے۔یعنی مشیت ایزدمتعال کا ایما ارادہ ذوالجلال والاکرام کی طرف اوراس سے امر یعنی کن کا ظہور فَیَکُوْنُ کے لباس میں عیاں۔

اوپر گزر چکا ہے کی ذات معلّٰی کی صفت بالفعل ہو یا صفت بالذات، اپنی صفت کی ضد نہیں رکھتی۔ جیسا کہ نص قطعی سے ثابت ہے۔ان صفات کے سوا قھـار، جبـار و مثـلھا اسمائے الٰہی جن کا شان نزول ہمارے حال کی موافقت پر ہوا، تمام مخلوق کیلئے شامل نہیں ہے۔ چونکہ میرا مقصود اس ضمن میں طول دینا نہیں ہے اس لئے صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ صفت بالفعل جس کی نسبت مخلوق کی طرف ہے، تضاد کے رد کرنے کیلئے بحث وتنقید کی ضرورت ہے جو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہو چکی ہے۔اب صرف اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ ان اوصاف سیۂ کی نسبت مولیٰ کریم کی طرف قادریت کے میدان میں جواز کی صورت رکھتی ہے یا نہیں؟

تعجب تو یہ ہے کہ صریح نص کے خلاف ذات باری تعالیٰ کی طرف خلف وعید اور کذب کو منسوب کیا ہے۔حالانکہ قرآن المجید میں ارشاد مولیٰ کریم لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ [1] بالکل صاف اور عیاں ہے۔ تو جس فعل سے وہ ذوالجلال والاکرام بیزار ہوں اس کیلئے مشیت ایزدمتعال اور امکان قطعاً روا نہیں ہوسکتا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ سُوْءِ الْاِعْتِقَادِ [2] معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قادر مطلق کی قادریت کو سمجھا ہی نہیں۔محض اپنے زعم کے ڈھانچہ میں قادریت کو اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ کی رو سے ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہوگئے۔ورنہ قادر مطلق کی قدرت کی حقیقت اس کے خلاف کی مقتضی ہے۔کیونکہ ہر قسم کا جھوٹ اور وعدہ خلافی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، قادریت کے منافی ہے، اور وعدہ کا پورا کرنا اور کسی کمزوری یا ڈریا

۱۔لعنت ہے اللہ تعالیٰ کی جھوٹوں پر۔ ۲۔پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے برے اعتقاد سے۔

۳۔بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

بچاؤیا حیلہ کی وجہ سے جھوٹ بولنا کمال عجز کی دلیل ہے۔تو جس ذات معلیٰ کیلئے قدرت اور مشیت اتم ہو،اس قادر مطلق کیلئے ایسا امکان یا احتمال کیسے ہوسکتا ہے؟ایسا اشتباہ سراسر نادانی اور جہالت پر مبنی ہے۔کیونکہ ارشاد مولیٰ کریم اپنے امر اور فعل کیلئے اظہر من الشمس ہے اور اس اشتباہ وامکان کے رد کرنے کیلئے بین دلیل ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں اور اپنے علم کی دولت سے مالا مال کریں،وعدہ کے ایفا کا انتظار اس کے کرنے یا نہ کرنے تک ہوا کرتا ہے۔اگر مطابق وعدہ ایفا ہوگیا،تو سچ! ورنہ جھوٹ۔لیکن اس لم یزل ولایزال کے کسی وعدہ کیلئے انتظار کی گنجائش نہیں۔کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے: كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا یعنی جو وعدہ ہوا اس کا ایفا ہوگیا۔تو اس صورت میں اس قادر مطلق کی قدرت کیلئے خلف وعید کس حساب میں ہوسکتا ہے،اور اس کا امکان یا احتمال کہاں؟

دوسرا امکان کذب باری تعالیٰ:

کذب کی تعریف اوپر گزر چکی ہے کہ کسی چیز کے عدم وجود پر حکم کرنا ہوتا ہے۔اور یہ بھی انہی معانی کے مترادف ہے۔جیسا کہ فرمایا: اِذَآ اَرَادَ شَیْـئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ یعنی جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں کہ ہوجا،تو وہ ہوجاتی ہے۔عوام کیلئے یا دوسرے لفظوں میں مخلوق کیلئے کسی چیز کے عدم وجود پر حکم کرنا اور اس کو ثابت کرنا کذب ہوا کرتا ہے۔لیکن اس عزیز الحکیم کا کسی شے کیلئے ارادہ کرنا یا اس کو عدم وجود کی صورت میں ثابت کرنا یعنی اس پر حکم کرنا كَانَ اَمْرُهٗ مَفْعُوْلًا کا مقتضی ہوا کرتا ہے۔تو اب نور ایمانی کے ترازو میں غور وفکر کے اوزان سے موازنہ کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ بے مثل وبے مثال کی قادریت کے میدان میں کذب کا امکان کیسے ہوسکتا ہے؟

۱۔ روح کا وجود میں داخل ہونا،جو قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے مصداق ہے۔

۲۔ قدرت اذن،جو امر کے مترادف ہے،اپنے خاص بندوں خصوصاً انبیائے کرام میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اجرا رکھا یعنی دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے،اور اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے جواز رکھا ہے۔یعنی

اپنی قدرتِ اجازت کو ان دو پاک ہستیوں میں ودیعت فرمایا ہے۔

۳۔ تیسرا کُن کی صورت میں کسی چیز کی طرف امر کرنا۔

۴۔ چوتھے کلام کی صورت میں احکام تعلیم، قصص جو عبرت کے مترادف ہیں۔ اور تعریف توحید و مثلہا کی صورت میں ہوتا ہے جن کی تفصیل میں بہت طول ہے اور اس جگہ مقصود نہیں ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ذات مولیٰ کریم کی صفات خصوصاً صفات بالذات کی ضد نہیں ہے۔ وہ لم یزل ولا یزال اس تغیر سے پاک ہے۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ جب صفات کی ضد کا وجود عدم کا مقتضی ہے۔ تو کلام جو صفت بالذات ہے اور ضد نہیں رکھتی ہے، خواہ وہ امر کی صورت میں فاعل ہو یا کسی اور فعل کی وجہ پر، فاعل حقیقی کی ذات کے تابع مشیت ایزدمتعال کے مرید ہونے کی رو سے، قطع نظر اس سے کہ وہ صدق ہے یا کذب، اپنے فعل کی نفی میں قاصر ہونے کی وجہ سے قدرت تامہ میں نقیض واقع ہوتا ہے، اور یہ محال ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا اور حقیقت کے میدان میں یہ امر حق اور صحیح ہے کہ وہ قادر مطلق ہر فعل پر قدیر ہے۔ یعنی اس کی صفت ذاتیہ کے فعل کی صورت میں نفی روا نہیں ہے۔ ورنہ قادر مطلق کی قادریت کی قدرت میں نقص لازم آئے گا۔ اور یہ محال ہے۔

یا عام فہمائش کیلئے کھلے لفظوں میں یوں قیاس کرنا چاہیے کہ کلیم صفت بالذات ہر کلام کرنے پر قدرت اتم رکھتی ہے۔ تو پھر خواہ فعل سرزد ہو یا نہ ہو، صدق ہو یا کذب، اپنی صفت کلام میں قادرِ مطلق کے فعل کی نفی نہیں ہوسکتی ہے اس لئے امکان کے میدان میں کسی کلام کی نفی نہیں ہوسکتی۔ ورنہ صفت کلیم میں نقص واقع ہوگا، مطلق محال ہے۔

جواب:

اوپر چند اقسام پر تعریف کذب گزر چکی ہے۔ جن کا اصل کسی چیز کے عدم و وجود کے ثبت پر حکم کرنے کے سوا نہیں ہے۔ اور اس اللہ واحد کا حکم ہر چیز کے عدم و وجود پر واقع ہوا ہے۔ یعنی جب کچھ نہ تھا اور ہر چیز کا وجود عدم کے میدان میں معدوم تھا، قادر مطلق کی مشیت سے امر کُنْ صادر ہوتے ہی فَیَکُوْنُ کا ظہور ہوا۔ اب سمجھ نہیں آتی کہ اس بے زوال قادر ذوالجلال والاکرام کی ذات کی طرف کذب کی نسبت کیسے ہوئی جبکہ

اس کی ذات جل وعلا کی قدرت کاملہ میں کذب کا وجود ہی پیدا نہ ہوسکا۔ نہ ہی ہے، اور نہ ہی ہوگا۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا حل ضروری ہے تاکہ کسی اشکال کا شمہ بھی باقی نہ رہ جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ لفظ کُــنْ یعنی ''ہو جا'' حکم کے مترادف ہے اور کسی چیز کے وجود کو ثابت کرنے کیلئے (جس کی عدم موجودگی میں کذب ثابت ہوتا ہے) وجود کا ہونا ضروری ہے۔ اور کُــنْ یعنی امر عدم وجود کے ظہور کیلئے ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ''ہے'' اور ''ہو'' میں فرق ثابت ہوتا ہے۔

جواب:

اس کا یہ ہے کہ عدم وجود سے پہلے ہر چیز کا متحقق بالذات ہونا لازم ہے جیسے قرآن حکیم سے بالکل عیاں ہے: اِذَآاَرَادَشَيْـئًـااَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ لَہٗ کی ضمیر سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کا وجود بلکہ اصل قبل از ظہور ذات باری تعالیٰ میں متحقق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کسی چیز کے وجود کی عدم موجودگی پر ثبت متحقق بالذات ہے اور امر کُــنْ سے وجود کا ظہور عیاں۔ تو اس لم یزل ولا یزال کا کسی چیز کے عدم وجود پر تصدیق کذب نہیں ہوسکتا۔ عدم وجود کی تصدیق تعریف کذب ہے، اور مولیٰ کریم کیلئے کسی چیز کے عدم وجود کی تصدیق تعریف کذب ہے، اور مولیٰ کریم کیلئے کسی چیز کے عدم وجود کی تصدیق متحقق بالذات ہے۔ اور اسی کیلئے کُــنْ جوامر کے مترادف ہے، ظہور کا باعث ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عدم وجود کی تصدیق متحقق ہونے کی صورت میں حق ہے۔ اس لئے سادے لفظوں میں عوام الناس کی فہمید کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر چیز کا علم اس ذات باری تعالیٰ کو ہے۔ یا ہر چیز اس کے علم میں موجود ہے۔ جب چاہے اپنے حکم سے ظاہر کردے۔ پھر جبکہ ہر چیز اس کے علم میں ہے، تو تعریف کذب کس صورت میں صادق آسکتی ہے؟ بلکہ اس کے امکان کا گمان امکان کذب باری تعالیٰ کے عدم وجود پر آتا ہے اور یہ انہی کے کذب کی دلیل ہے جو کذب کی تعریف کے مترادف ہے۔

مکرر:

جبکہ ہر چیز کا وجود متحقق بالذات ہے، اور ہر حکم لَـهٗ کی ضمیر کی وجہ پر کسی وجود کے لئے ہے، عدم پر حکم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ کسی وجود کے ظہور کیلئے مطابق تعریف کذب امکان کذب ہو

سکتا ہے۔لیکن کَانَ اَمْرُہٗ مَفْعُوْلًا کے ماتحت ظہور وجود ہونے کے بعد صدق ہو جاتا ہے۔اور ہر شے کے متحقق ہونے کی وجہ پر عدم مفقود ہو جاتا ہے۔اس لئے امکان کذب کا امکان ہرگز ممکن نہیں، نہ ہوا ہے، نہ ہوسکتا ہے اور نہ ہوگا۔

ردخلف وعید

سوال:

یہ مسلمہ امر ہے کہ اس قادر مطلق کے ایما یعنی کُــنْ سے ہر چیز کا ظہور ہوا ہے، ہو رہا ہے، اور ہوتا رہے گا۔لیکن یَفْعَلُ اللّٰهُ مَایَشَآءُ اور یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ کی بساط عظیم پر:

"لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ○یَمْحُوا اللّٰہُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ" [الرعد: ۳۸، ۳۹]

"واسطے ہر ایک وعدے کے ایک تحریر ہے، مٹا ڈالتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور نزدیک اس کے ہے اصل کتاب۔"

کی قادریت کے تصرفات میں کسی چیز کا ثابت رہنا یا محو ہونا استقلال نہیں رکھتا ہے۔اس لئے کسی تغیر وتبدل یا کھلے لفظوں میں خلف وعید پر اس قادر مطلق کی قدرت بہرصورت قادر اور غالب ہے۔کیا اس قادریت کی نفی ہوسکتی ہے؟

جواب:

قبل از ظہور ہر شے کا وجود ذات باری تعالیٰ میں متحقق ہونا نص قطعی سے امکان کذب کے رد کے بیان میں ثابت ہو چکا ہے۔تو جب ظہور کا ارادہ فرمایا، عالم امر کی طرف مرید ہوئے تو جو کچھ ہونے والا ہے، اور جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے سب کا سب لوح میں محفوظ کیا گیا۔اس میں کلام نہیں کہ اس لوح محفوظ میں جس کو چاہیں محو کر دیں، اور جس کو چاہیں ظاہر فرما دیں۔لیکن جس کا ظہور ہو چکا ہے۔یعنی کَانَ اَمْرُہٗ مَفْعُوْلًا [۱] کی وجہ پر ہویدا کا حکم عمل میں آ چکا ہے، لَایُخْلِفُ الْمِیْعَادَ [۲] کے مطابق ہرگز محو نہیں ہوسکتا، خواہ

۱۔ ہے حکم اللہ تعالیٰ کا ہو جانے والا۔ ۲۔ نہیں خلاف کرتا وعدے کا۔

اس کے فرع میں تغیر وتبدل (جو ہمارے حال سے عبارت ہے) ہوا کرے، اصل میں تغیر واقع ہونا محال ہے، بلکہ احاطۂ امکان سے باہر ہے، جیسا کہ پیدائش انسان جو متحقق بالذات تھا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا [1] کے مقام سے عالم امر کی طرف جس کا ذکر قرآن شریف میں کئی جگہ میثاق وغیرہ سے ثابت ہے۔ اور وہاں سے عالم موجودات کی طرف جو آج کے دن بالکل عیاں ہے، ظہور ہو چکا ہے۔ خواہ یہ مومن ہو یا منافق، مسلم ہو یا کافر، دوست ہو یا دشمن، صاحب قرب ہو یا صاحب بعد کسی حالت میں بھی معدوم نہیں ہوسکتا۔ جو زندگی من اللہ اس کو مل چکی ہے یہ عِلِّيِّيْنَ میں ہو یا سِجِّيْنَ میں۔ جنت میں ہو یا دوزخ میں، ہرگز منقطع نہ ہوگی، اور نہ ہوسکتی ہے يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ [2] کا حکم اس کیلئے نہیں رہا ہے۔ کیونکہ اس کا حکم قبل از ظہور ہی ہے۔ ہاں بعد از ظہور جن کیلئے حکم فنا ہو چکا ہے۔ مثلاً دنیا و مافیہا اور اس کے فنا و بقا میں اصل اور فرع کے منازل و مدارج میں بہت گفتگو ہے جس کا بیان کرنا اس جگہ مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اصلی مطلب کی طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ کا تصرف قبل از ظہور دو وجہ پر ہے۔ ایک تو قبل از ظہور دنیا، كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ"

[آل عمران: ۸۱، ۸۲]

"اور جس وقت لیا اللہ تعالیٰ نے عہد پیغمبروں کا البتہ جو کچھ کہ دوں میں تم کو کتاب سے اور حکمت سے پھر آوے تمہارے پاس پیغمبر سچا کرنے والا اس چیز کو کہ ساتھ تمہارے ہے البتہ ایمان لائیو ساتھ اس کے اور ضرور مدد دینا اس کو۔ کہا کیا اقرار کیا تم نے اور لیا تم نے اوپر اس کے بھاری عہد میرا؟ کہا انہوں نے اقرار کیا ہم نے۔ پس شاہد رہو اور میں تمہارے ساتھ شاہدوں سے

۱۔ بے شک آیا ایک وقت انسان پر زمانے میں سے کہ نہ تھی کوئی چیز ذکر کی گئی۔ ۲۔ مٹا دیتا ہے اللہ جو چاہتا ہے۔

ہوں۔ پس جو کوئی پھر جائے پیچھے اس کے پس وہی فاسق ہیں۔''

تو یہ وعدہ اور وعید جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صرف انبیاء و مرسلین ہی سے ہوا ہے۔ جو دوسرے عام انسانوں کیلئے روا نہیں ہے۔ کیونکہ ان پاک ہستیوں کیلئے ہر دو برزخ (قبل از ظہور وجود اور بعد از موت) ظاہر کی طرح ہیں، اور ان کو ہر دو سے علم کل ہوتا ہے۔ اور یہ دوسرے یعنی عام لوگوں کیلئے نہیں ہوتا ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" [الحدید:۸]

''اور کیا ہے واسطے تمہارے کہ نہیں ایمان لاتے تم ساتھ اللہ کے اور رسول پکارتا ہے تم کو کہ ایمان لاؤ ساتھ رب اپنے کے اور تحقیق لیا ہے عہد تمہارا اگر ہو تم ایمان والے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط محض ہمارے لئے ہے۔ لیکن نبیوں اور رسولوں کیلئے مطلق روا نہیں ہے۔ ان کے لئے اَقْرَرْتُمْ اور اَقْرَرْنَا کی عبارت کافی ہے جو ان کے برزخ سے علم ہونے کی واثق دلیل ہے۔ ان آیات بینات سے مومنین کیلئے دو مفاد ظاہر ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی رسول یا نبی مبعوث نہیں ہوسکتا۔ اور وہ اس لئے کہ یہ میثاق تمام انبیاء سے لیا گیا ہے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ یہ میثاق ان کی ذات کیلئے ہے جو تصدیق اور ایقان مرسلین پر مبنی ہے۔ اگر یہ میثاق تمام انبیاء کیلئے ہوتا تو لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ کی جگہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِمْ ہوتا۔ لیکن بِهٖ کی ضمیر واحد اظہر من الشّمس ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، ہر ایک رسول کیلئے نہیں۔ اور یہ اسم باعتبار ضمیر کے مخصص ہے۔

دوسرے، وعدہ کی رو سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور از روئے وعدہ اب آپ جیسا کوئی پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ قادر مطلق اپنے وعدہ کے ایفا پر قدرت تامہ رکھتے ہیں اور بموجب كَانَ اَمْرُهٗ مَفْعُوْلًا ظہور ہو چکا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اس خلاق علیم نے جیسا یہ سلسلہ انبیاء و مرسلین ابتدا سے انتہا تک اور دنیا و

مافیہا بلکہ تمام موجودات کو پیدا کیا ہے، ایسی مخلوقات یعنی اس کی مثل لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں پیدا کر سکتے ہیں۔ بہرصورت اس امر پر قادر ہیں۔ لیکن موجودہ دنیا جس کی ابتدا سے انتہاء تک کیلئے فیصلہ ہو چکا ہے۔ حدیث شریف جَفَّ الْقَلَمُ یعنی ''قلم سوکھ گیا ہے۔'' کے مطابق اس میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے۔ اور ایفائے عہد کے مطابق لَایُخْلِفُ الْمِیْعَادَ کی سنت کے موافق اب اس موجودہ دنیا میں یوم القیامہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا پیدا ہونا، احاطہ امکان سے باہر ہے۔ کیونکہ پھر میثاق النبیین کا فائدہ نہیں رہتا۔ تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ کیلئے لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا اقرار لیا گیا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستثنٰی ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آسکتا۔

دوسرا قبل از ظہور بعد از میدان دنیا، جو لوح محفوظ پر کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ سے منسوب ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ o وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّیْنٌ o كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ o وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ"

[المطففین:۷تا۱۰]

''ہرگز نہیں یوں، تحقیق عمل نامہ بدکاروں کا البتہ بیچ سجین کے ہے اور کس چیز نے معلوم کروایا تجھ کو کیا ہے سجین۔ ایک دفتر سے لکھا ہوا۔ وائے ہے اس دن واسطے جھٹلانے والوں کے۔''

"كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ o وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ o كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ o یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ"

[المطففین:۱۸تا۲۱]

ہرگز نہیں یوں۔ تحقیق عمل نامہ نیکوکاروں کا البتہ بیچ علیین کے ہے۔ اور کس چیز نے معلوم کروایا تجھ کو کہ کیا ہے علیین۔ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ حاضر ہوتے ہیں اس پر مقرب خدا کے۔

اس کا وعدہ ہمارے اعمال کی وجہ سے حال کے رو سے ہے، اور یہ قانون قدرت اور قاعدہ کلیہ عوام الناس کیلئے مقرر ہو چکا ہے۔ لیکن قبل از ظہور عمل اس ذات بے زوال کی شان کے لائق ہے کہ کسی گنہ گار کو اپنی رحمت سے بخشش دے یا عدل کی رو سے عذاب کرے۔ لیکن اس سے خلف وعید ہرگز ثابت نہیں

ہوسکتا، بلکہ ایفائے وعدہ کے موافق ہے۔اوروہ اس لئے کہ ازروئے رحم وعفووکرم مومنین کیلئے ہے اور باندازۂ معصیت عدل کے رو سے سزا ہے۔مطابق:

"وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ○ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا"

[الفتح:۱۳، ۱۴]

"اور جوکوئی نہ ایمان لایا ساتھ اللہ کے اور اس کے رسول کے پس تحقیق تیار کیا ہے،ہم نے واسطے کافروں کے دوزخ اور واسطے اللہ کے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی بخشتا ہے واسطے جس کے چاہے اور عذاب کرتا ہے جس کو چاہے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔"

اس سے بھی خلف وعید ثابت نہیں ہوسکتا۔کیونکہ پہلے وعید ان لوگوں کیلئے ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لائے۔ان کافروں کیلئے عذاب تیار کر رکھا ہے۔اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ اسی کیلئے آسمان وزمین کا ملک۔جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب کرے۔تو جاننا چاہیے کہ اس مغفرت اور عذاب کی نسبت مشیت ذوالجلال والاکرام کے ساتھ خلف وعید کے مترادف نہیں ہے۔کیونکہ یہ محض اختیار ہے جس کا تصرف توفیق کی رو سے میدان دنیا ہی میں ہے۔اور مفاد اسکا فی الآخرۃ:

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ○ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا"

[النساء:۱۳۷]

"تحقیق جو لوگ کہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر زیادہ ہوئے کفر میں، ہرگز نہیں بخشے گا ان کو اللہ اور نہ دکھائے گا ان کو راہ، خوشخبری دے منافقوں کو ساتھ اس کے کہ واسطے ان کے عذاب ہے درد دینے والا۔"

اور دوسری جگہ ساتھ ہی یوں ارشاد ہے:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِوَلَنْ تَجِدَلَهُمْ نَصِيْرًا o اِلَّاالَّذِيْنَ تَابُوْاوَاَصْلَحُوْاوَاعْتَصَمُوْابِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًاعَظِيْمًا o مَايَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَکَانَ اللّٰهُ شَاکِرًا عَلِيْمًا"

[النساء: ۱۴۵، ۱۴۷]

"تحقیق منافق بیچ درجے نیچے کے ہیں آگ سے اور ہرگز نہ پائے گا تو واسطے ان کے مددگار۔ مگر جنہوں نے کہ توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور مضبوط پکڑا خدا کو اور خالص کیا دین اپنے کو واسطے اللہ کے پس یہ لوگ ساتھ مسلمانوں کے ہیں اور جلدی دے گا اللہ ایمان والوں کو ثواب بڑا۔ کیا کرے گا اللہ عذاب کر کے تم کو اگر شکر کرو گے تم اور ایمان لاؤ گے تم۔ اور ہے اللہ قدردان جاننے والا۔"

یہ تغیر وتبدل ہمارے حال کی وجہ ہی سے ہے۔ جس کا تصرف غضبی ہو یا رحمی، میدان دنیا کے سوا نہیں ہے۔ اور سنت الٰہی اور قانون قدرت سے جو فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَة کے مطابق ظہور پذیر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور میدان دنیا میں ہمارے حال اور اعمال کی وجہ پر ہے۔ جن پر بات ختم ہو چکی ہے، وعید تو ان لوگوں کیلئے ہے جو کافر، منافق اور مشرک ہیں اور جن کی مغفرت کا مطلق امکان نہیں ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ کَذَّبُوْابِاٰيٰتِنَاوَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَالَاتُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَايَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَحَتّٰی يَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِيَاطِ وَکَذَالِکَ نَجْزِیْ الْمُجْرِمِيْنَ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌوَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٌ وَکَذَالِکَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ"

[الاعراف: ۴۰، ۴۱]

"تحقیق جن لوگوں نے جھٹلایا نشانیوں ہماری کو اور تکبر کیا ان سے، نہ کھولے جائیں گے واسطے ان کے دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے بہشت میں یہاں تک کہ داخل ہو جائے اونٹ بیچ ناکے سوئی کے اور اسی طرح جزا دیتے ہیں ہم گنہ گاروں کو۔ واسطے ان کے دوزخ سے بچھونا ہے اور اوپر ان کے بالاپوش ہیں اور اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہم ظالموں کو۔"

ان کیلئے نہ تو کسی کی سفارش ہی ہو سکے گی، اور نہ ہی ان کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔ جیسا کہ بزبان حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کے روز بجناب باری تعالیٰ اظہر من الشمس ہے:

"اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُالْحَکِیْمُ ○ قَالَ اللّٰهُ هٰذَایَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذَالِکَ الْفَوْزُالْعَظِیْمُ"

[المائدة:۱۱۸،۱۱۹]

"اگر عذاب کرے گا تو ان کو پس وہ بندے تیرے ہیں اور اگر بخش دے تو ان کو پس تحقیق تو ہی ہے غالب حکمت والا۔ فرمائے گا اللہ تعالیٰ یہ دن ہے کہ فائدہ دیوے گا سچوں کو سچ ان کا۔ واسطے ان کے بھشتیں ہیں۔ چلتی ہیں نیچے ان کے نہریں ہمیشہ رہیں گے بیچ اس کے ہمیشہ۔ راضی ہوا اللہ ان سے اور راضی ہوئے وہ اس سے یہی ہے مراد پانا پڑا۔"

جن لوگوں کیلئے بات ختم ہو چکی ہے یا وعید اتم ہو چکی ہے، ان کیلئے سارے قرآن مجید میں مغفرت کی ایک آیت بھی نظر نہیں آتی۔ بلکہ روز ازل سے لوح محفوظ پر مقرر ہو چکا ہے، جو قانون الٰہیہ کے مترادف ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"عَالِمِ الْغَیْبِ لَایَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍفِی السَّمٰوٰتِ وَلَافِی الْاَرْضِ وَلَآاَصْغَرُمِنْ ذَالِکَ وَلَآاَکْبَرُاِلَّافِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ○لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْاوَعَمِلُوالصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌوَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ○وَالَّذِیْنَ سَعَوْافِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍاَلِیْمٌ"

[سبا:۳تا۵]

"جاننے والا ہے غیب کا۔ نہیں پوشیدہ اس سے ایک ذرہ بھی بیچ آسمانوں کے اور نہ بیچ زمین کے اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے۔ تاکہ بدلہ دیوے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے اور کام کئے اچھے۔ یہ لوگ واسطے ان کے بخشش ہے اور رزق باکرامت اور جن لوگوں نے سعی کی بیچ نشانیوں ہماری کے عاجز کرنے والے ہو کر واسطے ان

لوگوں کے عذاب ہے سخت قسم سے درد دینے والا۔''

جزااورسزا کی نسبت خواہ چھوٹا عمل ہو یا بڑا، وعدہ اور وعید فرمائے ہیں جس کا خلاف نہیں ہوسکتا۔ ہاں میدان دنیا میں ہمارے عمل وحال کی وجہ پر تغیر وتبدل قرآن شریف سے ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کیلئے عذاب مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن انہوں نے بچوں کو دودھ پلانا بند کر دیا، کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تضرع وزاری کو تہہ دل سے جاری کر دیا، تو مولیٰ کریم نے اس کے ظہور عمل کو ترک فرما دیا۔ یعنی یَمْحُو اللّٰهُ مَایَشَآءُ کی سنت کو از روئے رحم ان کیلئے جاری کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ قبل ازیں کسی قوم کیلئے ایسا نہیں ہوا ہے:

"وَلَوْجَاءَ تْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ"

[یونس:۹۷تا۹۸]

''اور اگر آویں ان کے پاس سب نشانیاں یہاں تک کہ دیکھیں عذاب درد دینے والا۔ پس کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لائی ہو پس نفع دیا ہو اس کو ایمان اسکے نے سوائے قوم یونس کے جب ایمان لائے کھول دیا ہم نے ان سے عذاب رسوائی کا بیچ زندگانی دنیا کے اور فائدہ دیا ہم نے انکو ایک مدت تک۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی کام مقرر ہونے کے بعد ایسا ہونا نادرات سے ہے۔

اے بھائی! خواہ عالم امر میں خواہ عالم شہود یعنی عالم دنیا میں جو موجودات کے مترادف ہے، خواہ عالم برزخ اور یوم القیامہ کے میدان میں ہو، کام فیصل ہو جانے کے بعد یَمْحُو اللّٰهُ مَایَشَآءُ کی سنت منقطع ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ قادریت کے میدان میں مشیت ایزدمتعال کے رو سے یُثْبِتُ کا عمل ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ جس کے لئے یَمْحُو اللّٰهُ یعنی محویت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، صرف قبل از ظہور عمل اس کا اجرا روا رکھا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت سے جو امر ظاہر ہوا ہے۔ نادرات کے مترادف ہے لیکن اس

کا عمل بھی ظہور سے پہلے ہی ہوا۔ظہور ہو جانے کے بعد ایسے نادرات کا ہونا بھی ناممکن ہے۔ہاں! اپنے وقت معین پر یعنی قیامت کو فنا ہو جائے گا۔ جو تین وجہ پر متعین ہے:

ا۔ بقا، بقا، بقا.................ذات باری تعالیٰ

۲۔ فنا، بقا، فنا.................دنیا و مافیہا

۳۔ فنا، بقا، بقا.................انسان، دوزخ، بہشت یعنی آخرت و مافیہا

بہرصورت ہر چیز کا متحقق بالذات ہونا اصل الاصول کی مانند ہے۔دوسرا درجہ ظہور کے میدان میں عالم امر ہے جس کو کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سے منسوب فرمایا ہے۔یا لوح محفوظ سے نامزد کیا ہے۔تیسرا درجہ عالم دنیا ہے جس میں ظہور وجود اور آفرینش کا مقام ہے۔متحقق بالذات کی بساط پر یَمْحُوا اللّٰہُ کا قدم بالکل کالعدم ہے۔کیونکہ محویت (مٹانا) کسی وجود کیلئے ہوا کرتی ہے اور اس مقام و محل میں کسی شے کا وجود ثابت نہیں ہے۔کوئی چیز سوائے ذہنی وجود کے جو علم خداوندی کے مترادف ہے، نہ خارجی وجود رکھتی ہے نہ لفظی۔ تو پھر اس صورت میں محویت کہاں اور کس کی؟ دوسرا مقام نوری وجود میں مرقوم ہے جس کیلئے یَمْحُوا اللّٰہُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ وارد ہوا ہے۔اور تیسرا مقام ظہور وجود تام ہے۔جس میں سوائے فنا و بقا یعنی اصل اور فرع کے تغیر و تبدل کے سوا کسی محویت کی گنجائش نہیں ہے۔ہر فنا فرع کیلئے ہے۔اصل کو من اللہ بقا حاصل ہو چکی ہے۔لیکن یاد رہے کہ اس اصل کو جس کیلئے میں نے محویت کو روا نہیں رکھا ہے۔عالم امر میں بھی اس کو محویت نہیں ہے اور یہ انسان اور عالم آخرت کیلئے ہی مخصوص ہے۔باقی تمام اشیاء کیلئے ایسا نہیں ہے۔

اے بھائی! اس امر کی تفصیل کیلئے قرآن الحمید کی مثال بالکل عیاں ہے۔اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ قرآن شریف لوح محفوظ سے عبارت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام تک جتنی کتابیں اور صحیفے اللہ جل شانہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ان سب کا جامع ہے۔اور مطابق مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَھُمْ بہت سی عبارتیں بعینہٖ (خواہ زبان کا اختلاف ہی کیوں نہ ہو) موجود ہیں۔احکام شریعت میں تغیر و تبدل ہوتا چلا آیا ہے جو منسوخ کے مترادف ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت

میں بھی احکام قرآن شریف میں تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے، جو عمل کے میدان میں اظہر من الشمس ہے جو سراسر ہمارے حال اور استعداد کے مطابق اس عزیز الحکیم نے ایک اندازہ پر مقرر کر دیا ہے اور بعد از فیصل تکمیل فرمادی ہے۔ كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" [المائدۃ:۳]

"آج کے دن پورا کیا میں نے واسطے تمہارے دین تمہارا اور پوری کی اوپر تمہارے نصیحت اپنی اور پسند کیا واسطے تمہارے اسلام کو دین۔"

اس فیصلے کے بعد، اس آیت بینہ کے نازل ہونے اور اس کا عمل ہو جانے کے بعد تغیر وتبدل منقطع ہو چکا ہے اب یہ کبھی منسوخ نہ ہوگا۔ تو اس سے یہ مقصود حاصل ہوا کہ محویت کی حد کسی کام کے ظہور عمل اور قبل از وجود ہی روا ہو سکتی ہے، بعد میں روا نہیں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ بعض آیات بعد از ظہور عمل منسوخ ہو چکی ہیں۔ چاہیے تھا کہ بعد از ظہور عمل محو نہ ہوتیں؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ نسخ اور چیز ہے اور محو اور۔ نسخ باوجود عمل منقطع ہونے کے وجود رکھتا ہے کیونکہ جن آیات کو مولیٰ کریم نے منسوخ کر دیا ہے ان کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ دوسری آیات اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ منسوخ اور غیر منسوخ ہونے کی صورت میں اصل کلام میں کوئی فرق نہیں۔ سب کا سب قرآن مجید ہی ہے۔ صرف نسخ ہے نہ کہ فرق اصل، اور محو ہونا (وجود نوری ہو یا شہودی) مفقود ہو جانا ہے۔ اس لئے منسوخ آیات محویت کا حکم نہیں رکھتیں۔

مکرر غور اس امر میں لازم ہے کہ متحقق بالذات ہر چیز بلا ظہور وجود ہے اور عالم امر میں مرقوم اور عالم شہود میں ظہور اتم۔ ہر چیز کا اصل الاصول من اللہ ہی ہے اور اس خالق موجودات نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز کو خلقت کیا ہے۔ یعنی اپنی قدرت سے عالم امر کی طرف اور وہاں سے موجودات کی طرف نزول فرمایا ہے۔ گویا عدم سے ہستی کی طرف، نابود کو بود کی جانب، مرکز سے دائرہ کی طرف، ہستی کو وجود اور مخفی کو ظہور کی طرف مبذول کیا ہے۔ جس کیلئے محویت کا عمل مفقود ہو چکا ہے۔ ہاں فرع جو اصل کے تابع ہے تغیر وتبدل کا محل ہے۔ لیکن اصل کیلئے تغیر روا نہیں ہے۔ جیسے متحقق بالذات سے عالم وجود تک ہر چیز کا نزول

فرمایا ہے اور پھراس کو اپنی طرف لے جانے پر قادر ہے اور اس کا عمل ہو رہا ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّآاِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" "ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پھرنے والے ہیں۔"

[البقرۃ ۱۵٦]

اے بھائی! جب اس خالق کائنات، موجد موجودات نے حضرت انسان کو پیدا کر کے ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا تو سب سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس اکڑ بیٹھا۔ حکم ہوا کہ میری درگاہ سے مذموم ومدحور ہو کر نکل جا۔ تو اس نے قیامت تک کیلئے مہلت کی درخواست کی، جو منظور کی گئی۔ اب باوجود مغضوب وملعون ہونے کے اور سخت عداوت ومخالفت کرنے کے وعدہ کے مطابق قیامت سے پہلے محویت تو درکنا اس کو فنا بھی نہیں ہوگی۔ اور یہ سنت الٰہی ہے۔ جس کیلئے ارشاد ذوالجلال والاکرام نہایت تاکید کے ساتھ ہو رہا ہے اِنَّ اللّٰـہَ لَایُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں خلاف کرتا وعدے کا) اگر اس کے برخلاف سارے قرآن شریف میں کہیں ایک دفعہ بھی ارشاد ہوا ہو کہ میں اپنے وعدہ کے خلاف کرنے پر قادر ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف کرنے پر قادر ہے۔

سوال:

یہ مسلمہ امر ہے کہ اس لم یزل ولایزال، بے مثل وبے مثال نے نہ تو کبھی اپنے وعدہ کے خلاف کیا ہے اور نہ ہی کبھی کرے گا۔ لیکن اس قادر مطلق کی قادریت مشیت کے میدان میں قدرت تامہ رکھتی ہے۔ کسی فعل سے عاجز نہیں ہے۔ بہر صورت بہر وجہ قادر مطلق ہے کیونکہ کسی فعل پر صفت قادریت کی نفی جز کی نفی ہے۔ اور کسی جز کی نفی کل کی نفی ہوا کرتی ہے اور یہ محال ہے اور (اسی طرح) قدرتِ تامہ میں نقیض واقع ہوتی ہے۔

جواب:

اس میں کلام نہیں کہ قدیر اس ذوالجلال والاکرام کی صفت بالذات ہے جس کی ضد نہیں ہے اور اس کی ضد عجز ہے، جیسا کہ سوال میں تحریر ہے۔ اب نور ایمانی کے ترازو میں موازنہ کرنا سراسر موجب ہدایت وایقان ہوگا کہ قدرت خداوندی کا تصرف دو جانب پر متصرف ہے۔ ایک تو خلف وعید پر اور دوسرا ایفائے عہد

پر۔ ایفائے عہد کے لئے قرآن مجید میں کئی وجہ پر صاف ذکر فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰـہَ لَایُـخْـلِفُ الْمِیْعَادَ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اور دوسری وجہ پر سارے قرآن شریف میں ایک دفعہ بھی ذکر نہیں ہوا ہے کہ میں اپنے وعدہ کے خلاف پر قادر ہوں۔

۲۔ اوپر ''ردامکان کذب'' میں گزر چکا ہے کہ اس بے مثال کا کوئی فعل بھی ہمارے فعل کی مثل نہیں ہے۔ ہمارے وعدہ کے ایفا کیلئے انتظار کی ضرورت ہے۔ اگر وقت میعاد پر ایفا ہو گیا تو اس میں ہم صادق ہوئے، ورنہ کاذب۔ لیکن اس قوی عزیز کا وعدہ کسی ایفا کا منتظر نہیں ہے بلکہ مطابق ارشاد عزیز الحکیم (کَـانَ وَعْـدُہٗ مَـفْـعُوْلًا) اس کی شان کے لائق ہے۔ اب ذرا عقل و ہوش کے ترازو میں غور و فکر کے اوزان سے موازنہ کیجئے کہ جس کی قادریت کا یہ عالم ہو، اس کے احاطہ قدرت میں خلف وعید کا گمان کب ہو سکتا ہے؟

رہا یَفْـعَلُ اللّٰـہُ مَایَشَآءُ اور یَـحْـکُـمُ مَایُرِیْدُ (یعنی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے) کی بساط پر کسی فعل کی نفی نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی مشیت اور ارادے اپنے ارادوں اور خواہشوں کی مثل ہی سمجھ رکھے ہیں۔ اور یہ سراسر خطا ہے لَیْـسَ کَـمِثْلِہٖ شَیْءٌ کی تعریف اس ذات واحد ہی کیلئے ہے۔ کسی صفت میں اس سبحانہ وتعالیٰ کو اپنی مثل جاننا شرک عظیم ہے۔ اس ذوالجلال والاکرام کی مشیت اور ارادے عیوب کی طرف حاکم نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی کبھی ہوں گے۔ وعدہ کا خلاف کرنا عیب ہے اور مولیٰ کریم تمام عیوب سے پاک ہیں۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

''مَـآاَصَـابَکَ مِـنْ حَسَنَۃٍفَـمِنَ اللّٰـہِ وَمَآاَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍفَمِنْ نَّفْسِکَ'' [النساء:۷۹]

''جو پہنچتی ہے تجھ کو بھلائی سے پس خدا کی طرف سے ہے اور جو پہنچتی ہے تجھ کو برائی سے پس نفس تیرے سے ہے۔''

تو کسی عیب کیلئے اس قادر مطلق کی قادریت کو منسوب کرنا اور ایسا اعتقاد کرنا کہ کرتے تو نہیں لیکن کر سکتے ہیں، سراسر جہالت اور ذات پاک پر الزام کے سوا نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ اپنی تعریف میں لَاتَـاْخُذُہٗ سِنَۃٌوَّلَانَوْمٌ کا ارشاد فرماتے ہیں۔ اب ایسا گمان کرنا کہ اونگھ اور نیند کرتے تو نہیں لیکن کر سکتے ہیں اور اس بات پر قادر ہیں، ورنہ قادریت میں نقص وارد ہوتا ہے، تو اس جہالت کا کیا ٹھکانا۔ کہ تمام

ممتنعات اور سیئات پر اس ذات پاک کو قادر سمجھ لیا جائے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْاِعْتِقَادِ السُّوْءِ ۔اور یہ حقیقت کیخلاف ہے، کیونکہ جو فعل اس ذات پاک کے لائق نہیں ہیں وہ ان پر قادر بھی نہیں ہیں۔قدرت تو صرف ممکنات کے ساتھ مختص ہے۔ایسا نہیں ہے کہ قادر تو ہوں لیکن چونکہ وہ عیب ہیں اس لئے انکو کرتے نہیں ہیں۔اس کی فہمائش کیلئے خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرمایا:

"وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ o وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"	"اور زمین میں یقین والوں کیلئے میرے نشانات ہیں اور تمہارے نفوس میں، کیا تم نہیں دیکھتے؟"
	[الذاریت: ۲۰، ۲۱]

آیات الٰہیہ میں سے ہمارے نفسوں میں روح جس کو امر الٰہی سے تعبیر فرمایا ہے، نشان ہے۔عنصری وجود کے لئے سِنَۃٌ وَّنَوْمٌ یعنی اونگھ اور نیند کو روا رکھا ہے جو اس کے لئے سراسر آرام اور راحت ہے، اور حواس ظاہری کا تعطل اور غفلت کے مترادف ہے۔لیکن روح کیلئے نیند نہیں ہے۔کیونکہ اس کیلئے نیند کی احتیاج نہیں ہے۔یا کھلے لفظوں میں یہ صفت روح میں ہے ہی نہیں۔حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (بوجہ روحانیت غالب ہونے کے) نیند کا غلبہ ہماری مثل نہ تھا۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیند باعث غفلت نہ تھی۔یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی نیند کبھی آپ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے لئے ناقض وضو (وضو توڑنے والی) نہ ہوئی۔تو اس سے یہ مقصود حاصل ہوا کہ اس سبحانہ وتعالیٰ کیلئے ایسی نسبت کا گمان بھی خطا کے سوا نہیں ہے۔جبکہ اس کے امر یعنی صفت کیلئے بھی روا نہ ہو۔بلکہ اس میں اس چیز کا وجود ہی نہ ہو تو اس مالک حقیقی کیلئے امکان کہاں کا؟

اس میں کلام نہیں کہ مولیٰ کریم کی صفت بالذات کی ضد نہیں ہے۔جیسے قدیر اور حی دو صفات ذاتیہ ہیں۔قدرت حیات کے مخالف نہیں ہو سکتی اور حیات قدرت کی نفی نہیں کر سکتی۔تو اس صورت میں کوئی جاہل یہ کہے کہ آپ نہ تو کبھی مرے ہیں اور نہ ہی کبھی مریں گے لیکن چونکہ موت یعنی منتقل ہونا ایک فعل ہے، اور کسی فعل کی نفی یَفْعَلُ اللّٰہُ مَایَشَاءُ کی قادریت کے منافی ہے اس لئے مر سکتے ہیں۔تو کہنا ہی پڑے گا کہ ایسی تنقید کا جو جہالت کے دریا میں مستغرق ہو علاج نہیں ہے۔اور وہ اس لئے کہ موت یعنی منتقل ہونا، کسی

وجود سے یاایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف جاگزیں ہونا ہمارے لئے مولیٰ کریم کی طرف سے روا ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بت میں نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي یعنی حیات کو عالم امر سے وجود کی طرف مبذول کرنا اور پھر اس سے انتقال کی صورت میں عالم برزخ کی طرف لے جانا اور وہاں سے یوم القیمۃ میں مقیم کرنے کے بعد اپنی طرف لے جانا، یہ سب منازل اور مدارج خداوندی فعل سے وابستہ ہیں۔ یہ تغیر وتبدل روح کے آنے اور جانے کے سوانہیں ہے۔ خواہ اس کو انتقال کہیں یا موت سمجھیں، ہمارے جسم ہی کے متعلق ہے۔ لیکن روح میں (جو اس کا اصل ہے، سوائے اس کے کہ یہ جس محل ومقام میں ہو اسی کا حکم رکھتا ہے) کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ تغیر فرع کیلئے ہوتا ہے اصل تغیر کا محل نہیں ہے۔ تو روح کا مرسل کرنا اور لے جانا ہم میں خداوندی فعل ہے۔ اس لئے اس مقام ومحل کے رو سے مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن کچھ ہو، روح کیلئے موت (جس کو عوام فوت ہونے سے تعبیر کرتے ہیں) روانہیں ہے، اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ روح یا دوسرے لفظوں میں انسان کیلئے (جس سے اصل انسان مراد ہے) موت جس کی مراد یہاں مفقود ہونا یا بالکل نیست ونابود ہونا ہے روانہیں ہے۔ بلکہ بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ نہ تو یہ اضطراری وجہ پر ہو سکتا ہے نہ اختیاری۔ بلکہ اس کی تخلیق میں نابود ہونے کا وجود ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ اب انصاف کے میدان میں حق کا طالب ہونا بعید از مقصود نہ ہوگا کہ فعل خداوندی جو مخلوق کے مترادف ہے، اس کا یہ حال ہے کہ وہ مر نہیں سکتا تو اس ذات معلیٰ کیلئے ایسے فعل کے امکان کا گمان جس کا وجود ہی اس سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کی بساط پر ہونا ممتنعات سے ہو، کیسے روا ہو سکتا ہے؟ بلکہ ایسا گمان کرنا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔

گو اس لم یزل ولا یزال لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ [1] کیلئے کوئی مثال روانہیں ہو سکتی۔ تاہم فہمید کیلئے کچھ بیان ہے کہ فِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ [2] کے مطابق قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ [3] کی سنت کے موافق ہر ایک چیز جس کا اصل فعل خداوندی کے سوانہیں ہے۔ اور اصل اصول وہ ذات پاک ہی ہے۔ ممکنات

۱۔ نہیں ہے مثل اس کی کوئی چیز۔ ۲۔ زمین میں نشانات ہیں یقین رکھنے والوں کیلئے۔

۳۔ کہہ ہر کوئی اپنی شکل پر (بناوٹ کے مطابق) عمل کرتا ہے۔

و ممتنعات ہر چیز اس کے اصل کے خلاف کی مقتضی نہیں ہے۔ مثلاً آگ کے شعلہ سے پانی کا ٹپکنا اور پانی سے آگ کا شعلہ، یا لکڑی سے معدنیات اور معدنیات سے لکڑی کا پیدا ہونا، یا روشنی سے اندھیرے کا وجود اور اندھیرے سے روشنی کا وجود ظاہر ہونا ناممکن اور محال ہے۔ یہ حال تو مخلوق کا ہے جو محدث ہے کہ ہر ایک کی خلقت کے خلاف صفات کا ظہور ہونا روا نہیں ہے۔ اور آیات الٰہیہ کا ثبوت ہے۔ اب نور ایمانی کی روشنی میں صاف نظر آئے گا کہ اس مالک کائنات، خالق موجودات، ہر عیب سے پاک، بے مثل و بے مثال، ہماری زعمی قادریت سے مبرا، ہمارے وہم وگمان سے ورا کی طرف کسی عیب مثلاً خلف وعید یا کذب وغیرہ کی نسبت گمان کرنا سراسر خطا بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ اس ذات پاک بابرکات میں کسی عیب کا پایا جانا جس سے ایسے افعال کا ظہور ہو مطلق محال ہے۔ اس لئے ایسے امکان کا گمان کرنا سراسر ظلم عظیم ہے۔

سوال:

سوال تو یہ ہے کہ مولیٰ کریم **لَایُخْلِفُ الْمِیْعَاد** کے مطابق نہ تو خلاف وعدہ کرتے ہیں، نہ ہی کبھی کیا ہے اور نہ ہی کبھی کریں گے۔ لیکن مشیت کے میدان میں اگر اپنے اختیار یا قدرت کاملہ سے کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا اس امر کی طاقت اور قدرت اپنی ذات بابرکات میں رکھتے ہیں یا نہیں؟ کیا اس بے زوال کی قدرت کسی فعل سے عاجز بھی ہے یا ہر کام پر قادر ہے؟

جواب:

تعجب ہے کہ جس قدر سوالات اس مسئلہ میں کئے گئے ہیں ان کے جوابات پر شاید غور سے کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ اوپر گزر چکا ہے کہ اس بے مثل و بے مثال کی کوئی صفت بھی ہماری صفات کی مانند نہیں ہے۔ ہمارے وعدہ کیلئے مدت وعدہ پر ایفا کا انتظار ہوا کرتا ہے۔ اگر اس وقت پر ایفا ہو گیا تو سچ، ورنہ جھوٹ۔ لیکن اس عزیز الحکیم کے وعدہ کیلئے ارشاد مولیٰ کریم **کَانَ وَعْدُہٗ مَفْعُوْلًا**[۱] کا مقتضی ہے۔ خواہ اس کے عمل میں تاخیر ہو لیکن اس کے ہونے کے فیصلہ میں کوئی گنجائش انتظار کی نہیں ہوا کرتی۔ اب فیصل شدہ اس قادر مطلق کے فعل میں تغیر کا امکان سمجھنا سوائے جہالت کے نہیں ہے۔ رہا قادریت کا سوال تو کوئی وجہ

۱۔ ہے وعدہ اس کا پورا کیا گیا۔

پر جواب تو اس کا ہو چکا ہے۔ تاہم یہ ناتواں اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وَمَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّابِاللّٰہِ!

عزیز!! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، اس ذات احد کی صفات بالذات جو باوجود تابع ذات ہونے کے ذات سے ایسا اتصال رکھتی ہیں کہ وہ ذات ہی ہیں، سات ہیں: (۱) حی (۲) قدیر (۳) مرید (۴) کلیم (۵) سمیع (۶) بصیر (۷) علیم۔

یہ ذات سے منفک (جدا) نہیں ہیں۔ نہ ہی کبھی ہوئی ہیں اور نہ ہی کبھی ہوں گی۔ جس طرح ذات معلّٰی قدیم ہے اسی طرح یہ بھی قدیم ہیں۔ صرف کے لحاظ سے یہ صفات صفت مشبہ ہیں۔ جس سے مقصود اتصال فی الذات کے سوانہیں ہے۔ اور تمام افعال خداوندی جو توحید فی الخلق کے مترادف ہیں الی الخلق فاعل ہیں۔ اور یہ صفت بالذات مرید کی تحریک کے تابع ہیں۔ گو ہر ایک صفت ذوالجلال والاکرام اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے۔ ہر صفت واصفِ کل لامحدود ہے تاہم ہماری فہمید کیلئے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ صفت مرید بدوں قدرت اور قدرت بدوں حیات کے فعل کی طرف راجع نہیں ہیں اور ان پر علم کا احاطہ وسیع ہے۔ اور امر جو کلیم کی صفت کے تابع ہے اس سے فَیَکُوْنُ کا ظہور ہے۔ اور سماعت وبصارت اپنے فعل کی سامع اور معائنہ کرنے والی ہیں۔ باوجود حقیقت کے میدان میں ان صفات کے واصف کل لامحدود ہونے کی صورت میں تقسیم محض فہمید کیلئے روا رکھی گئی ہے۔ جس سے یہ مقصود حاصل کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک صفت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہے اور نہ ہی ان تمام صفات کی کوئی ضد ہوسکتی ہے کیونکہ وہ ذات معلّٰی اس سے پاک اور بری ہے مثلاً ذوالجلال والاکرام سمیع وبصیر اور کلیم ہیں تو یہ نہ ہوا ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے کہ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے مصداق بھی ہوں۔ اور ایک دوسرے کی ضد کی نفی اس وجہ پر ہے کہ حی بھی ہیں اور قادر بھی، لیکن قدرت مطلق کبھی اس امر کی مقتضی نہیں ہوسکتی کہ مر بھی سکیں یا مرنے کی قدرت ہی رکھتے ہوں اور یہ اس لئے کہ یہ حی کی ضد ہے اور وہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ہر صفت پاک میں ضد سے مبرا ومنزہ ہیں۔ اب نور ایمانی کے میزان میں غور وفکر کے صحیح اوزان سے موازنہ کرنا بعید از انصاف نہ ہوگا کہ ایسی قادریت کے امکان کا گمان جو ذات باری تعالیٰ کی صفت بالذات کی ضد ہو، سوائے جہالت کے مطلق روا نہیں ہوسکتا۔

ان سات صفات بالذات کے علاوہ دوسری سب کی سب صفات بالفعل ہیں۔جن کا تصرف الی الخلق معروف ہے۔ان کی نسبت دووجہ پر متحقق ہے۔ایک تو الی الخلق ہے جس کی نسبت خالق موجودات کی طرف ہے۔اور دوسری جس کی نسبت من اللہ خلق کی طرف ہے۔لیکن ایسی نسبت الی اللہ حرام ہے۔مثلاً قدیر صفت مشبہ ہے جواس ذات احد سے منفک نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔اس کا اثبات ذات کے ساتھ بلاواسطہ ہے۔بلکہ ایسا اتصال ہے جس کی تمیز محال ہے۔گویا قدیر ہیں تو مطابق واصف کل جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے لامحدود ہیں۔قدیر ہیں تو سارے ہی ہیں۔یعنی سراسر قدرت ہی ہیں اور اس طرح پر ہر ایک وصف میں ہیں۔اور قادر ہونا کسی غیر پر قدرت رکھنا یا قابو پانا ہوتا ہے۔جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ۔جس کے معنی مسلمہ ہیں کہ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔'' چونکہ اس جگہ لفظ قدیر استعمال ہوا ہے اس لئے جاننا چاہئے کہ اللہ جل شانہ اپنی صفت لایزال میں قدیر ہیں اور صفت بالفعل کے لحاظ سے قادر۔چونکہ ایسے صفات کے دورخ ثابت ہیں اس لئے اب ان صفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اوپر کی دلیل کے موافق ہیں۔یعنی جو نسبت محض خلق کی طرف ہے وہ ذات معلیٰ کے لئے حرام ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ٥ هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ"

[الحشر:۲۳،۲۴]

''وہی ہے اللہ جونہیں کوئی معبود مگر وہ، بادشاہ ہے بہت پاک، سلامت سب عیبوں سے، امن دینے والا نگہبان، غالب، زبردست، تکبر والا، پاکی ہے اللہ کو اس چیز سے کہ شریک لاتے ہیں۔وہی ہے اللہ پیدا کرنے والا۔درست کرنے والا، صورتیں بنانے والا واسطے اسی کے ہیں نام اچھے۔پاکی بیان کرتے ہیں واسطے اس کے جو کچھ بیچ آسمانوں کے اور زمین کے ہیں اور وہی ہے غالب حکمت والا۔''

ان صفات میں سے اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ اور اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ اور اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ تو ذات باری تعالیٰ کیلئے ہے۔ جس کی نسبت مخلوق پر مالک ہونا، دوسرا حدث وعیوب سے پاک ہونا، اور مخلوق کو پیدا بر حکمت کرنا اور اس پر غالب ہونے کے سوانہیں ہے۔ اور ان صفات کی نسبت ذوالجلال والاکرام کی طرف ہے۔ جو کسی حال میں بھی مخلوق کی جانب نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ممتنعات سے ہے۔ باقی صفات میں سے اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ کی نسبت مخلوق کی جانب ہے خالق کی طرف سے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ خالق تو ہیں، مخلوق نہیں ہیں۔ باری ہیں لیکن خود پیدائش نہیں ہیں۔ مصور تو ہیں لیکن خود تصویر نہیں ہیں۔ اور ان کیلئے اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ہیں، سیئۃ نہیں ہیں۔ اس کی نسبت خواہ تابع صفت بالفعل ہو یا صفت بالذات سبحانہ وتعالیٰ کیلئے کسی صورت میں روانہیں ہے۔ اسماء الحسنٰی سے یہ مقصود حاصل کرنا بعد از ایقان نہ ہوگا کہ ہر اسمائے الٰہیہ سے اس کے تحت میں یا اس کی صفت کے مطابق معانی اور افعال ہوا کرتے ہیں۔ جیسے خالق کو مخلوق سے اور رازق کو مرزوق سے نسبت ہے۔ اب جاننا چاہئے کہ صفات بالفعل جو دراصل صفات بالذات ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صفات بالفعل تابع صفات بالذات ہیں اور صفات بالذات تابع ذات۔ تو ان تمام صفات میں یہ مقصود حاصل کرنا لازم ہے کہ جن صفات بالفعل کی نسبت رب العالمین کی طرف ہے اور جن کی نسبت من اللہ خلق کی طرف ہے، کیا فرق ہے اور اس فعل سے مفاد کیا ہے؟

جاننا چاہیے کہ جن صفات بالفعل کی نسبت ذات کی طرف ہے وہ غیر کی طرف ہرگز روانہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ جب غیر نہ تھا تب بھی ان صفات کی قدرت ذات معلیٰ میں جیسی کہ اب ہے، موجود تھی۔ اور جونسی صفات جن کی نسبت حدث کے مترادف ہے، مخلوق کے لائق ہیں اور ان کی نسبت ذات معلیٰ کی طرف کرنا کفر اور جہالت کے سوانہیں ہے۔ کیونکہ مولیٰ کریم خالق تو ہیں، اور مطابق یَخْلُقُ مَایَشَاءُ جیسی چاہیں مخلوق پیدا کرسکتے ہیں لیکن اس قدرت کی نسبت یعنی عمل اپنی ذات کیلئے روانہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق محدث ہے جو تغیر کا محل ہے اور اس کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف حرام ہے۔

علیٰ ہذا القیاس مولیٰ کریم کا وعدہ کسی مخلوق ہی سے ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔ لیکن اس کے خلاف یا ایفا کی نسبت مخلوق کی طرف ہرگز نہیں ہے بلکہ محض اپنی ذات پاک کی طرف ہے۔ اور وعدہ خلافی

ایک صریح عیب ہے، اور مولیٰ کریم تمام عیوب سے پاک ہیں اور قدرت اس امر کے منافی ہے کہ وعدہ خلافی کا ارتکاب ہو سکے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ذات میں اس کی قدرت کا بھی اعتقاد رکھنا سراسر جہالت بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ جس طرح قدرت کے میدان میں صفت بالذات کے خلاف کا امکان ناممکن ہے اسی طرح خلف وعید بھی اسی کے مترادف ہے۔ اور یہ اس لئے کہ قُدُّوسٌ مولیٰ کریم کی اعلیٰ صفات سے ہے۔ جس کے معانی تمام عیوب سے پاک اور مقدس ہونے کے ہیں۔ اگر زعمی قادریت کی وسعت کے لحاظ سے خلف وعید کے امکان کے جواز پر یقین کیا جائے تو سراسر عیب ہے تو صفت قدوس ذات باری تعالیٰ میں تغیر واقع ہوگا۔ اور یہ محال ہے۔ اس صفت قدوس کی نسبت مخلوق کی طرف کسی وجہ پر بھی منسوب نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق تغیر وحدوث کا محل ہے اور اس ذات پاک کی صفات میں تغیر روا نہیں ہے۔

مکرر:

یہ کہ ذات سبحانہ وتعالیٰ میں بدوں عرف الٰہیہ کے غور وفکر کرنا جہالت ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے کہ ذات کیلئے مخلوق میں غور وفکر کرو تا کہ مقصود حاصل ہو۔ اور ذات پاک میں تدبر سے کام نہ لو۔ کلام الٰہی بھی اس حدیث شریف کی تطبیق کرتا ہے۔ جیسا اوپر گزر چکا ہے وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَاتُبْصِرُوْنَ یعنی کیا تم اپنی جانوں میں نہیں دیکھتے۔

عزیز! عزیز الحکیم اپنی حکمت کاملہ سے تجھے حصہ نصیب کریں، جاننا چاہئے کہ خالق مخلوقات موجودات نے کس تدبیر پر مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ اور کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ کی سنت کیسی زبردست واقعہ ہوئی ہے جس کا مطابق لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا تغیر وتبدل محال ہے۔ مثلاً پانی سے آگ اور آگ سے پانی، بھاپ سے جمادات اور نباتات سے معدنیات، علیٰ ہذا القیاس! لطیف سے کثیف اور کثیف سے لطیف کا فعل سرزد ہونا مطلق ناممکن ہے اب نور ایمانی سے یہ معلوم کرنا بعد از تحقیق نہ ہوگا کہ سوائے ان افعال کے جو باری تعالیٰ کی ذات کے لائق ہوں امکان کا گمان کرنا جہالت اور نادانی ہے۔

بار بار سوال خداوندی قدرت اور طاقت ہی پر ہو رہا ہے کہ کسی فعل کو فاعل حقیقی کریں یا نہ کریں، طاقت رکھتے ہیں۔ وہ قدیر اپنی قدرت کاملہ میں قادر اتم ہیں یا نہیں؟ اس لئے اب میں اس لم یزل

ولایزال، بے مثل و بے مثال ہی سے توفیق مانگتا ہوں تاکہ اسی کی طاقت اور قدرت سے اس مشکل کو حل کروں۔ وَمَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّابِاللّٰہِ!

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قدیر ایک صفت بالذات ہے جس کی کوئی ضد نہیں ہے۔ بہر حال اور بہر وجہ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَایَشَاءُ اور یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ کے رو سے قادر ہیں۔ جن کا تصرف حقیقت کے میدان میں تین نوع پر منقسم ہے: (۱) تصرف فی الذات (۲) تصرف فی الامر (۳) تصرف فی الخلق۔

۱۔ تصرف فی الذات:

الان کما کان، ذات کیلئے ذات میں نہ تصرف نہ تحریک اور نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل، صفت بالذات محض تابع، متبوع کیلئے تابع کا تصرف حرام۔

۲۔ تصرف فی الامر:

یعنی عالم امر کی تخلیق، جب صفت ''مرید'' کو ذات باری تعالیٰ نے ظہور کے میدان میں اپنی مشیت سے تحریک کی تو عالم امر کی طرف رجوع فرمایا اور جیسا کہ چاہا اپنے تصرف سے ہویدا کر دیا۔ اور اس میں تصرف روحی کا اجرار کھا ہے۔ مثلاً لوح محفوظ اور قلم ورقم کتاب مسطور سب کے سب نوری وجود میں ثابت ہیں۔ اور قدرت اور تصرف بھی ان کیلئے مقام ومحل اور وجود کے موافق ہی متصرف ہوا ہے۔

۳۔ تصرف فی الخلق:

اظہر من الشمس ہے جس کی تخلیق عالم شہود میں خاکی وجود سے واقع ہوئی ہے جو کئی نوع پر منقسم ہے۔ تاہم تصرف دو وجہ پر ہے۔ ایک سرشتی اور دوسرا اضافیہ جو تقدیر کے بیان میں گزر چکا ہے۔ تو خواہ سرشتی ہو یا اضافیہ، ہر دو کی قدرت اور طاقت بہر کیف من اللہ ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرشتی توفیق میں انسان قدریہ کے موافق ہے یعنی کسی قدر اختیار من اللہ روا ہے۔ اور اضافیہ میں جبریہ کے مطابق ہے اور یہ محض تصرفات خداوندی سے ہے جس میں آدمی مجبور اور لاچار ہوتا ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"نَحْنُ خَلَقْنٰکُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمْ مَّاتُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ" ''ہم نے پیدا کیا ہے تم کو پس کیوں نہیں مانتے تم۔ یعنی دوبارہ اٹھنا۔ کیا پس دیکھا تم نے جو

[الواقعة:۵۷تا۵۹] نطفہ ڈالتے ہوتم۔کیاتم پیدا کرتے ہواس کو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟"

"اَفَرَءَ یْتُمْ مَّاتَحْرُثُوْنَ ؀ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَ"[الواقعة:۶۳،۶۴] "کیاپس دیکھاتم نے جو بوتے ہوتم۔کیاتم کھیتی کرتے ہواس کو یا ہم کھیتی کردیتے ہیں؟"

یعنی نطفہ رحموں میں ڈالنا تمہارا کام ہے لیکن بچہ بنانا میرا کام ہے۔اورتخم زمین میں دینا تمہارا کام ہے اوراگانااور پرورش کرنا میرا کام ہے۔

اب جاننا چاہئے کہ نطفہ یا بیج وجودی نظام کے روسے وجود سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کو ہمارے فعل سے متعلق فرمایا ہے۔اوراس کی پرورش چونکہ روحانی ہے اس لئے روحی تصرف کو جو قادریت کے مطابق ہے اپنے فعل سے منسوب کیا ہے۔درحقیقت سرشتی توفیق بھی اس ذوالجلال والاکرام ہی کی طرف سے ہے،اورموجدموجودات وہی خالق کائنات ہے،تاہم تقسیم کومحل ومقام کی روسے اسی کی جانب نسبت دی ہے۔اوراعمال کی روسے تغیرحال کی وجہ پرجب اضافیہ تصرفات کااجراہوتاہے تو خواہ وہ بِمَاكَانُوْايَكْسِبُوْنَ کی وجہ سے غضبی صورت ہو یا فرماں برداری کے روسے رحمی،مطابق فرمان ایزدمتعال:

"مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ ؀ وَمَنْ يَّهْدِاللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ" "جس شخص کواللہ تعالیٰ گمراہ کرے پس نہیں ہے واسطے اس کے کوئی ہدایت دینے والا اور جسے اللہ ہدایت دے پس نہیں واسطے اس کے کوئی گمراہ کرنے والا۔"

کاتصرف قدرت خداوندی سے ہوا کرتاہے۔اب اس میں تو کلام نہیں کہ سرشتی توفیق سے ہو یا اضافیہ تصرف سے،سب کا سب اس فاعل حقیقی کے فعل سے ہے۔زیادہ طول دینا اس جگہ مقصود نہیں۔تفصیل سے تقدیر کے بیان میں ذکر ہوچکا ہے۔مقصود اس جگہ طاقت اورقدرت کے اثبات پر ہے،اور اثبات قدرت ذات بلاشبت ماسوائے بےمثال و بےزوال الان کماکان ہے۔اور ہرقدرت اس قدیر کے تابع اورمسخر ہے جو غالب کل غالب کے مصداق ہے۔لیکن ذاتی تصرفات کے بغیر ہرمقام ومحل پر

قادریت صفت بالفعل کے مترادف ہے۔جیسا اوپر گزر چکا ہے کہ عالم امر میں تصرفات روحی ہیں اور عالم شہود میں تصرفات اجسادی اور وہ اس لئے کہ جب کچھ نہ تھا مولیٰ کریم اپنی ذات میں سوائے صفت بالذات کے کوئی ظہور نہ رکھتے تھے۔ جب ظہور چاہا تو اپنی قدرت کاملہ سے عالم امر کی طرف مرید ہوئے اور وہاں سے عالم موجودات کی طرف ظہور اتم فرمادیا۔اس سے یہ مقصود حاصل کرنا لازم ہے کہ خواہ عالم امر ہو یا عالم اجساد، معیت خداوندی کے سوا نہیں ہے، جو کل تصرفات اور قدرت کا مالک ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

"اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ" [الملك:۱۹]

"کیا نہ دیکھا انہوں نے طرف پرندوں کے اوپر اپنے پر کھولے ہوئے اور سمیٹ لیتے ہیں۔ یقیناً تھام رکھتا ان کو مگر رحمٰن۔ یقیناً وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔"

یعنی پرندوں کے فعل کو اپنے فعل کی جانب صریح نسبت فرمائی ہے جو عین قدرت ہی ہے۔لیکن یاد رہے کہ اس سے ذات کو حلول نہیں ہے۔اور حلولیوں کے سب قول باطل ہیں:

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

مطابق قول بزرگے: "جو حدث کو قدم سے نہیں پہنچانتا۔یعنی اس کے فرق کو نہیں جانتا وہ اپنے سب اقوال میں جاہل ہوتا ہے۔"

عزیزا! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں۔محل ومقام کے لحاظ سے بہر صورت اور بہر وجہ تمام طاقتیں اور تمام قدرتیں اس قادر مطلق ہی سے ہیں۔لیکن ان افعال کو جو حدث کے لائق ہیں قدم کی طرف منسوب کرنا سراسر جہالت ہے۔مثلاً اولاد کا پیدا کرنا مطابق ارشاد: ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ فعل خداوندی سے وابستہ ہے جس کا مقام ومحل مخلوق کے سوا روا نہیں ہے۔لیکن ذات پاک سے ذات سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ایسی قدرت کا جاننا کفر اور شرک ہے:

"تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا

"نزدیک ہیں آسمان کہ پھٹ جائیں اس سے اور پھٹ جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ

لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًاo وَمَا يَنۢبَغِىْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا" کر۔اس سے کہ دعویٰ کیا انہوں نے واسطے اللہ کے اولاد کا۔اور نہیں لائق واسطے رحمٰن کے یہ کہ پکڑے اولاد۔"

یا فرمایا ہے لَاتَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَانَوْم یعنی اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی۔اب یہ خیال کرنا کہ سوتے تو نہیں۔لیکن اگر چاہیں تو قدرت کے منافی نہیں ہے۔تو اس نادانی کا کیا علاج ہے؟ اونگھ کرنا یا سونا وجود کیلئے موجب راحت ہے اور روح کو اس فعل یعنی نیند کی احتیاج نہیں ہے۔تو ایسی قدرت جو مخلوق میں نہ پائی جانی ثابت ہے۔اس کی نسبت خالق کونین کی طرف کیا ہوگی؟

اب ذرا نور ایمانی سے مطابق سنت اللہ جل شانہ کے فکر کرنا غیر مفید نہ ہوگا کہ اس قادر مطلق کی قدرت کا ظہور عالم روحانیت اور عالم شہود میں اظہر من الشمس ہے، تغیر کا محل ہے۔اور ذات سبحانہ وتعالیٰ میں تغیر روا نہیں ہے۔تو ایسی قدرت کا گمان جو محدث کے لائق ہو،اس کی نسبت حق تعالیٰ کیلئے حرام ہے۔ان صاحبان پر سخت تعجب ہے جنہوں نے اس ذات پاک کی قادریت کو ہر فعل نیک وبد پر رکھا ہے۔ اور معیار یہ رکھا ہے کہ قادریت کے کسی جز کی نفی قادر مطلق کی قدرت تامہ میں نقیض واقع ہونے کی مقتضی ہے۔اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ اس لم یزل ولایزال کو اپنی مثل خیال کر رکھا ہے اور یہ سراسر نادانی اور جہالت ہے جس کی وجہ حدث سے قدم کو نہ پہنچاننا ہے۔

عزیز! عالم موجودات سے عالم محسوسات لطیف اور وسیع ہے۔اور عالم محسوسات سے عالم معلومات لطیف اور وسیع تر ہے۔اور عالم معلومات سے عالم معروفات لطیف درلطیف اور وسیع ہے، جو عالم امر کے مترادف ہے۔اور ذات باری تعالیٰ ان تمام عوالم سے بدر جہا بالا تر لطیف درلطیف ہے۔

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" [الانعام:۱۰۳] "نہیں پاتی ہیں اس کو آنکھیں اور وہ پاتا ہے سب نظروں کو۔اور وہی ہے باریک بین خبردار۔"

آنکھ وجود میں لطیف ہے اوراس (آلہ نظر) میں نور بصارت لطیف تر۔علی ھذ االقیاس!ان تمام عالموں کوایک دوسرے سے قریب ہونے کے لحاظ سے رشتہ تو ہے،لیکن لطیف ہونے کے رو سے کوئی نسبت نہیں ہے۔اسی طرح محسوسات کا احاطہ تو ہے لیکن محسوسات کومعلومات پراحاطہ مشکل۔کیونکہ علم کی حس محسوسات میں نہیں ہے۔لیکن محسوسات سے علم کواحساس ہوا کرتا ہے۔ایسا ہی معلومات پر عالم معروفات کا احاطہ وسیع تر ہے۔عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔یعنی ان تمام عالموں کو جومحاط کے درجہ پر ہیں۔محیط کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔اورمحیط ان پر لطافت کے رو سے غالب ہے۔محیط کی قدرت محاط پر ہرلحاظ سے ممکن ہے،لیکن محاط محیط پر قدرت نہیں رکھتا ہے اس لئے محیط کا فعل کسی محاط کی مثل نہیں ہوسکتا۔

گواس بے مثل کیلئے کوئی مثال درست نہیں آسکتی،تاہم فہمید کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں۔بموجب ارشاداللہ جل شانہ (فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَاتُبْصِرُوْنَ) غورکرنا لازم ہے کہ ہمارے نفوس یاضمیر یا وجود میں سوائے روح کے کوئی چیز نہیں ہے۔سب قدرت اور طاقت وجود میں روح ہی سے ہے۔ہرقسم کی حرکات وسکنات اورافعال اسی سے صادر ہورہے ہیں۔عالم شہود کی زندگی سے موت تک بحکم خداروح ہی رب الــوجــود ہے۔یعنی تمام نشوونما اسی سے ہے۔جسمانیت کا محافظ ورہنما،اس کشتی بےحس کا ناخدا،تمام اثرات کا حامل،روحانیت کے میدان کا شجر،وجود میں داخل ہونے سے باعث زندگی اور خارج ہونے کی صورت میں موجب موت اورعفونت وپراگندگی ہے۔وجود میں بمنزلہ فاعل حقیقی ہونے کے باوجوداس کو وجود سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔وجود سے بدرجہا لطیف تر ہے۔وجودمثل جامہ کے ہے اور یہ صاحب جامہ۔سوائے ان افعال کے جومحض روحانیت سے مناسبت رکھتے ہیں،وجودی افعال مثلاً کھانا،پینا،سونا اورمباشرت وغیرہ جن سے اثبات وجود ہے،گوروح کے بغیران کا تصرف وجود میں مطلق ناممکن ہے تاہم روح کوان افعال سے کوئی نسبت نہیں ہے۔یادوسرے لفظوں میں ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یاان کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔یعنی افعال وجودی کا سوائے وجود کے ظہور ہونااس کی ذات سے محال ہے۔باوجود قدرت رکھنے کے ایسے افعال کا وقوع اس کے احاطہ امکان سے باہر ہے۔

روح کلام الٰہی کے لحاظ سے امر الٰہی ہے جوقبل ازظہور متحقق بالذات اور بعدہ عالم روحانیت میں من

امر ربی کے رو سے امر اور اب محل و مقام کی وجہ پر مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ جب مخلوق کا اپنی سرشت میں یہ حال ہے تو خالق کائنات بے مثل و بے مثال جس کی نسبت سوائے صفت بالفعل کے مخلوق کے ساتھ روا نہیں ہو سکتی کیا گمان ہو سکتا ہے؟ بمصداق:

جو کچھ قیاس اور گماں وہم میں آئے
اس سے بھی ورا بلکہ ورا سے بھی ورا ہے

جو گمان بھی ہم کریں گے ہم خود ہی ہوں گے، نہ کہ خدا جل وعلیٰ:

انسان ماخذ فی الضمیر کے سوا معرفت الٰہی میں مطلق جاہل ہے، اور ان صاحبان کی غلطی کا سبب بھی یہی ہے۔ اس لئے سوائے قرآن الحکیم کی دلیل کے چارہ نہیں ہے۔ عزیز! دیکھ اور فکر کر۔ تا کہ حقیقت تجھ پر ظاہر ہو کہ اللہ جل شانہ نے ہر مقام ومحل کے مطابق اپنے فعل کی کس طرح تصریح فرمائی ہے:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ o اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ o وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ o تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ o فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ"

[الفیل: ا تا ۵]

"کیا نہ دیکھا تو نے کیونکر کیا پروردگار تیرے نے ہاتھی والوں کے ساتھ؟ کیا نہ کر دیا مکر ان کا بیچ گمراہی کے؟ اور بھیجے اوپر ان کے پرند جانور جماعت جماعت پھینکتے تھے ان پر پتھر کنکر سے۔ پس کر دیا ان کو مانند بھوسے کے کھائے ہوئے کے۔"

یعنی فعل کو فاعل حقیقی نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور مقام ومحل کے رو سے ابابیل کو ملازم کیا ہے۔ کیونکہ عالم اسباب میں سنت اللہ اسی طرح جاری ہے اور تا قیامت اسی طرح جاری و ساری رہے گی۔ دوسری جگہ فرمایا ہے:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا o ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا"

"بھلا تم نے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس طرح دراز کر کے پھیلاتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس

[الفرقان:۲۵،۲۶] پردلیل ٹھہرایا پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچ لیا۔''

یہ پہلی دلیل سے بھی زیادہ روشن اور صاف ہے کہ سایہ کا بڑھانا، ٹھہرانا، اور سمیٹنا سب اپنے فعل کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فرمادیا ہے کہ اس کا رہنما ہم نے سورج کو بنایا ہے۔ یعنی بظاہر دیکھنے میں تو سایہ کی حرکات وسکنات آفتاب کی حرکت کے تابع ہیں لیکن فاعل حقیقی اللہ جل شانہ ہیں۔ اب یہ مسلمہ امر ہے کہ سایہ سورج کی ضیا کے سامنے اوٹ کے باعث ہے۔ اگر آفتاب نہ ہوتا تو سایہ کا وجود ہونا ناممکن تھا۔ آج اگر سورج (جو مخلوق ہے) بحکم خدا فنا ہو جائے تو کہاں کا سایہ اور کیسی حرکات وسکنات؟ تو سمجھنا چاہیے کہ مولیٰ کریم کا ہر فعل مقام ومحل کی رو سے اسی کے موافق ہوا کرتا ہے، روح کے مرسل کرنے اور واپس لے جانے کیلئے اسی کے موافق ملک موکل کئے ہیں اور عالم شہود میں اپنے تصرفات اور فعل کیلئے موجودات ہی میں برگزیدہ فرمائے ہیں۔ اور ہر قسم کے تصرفات اس فاعل حقیقی ہی کی طرف سے متصرف ہیں۔ خصوصاً انسان کے ذکر میں جس کا بیان قرآن الحکیم میں اظہر من الشمس ہے۔ خواہ توفیق یعنی سرشتی وجہ پر ہو یا اضافیہ، ہر فعل کے موجد اللہ جل شانہ ہی ہیں۔ سرشتی توفیق وہ ہے جو انسان کی سرشت میں مرسل کی گئی ہے۔ مطابق:

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا o قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" [الشمس: ۸ تا ۱۰]

''پس جی میں ڈالی اس کے بدکاری اس کی اور پرہیزگاری اس کی۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے پاک کیا اس کو۔ اور بے شک نامراد ہوا جس نے گاڑ دیا اس۔''

یہ آزمائش کے میدان میں امر ونواہی کی وجہ اور اعمال کے رو سے ہے۔ اور اضافیہ صورت وہ ہے کہ آزمائش اور فیصلہ ہو جانے کے بعد تصرف الٰہی (خواہ غیرت کی رو سے ہو، خواہ رحمت کی وجہ پر) انسان کیلئے حلال ہو جاتا ہے۔ كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

"فَمَنْ يُّرِدِاللّٰـهُ اَنْ يَّهْدِيَـهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْاَنْ يُّضِـلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًـاحَرَجًـاكَـاَنَّـمَايَصَّعَّدُفِي السَّمَـاءِ كَـذَالِكَ يَـجْـعَـلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ وَهٰذَاصِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا"
[الانعام: ۱۲۵، ۱۲۶]

"پس جس کو ارادہ کرتا ہے اللہ یہ کہ ہدایت کرے اس کو، کھول دیتا ہے سینہ اس کا واسطے اسلام کے اور جس کو ارادہ کرتا ہے یہ کہ گمراہ کرے اس کو، کرتا ہے سینہ اسکے کو تنگ، بند۔ گویا کہ زور سے چڑھتا ہے بیچ آسمان کے۔ اسی طرح کرتا ہے اللہ ناپاکی اوپر ان لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے۔ اور یہ ہے راستہ پروردگار تیرے کا سیدھا۔"

جس کے دو رخ ہیں۔ ایک تو بندہ سے خداوند کریم کی طرف، اور دوسرا خداوند عزوجل کی طرف سے بندہ کی جانب۔ بندہ سے رب العزت کی طرف سوائے فرماں برداری اور مجاہدہ کے نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بندہ کی طرف تصرفات عنایت، رحمت اور ہدایت ہے۔ جیسا کہ آیت شریف میں بیان فرمایا ہے کہ جس کیلئے ہم ہدایت کا ارادہ کرتے ہیں اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتے ہیں، اور جس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتے ہیں۔ تو اب معلوم ہونا چاہئے کہ سرشتی توفیق میں تو فعل خداوندی توفیق کی وجہ پر ہے اور اضافیہ صورت کی رو سے تصرف الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ خواہ مقام وحال کی وجہ سے کسی صورت پر ہو، اس خالق کائنات، موجد موجودات کے تصرفات سے ہے۔ اس سے یہ مفاد حاصل کرنا سراسر موجب ہدایت ہوگا کہ سرشتی توفیق جس کے آزمائش کے میدان میں دو رخ ہیں: فرمانبرداری اور نافرمانی۔ اور کلام پاک سے اس کا فیصلہ یوں فرمایا ہے:

"مَـا اَصَـابَكَ مِـنْ حَسَـنَةٍفَمِـنَ اللّٰـهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍفَمِنْ نَّفْسِكَ"
[النساء: ۷۹]

"جو کچھ پہنچتا ہے تجھ کو بھلائی سے بس خدا کی طرف سے ہے اور جو کچھ پہنچتا ہے تجھ کو برائی سے پس وہ نفس تیرے سے ہے۔"

چونکہ سیئات میں (جن کو انسان کی طرف منسوب فرمایا ہے) کس قدر انسان کو مختار کیا ہے، اس لئے

اس کی نسبت خلاف کلام اللہ مولیٰ کریم کے فعل کی طرف کرنا ظلم عظیم ہے۔ ایسا ہی ان افعال کی نسبت جو عیب ہیں، اللہ تعالیٰ کے فعل کی طرف منسوب کرنا کفر ہے۔ کیونکہ سبحانہ تعالیٰ کی تعریف اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ ہے اور قادریت کے میدان میں ایسی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا قدوسی صفت کی ضد ہے اور وہ ذات معلیٰ ضدوں سے پاک ہے۔ ہاں غیرت کی رو سے نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۱ کی وجہ پر فعل خداوندی کا تصرف مسلم ہے، جس کی نسبت قادریت کے میدان میں سنت اللہ کے موافق ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تمام تصرفات ہمارے حال کی وجہ پر صفت بالفعل سے وابستہ ہیں۔ گو صفت بالفعل کا واسطہ صفت بالذات کے ساتھ ہے لیکن صفت بالفعل کے سوا ذات سے ان اوصاف کو کوئی نسبت نہیں ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اور اس کی فہمائش کیلئے اوپر روح اور جسم کی مثال گزر چکی ہے۔ یعنی وجودی افعال (کھانا، پینا، سونا وغیرہ) کوئی فعل روح کے سوا نہیں ہے۔ لیکن بایں ہمہ روح ان تمام عوارضات سے مبرا و منزہ ہے۔ تو مقام غور ہے کہ اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال کیلئے مخلوق کی سی نسبت کرنا کونسی قادریت کو ثابت کرنے کیلئے روا ہوگی؟ اب اس امر سے خوف کرنا چاہئے کہ ان افعال کی نفی جو ذات سبحانہ وتعالیٰ کے ہرگز لائق نہیں ہوسکتی، قدرت اور طاقت کی نفی پر قیاس کی جارہی ہے...... ہیہات !!

یہ امر مسلمہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ میں بغیر معرفت الٰہی کے کلام جہالت کے سوا نہیں ہے اور یہاں معرفت تو در کنار، معلوم ہوتا ہے کہ علم ذات باری تعالیٰ کے نہ ہونے کی وجہ سے قادر مطلق کی قادریت کو اپنی ہی قدرت اور طاقت پر قیاس کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلف وعید کی قدرت کے قائل ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ عیب ہے جو اس قدوس کی شان کے لائق نہیں۔ نہ معلوم کہ عیب تو در کنار، جو مخلوق کے نزدیک کار ثواب اور روحانیت کا ثمر اور اعلیٰ مقصود ہے وہ بھی ذات باری تعالیٰ کیلئے مطلق روا نہیں ہے۔ مثلاً عبادت کرنا، عاجز ہونا، ثواب کا طالب ہونا، مجاہدہ کرنا، فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کے راستہ صراط المستقیم پر چلنا، قرب خداوندی کیلئے سعی کرنا، ذکر اور فکر کرنا، ندامت کے ساتھ توبہ کرنا۔

۱۔ پھیرتے ہیں ہم اس کو جدھر پھرتا ہے اور ملائیں گے ہم اسے دوزخ کو۔

اب ذرا گوش ہوش سے پنبہ غفلت کو ہٹا، چشم بصیرت کو کھول اور طلب حق کے قدموں کو ادب کی بساط پر رکھ کر تحقیق کے ترازو میں نور ایمانی کے اوزان سے موازنہ کر کے دیکھ کہ جس کی شان میں لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ[۱] کا فرمان ہے اس کیلئے کسی فعل کی مناسبت ومماثلت کسی مخلوق سے روا ہو سکتی ہے؟

۱۔ نہیں ہے مثل اس کی کوئی چیز۔

انسان ازلی سعید ہے

سوال:

قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم ہے:

"وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ"

[الاعراف: ۱۷۹]

''اور البتہ بیشک پیدا کیا ہم نے واسطے دوزخ کے بہت جنوں سے اور آدمیوں سے، واسطے ان کے دل ہیں کہ نہیں سمجھتے ساتھ ان کے اور واسطے ان کے آنکھیں ہیں کہ نہیں دیکھتے ساتھ ان کے اور واسطے ان کے کان ہیں کہ نہیں سنتے ساتھ ان کے، یہ لوگ مانند چار پایوں کے ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ تر گمراہ ہیں یہ لوگ وہ ہیں غافل''

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اس خالق موجودات نے اکثر آدمیوں اور جنوں کو جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے، اس آیت سے لازم آتا ہے کہ یہ رنگ آمیزی ازل ہی سے مشیت ایزد متعال کے موافق قدرت کی بساط پر گل کاری کی مقتضی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ چون و چرا کرے۔

جواب:

مَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ، اس مسئلہ کا انحصار ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ پر ہے، یعنی پیدا کیا ہے ہم نے واسطے جہنم کے، اس میں کلام نہیں کہ لغت کے لحاظ سے ذرانا کے معنی سوائے افرینش یعنی پیدائش کے نہیں ہیں، اسی لیے سب مفسرین اسی پر ہیں اور یہ بالکل بجا و درست ہے، لیکن ذَرَأْنَا اور خَلَقْنَا میں بڑا فرق ہے، ہر خَلَقْنَا عدم سے ہستی کی طرف ظہور کے لیے منسوب ہوا ہے، جب اس خالق کائنات نے انسان کی تخلیق کا ارادہ کیا تو فرمایا: إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ (میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں) اور اس کو خلقت اول سے نامزد کیا ہے، بعدہ جب جنس سے جنس کی تخلیق منظور ہوئی تو یوں ارشاد فرمایا:

"وَلَقَدْخَلَقْنَاالْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍمِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍمَّكِيْنٍ ٥ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَعَلَقَةًفَخَلَقْنَاالْعَلَقَةَمُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَعِظٰمًافَكَسَوْنَاالْعِظٰمَ لَحْمًاثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًااٰخَرَفَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "
[المؤمنون: ۱۲ تا ۱۴]

"اور تحقیق پیدا کیا ہم نے آدمی کو سنی ہوئی یعنی بجتی مٹی سے پھر پیدا کیا ہم نے اس کو ایک قطرہ منی کا بیچ جگہ مضبوط کے، پھر پیدا کیا ہم نے منی کو لہو جما ہوا، پس پیدا کیا ہم نے لہو جمے ہوئے کو بوٹی گوشت کی، پس پیدا کیا ہم نے بوٹی کو ہڈیاں، پھر پہنا دیا ہم نے ہڈیوں کو گوشت پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش اور، پس برکت والا ہے اللہ بہتر پیدا کرنے والوں کا"

اس تخلیق کو خَلْقًااٰخَرَ سے موسوم فرمایا ہے، خواہ خلق اول ہو یا خلق اخر، بہر کیف اس خالق یکتا کے فعل حقیقی کے سوا نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جو تخلیق عدم سے ظہور کی طرف پیدا ہوئی ہے وہ بلا تصرف ودخل ماسوی اللہ واقع ہوئی ہے وہ خلق اول ہے، اس پر ذریۃ کا لفظ مطلق نہیں آسکتا، اور نہ ہی وہ کسی کی ذریۃ (اولاد) ہے، اور جو تخلیق کسی جنس سے بحکم خدا ظہور میں آئی ہے یہ خلق اخر ہے، گو مشیت ایزد متعال کی قدرت کاملہ کے ضمن میں یہ بھی مخلوق ہے، لیکن اس کے لیے ذریۃ ہی کا حکم بجا و درست ہے،

كَمَاقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

"وَاِذْاَخَذَرَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ "
[الاعراف: ۱۷۲]

"اور جب لیا پروردگار تیرے نے بیٹوں آدم کے سے پیٹھوں ان کی سے اولاد ان کی کا یعنی عہد۔"

تو اس سے معلوم ہوا کہ ذریۃ بمنزلہ فرع کے ہے اور خلقت اول بمنزلہ اصل، ذریۃ بمعنی اولاد کے ہے اور خلقت اول اس سے مبرا ہے، اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر چیز جس کا ظہور ہو چکا ہے، اور جو کچھ ہونے والا ہے، اس ذات پاک کے علم میں متحقق بالذات ہے، جب ظہور چاہا تو عالم امر کی طرف مرید ہوئے، یعنی عالم امر میں ظہور اول کا ارادہ فرمایا اور وہاں سے عالم شہود میں ظہور اتم کر دیا، اب ان ہر دو تخلیق یعنی روحی

واجسادی کا ذکر قرآن کریم میں اظہر من الشمس ہے جس سے ازلی بد بخت اور شقی تو در کنار ایک لفظ بھی اس قسم کا نہیں پایا جاتا جو یہ ثابت کرے کہ ہم نے روز ازل ہی سے کچھ جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے خلقت کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس تمام بنی نوع انسان کا ازلی مومن ہونا پایا جاتا ہے، چنانچہ اسی عہد الست کے متعلق فرمایا ہے:

"وَمَالَكُمْ لَاتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْاَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" [الحدید:۸]

''اور کیا ہے واسطے تمہارے کہ نہیں ایمان لاتے ساتھ اللہ کے اور رسول پکارتا ہے تم کو تاکہ ایمان لاؤ ساتھ رب اپنے کے اور تحقیق لیا ہے قول تمہارا اگر ہو تم ماننے والے''

صاف ظاہر ہے کہ اگر تم باور کرنے والے ہو تو یہ حق ہے کہ عالم ارواح میں ہم تم سب سے میثاق لے چکے ہیں، اور یہ تاسف اور تعجب کے رو سے ارشاد مبارک ہو رہا ہے کہ ''تم کو کیا ہو گیا ہے جبکہ تم روز میثاق میں میری وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار کر چکے ہو تو پھر کیوں ایمان نہیں لاتے ہو؟ تو اب نور ایمانی سے دیکھنے سے صاف نظر آئے گا کہ اس آیت سے تمام بنی آدم کا ازلی بد بخت نہیں بلکہ ازلی سعید ہونا ثابت ہو رہا ہے، رہا تخلیق اجسادی یعنی عالم دنیا کا ظہور، سوذرا گوش ہوش سے پنبہ غفلت کو وا کر کے کلام الٰہی کا ارشاد سن، تاکہ یہ عقدہ کما حقہ حل ہو جائے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" [الروم:۳۰]

''پیدائش خدا کی کو جو پیدا کیا لوگوں کو اوپر اس کے نہیں بدلنا ہے واسطے پیدائش خدا کی کے۔''

گو موقع ومحل کے رو سے اس خلقت کو میدان دنیا ہی کا شجر کہا جاتا ہے۔ لیکن دراصل یہ فطرت انسانیہ عالم ارواح ہی سے انسان کیلئے ودیعت کی گئی ہے جو روح اور اس کے اصل کے سوا نہیں ہے۔ یہ وجود محض لباس کی مانند ہے۔ خلقت روحی ہو یا جسدی ہرچند آفرینش میں فرق نہیں ہے۔ اصل اور فرع کا سا حال ہے۔ فرع تغیر کا محل ہو سکتا ہے لیکن اصل میں تغیر روا نہیں ہے۔ حدیث شریف اس پر گواہ ہے:

"کُلُّ مَوْلُوْدٍیُوْلَدُعَلَی الْفِطْرَۃِوَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ"

''ہرایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور ماں باپ ہی اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔''

مولیٰ کریم نے انسان کی فطرت اور سرشت کو اپنی صفت سے نسبت دی ہے اور اس کی خلقت کو دین القیم فرمایا ہے جو مطابق لاتبدیل لخلق اللہ ہرگز تبدیل نہ ہوگی۔ اب نور ایمانی کی روشنی میں معائنہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس عزیز الحکیم نے انسان کی خلقت کو عین دین بنایا ہے یا اس کی فطرت کو عین دین پر بنایا ہے۔ تو پھر ازلی بدبخت ہونے کا الزام فطرت سرشت اور خلقت کی وجہ پر ذوالجلال والاکرام کی طرف منسوب کرنا سوائے خطا کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ اور وہ اس لئے کہ آفرینش انسان کی ابتدا عالم امر سے ہوئی ہے۔ اور تمام سرشت کا حامل روح ہی ہے جو حیاتی کا اصل ہے۔ عالم روحانیت میں میثاق کی رو سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی تعلیم وارد ہوئی ہے جس کے جواب میں قَالُوْبَلٰی کی صدا اقرار کی وجہ پر بلند ہوئی۔ پھر ہر چیز کے روبرو امانت پیش کی گئی سب ڈر گئے لیکن مشیت ایزد متعال کی یاوری نے اسے اس کے حامل ہونے کی توفیق دی اور یہ بے بہا دولت اسی کے نصیب میں ہوئی۔ بعد میدان دنیا میں تعلیم وتلقین کیلئے دین الحق کے سمجھانے ،صراط المستقیم پر چلانے ،ضلالات سے بچانے اور اصل مقصود کو پانے کے واسطے پیغمبروں اور نبیوں کو مرسل کرنے کی سنت جاری کردی۔ بتوسل پاک ہستیوں کے اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرمایا:

"فَاِمَّایَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَایَضِلُّ وَلَایَشْقٰی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی"

[طہ:۱۲۳]

''پس اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پس جس نے پیروی کی ہدایت میری کی پس نہ گمراہ ہوگا اور نہ ایذا کھینچے گا۔ اور جس نے منہ پھیرا یاد میری سے پس تحقیق واسطے اس کے معیشت ہے تنگ اور اٹھائیں گے ہم اس کو دن قیامت کے اندھا۔''

سب سے پہلے آدم اور بنی آدم کیلئے یہی وحی ہوئی ہے۔ اب غور وفکر سے معلوم کرنا چاہئے کہ جس کی

ابتدا ایقان واقرار اور تصدیق وایمان پر ہو، اور فطرت وسرشت اس کی دین پر اور آزمائش کے میدان میں تعلیم اپنے کلام پاک اور صدور اطہر انبیاء سے ہو، اس کیلئے اس تمام سلسلہ کے برعکس بلاوجہ وبلا حجت ازلی بدبخت اور شقی کی نوشت بھی تقدیر کی بساط پر تحریر ہو چکی ہو؟ کہنا ہی پڑے گا کہ یہ بالکل محال ہے۔ کیونکہ یہ سارے قرآن شریف میں ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ کے سوا ایک آیت تو درکنار ایک لفظ بھی بلا حجت کہیں پایا نہیں جاتا۔ اور اس آیت کو بھی ان معنوں پر محمول کرنا مفہوم کی غلطی ہے ورنہ کلام الٰہی میں اختلاف واقع ہوگا۔ جو مطابق فرمان مطلق روا نہیں ہے:

"اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" [النساء: ۸۳]

"کیا قرآن مجید کو غور سے نہیں سمجھتے؟ اور اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بے حد اختلاف پاتے۔"

قرآن حکیم کے معانی تطبیق کے معیار پر ہی صحیح ہو سکتے ہیں۔ اور یہ معجز نمائی قرآن حکیم ہے۔ اس لئے نفس آیت مبارک میں تحقیق کی بساط پر غور و تعمق سے معائنہ کرنا از حد ضروری ہے۔

عزیزا! جاننا چاہئے کہ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ کی علت اور حجت لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا پر ہے۔ اور وہ اس طرح پر کہ جس جگہ لَكُمْ یا لَهُمْ کی ضمیر آتی ہے صلہ اس کا منفعت ہوا کرتا ہے۔ جیسے هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَافِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا یعنی جو کچھ زمین میں ہے تمہارے لئے ہے۔ یعنی تمہارے نفع کیلئے ہے۔ یا تمہاری خاطر ہے۔ اسی طرح لَهُمْ قُلُوْبٌ ہے کہ "واسطے ان کے دل تو ہیں۔" تاکہ ان سے سمجھیں، فائدہ اٹھائیں، ہدایت حاصل کریں۔ لیکن لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وہ اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ اسی طرح لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ہے کہ آنکھیں تو مرحمت فرمائی لیکن وہ دیکھتے نہیں۔ اور لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا کہ ہم نے ان کو قوت سماعت تو عنایت کی تھی کہ اس سے سنیں لیکن وہ سنتے نہیں۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ وہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ۔ پس ثابت ہوا کہ خلقت اور سرشت میں (روحانی ہو یا جسمانی) ہر فطرت کو ان اوصاف سے مزین فرمایا ہے۔ ان انعامات سے سرفراز کیا ہے۔ لیکن وہ بمصداق: قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ باوجود ان تمام عنایات کے ناشکری میں گرفتار ہو گئے

دل رکھتے تھے مگر نہ سوچا۔ آنکھوں والے تھے مگر اندھا رہنا پسند کیا، ان کے کان تو تھے مگر جان بوجھ کر نہ سنا، تو مطابق اُولٰئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ اس غفلت کے باعث از روئے غیرت بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ کی وجہ پر نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی کے رو سے تصرف اضافیہ کے تحت میں ذَرَأْنَالِجَهَنَّمَ کے مستحق ہوئے۔

"کَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَى الَّذِیْنَ فَسَقُوْا اَنَّهُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ" [یونس:۳۳]

''اسی طرح ثابت ہوئی بات پروردگار تیرے کی اوپر ان لوگوں کے جو فاسق ہوئے۔ یہ کہ وہ نہیں ایمان لائیں گے۔''

بات ان پر ختم ہوگئی، حجت اپنے اتمام کو پہنچی، ہمیشہ کیلئے دوزخ ان کے نصیب کردی گئی، لیکن یہ الزام اس ذات پاک پر کہ ازل ہی سے وہ جہنم کیلئے پیدا کئے گئے، مطلق روانہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ذرأنا اور خلقنا میں بہت بڑا فرق ہے جس کا کسی قدر ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اب (وَمَاتَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰهِ) اس کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ وضاحت کی جاتی ہے تا کہ یہ اشکال کما حقہ حل ہوجائے۔

اے عزیز! اوپر گزر چکا ہے کہ کسی چیز کا عدم سے ظہور خلق کی تعریف ہے اور باجود خلق ہونے کے ذریۃ کی تعریف اولاد ہے۔ جیسے فرمایا:

"مِنْ ذُرِّیَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَامَعَ نُوْحٍ وَمِنْ ذُرِّیَّةِاِبْرَاهِیْمَ وَاِسْرَائِیْلَ" [مریم:۵۸]

''آدم (علیہ السلام) کی اولاد سے اور ان لوگوں سے جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل (علیہما السلام) کی اولاد سے۔''

جو خَلْقًا اٰخَرَ کے مترادف ہے۔ خلقت، سرشت اور فطرت میں تو مطلق فرق نہیں ہے۔ فرق اس خلقت اور ذریت میں صرف اتنا ہے کہ ذریۃ جو بمنزلہ اولاد ہے، تمام اثرات (تخمی، صحبتی، کسبی، ملکی) سے ازحد متاثر ہے۔ گو تمام اثرات کا حامل ہونا انسان اور اس کے اصل کے سوا نہیں ہے۔ یعنی اس کی خلقت اور سرشت اس عزیز الحکیم نے بے حد اثرات کے قبول کرنے والی بنائی ہے۔ تاہم یہ صورت ذاتیہ ہے۔ اور ذریۃ کیلئے ذاتیہ اور اس پر خارجی اثرات کا غلبہ ازحد مسلمہ امر ہے۔ مثلاً ہندو کا بچہ اپنے والدین کے دین

پر بلاارادہ ہندو ہوا کرتا ہے۔ یہودی کا یہودی، نصرانی کا عیسائی، اور بدھ مذہب کا بدھو۔علیٰ ہذاالقیاس۔ گو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہیں تاہم اکثریت اسی پر ہے (اور حکم اکثر پر ہوا کرتا ہے۔بعض تو صحبت (نیک یا بد) سے متاثر ہو کر بالکل ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ بمصداق:

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالع ترا طالع کند

صحبت کا درک اس قدر غالب ہے کہ بعض اوقات تخمی اثرات پر بھی غلبہ پا جاتا ہے۔شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

پسر نوح بابداں بنشت خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند پئے مرداں گرفت مردم شد

نیز ملکی اثرات کئی وجہ پر ہیں۔لیکن اس جگہ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ مختلف زبانوں اور رنگوں کا فرق فی القرآن المجید:

"وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ"

[الروم: ۲۲]

''اورنشانیوں اس کی سے ہے پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا اور اختلاف بولیوں تمہاری کا اور رنگوں تمہارے کا تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے عالموں کے۔''

بالکل عیاں ہے جو مختلف ملکوں کی بود و باش کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

رہا کسبی، تو یہ دراصل تخمی اور صحبتی اثرات ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جس کے بیان میں بہت طول ہے اور تفصیل کیلئے ایک الگ کتاب درکار ہے جو اس جگہ مقصود نہیں ہے اس لئے یہاں صرف حصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان ماخذ فی الضمیر کے سوا کچھ کر نہیں سکتا اور جو فعل اس سے سرزد ہوتے ہیں انہی کا بندہ ہوا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی!

"کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ" ''ہر شخص اپنی کمائی کے بدلے میں رہن ہے۔''

آمدم برسر مطلب:

بریں وجہ نیک ہو یا بد، مسلم ہو یا کافر، مومن ہو یا منافق، اس کی فطرت میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اگر اس کی فطرت راستی پر صراط المستقیم کو حاصل کر کے فَفِرُّوْااِلَی اللّٰہِ ۱ کی سعادت سے فائز ہوئی، اور رحیم وودود نے اس کی یاوری کی تو وہ مقصود سے مسرور ہوئی اور قرب خداوندی، مشاہدہ الٰہی اور لقائے لامتناہی سے محفوظ کر دی گئی، اور فَازَفَوْزاًعَظِیْمًا ۲ کا مژدہ اس کیلئے مبارک باد دینے والا ہوا۔ اور جن بدبختوں کی سعی ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِالدُّنْیَا ۳ کے مطابق دنیا میں گمراہ ہوگئی۔ بِمَاکَانُوْایَکْسِبُوْنَ ۴ کے رو سے ان کو بعد اور حجاب میں مبتلا کر دیا۔ یا دوسرے لفظوں میں انہوں نے وَمَاظَلَمَھُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنْ کَانُوْٓااَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۵ کے موافق خود یہ مقام حاصل کر لیا۔

یاد رہے کہ ان ہر دو مقامات (اعلیٰ اور اسفل) میں فطرت کی رو سے کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی ہے۔ صرف بعد وقرب کا معاملہ ہے۔ حجاب اور مشاہدہ کا سا حال ہے۔ حجاب سراسر جہنم کا اصل ہے۔

کَمَاقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

"کَلَّآاِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ" [المطففین: ۱۵]

"ہرگز نہیں یوں، یقیناً وہ اپنے پروردگار سے اس دن البتہ حجاب میں ہوں گے۔"

سب عذابوں کا اصل، سب نعمتوں سے محرومی اور سب مصائب کی جڑ ہے، اور قُربِ الٰہی مشاہدہ لامتناہی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، اور وہ اس لیے کہ انسان کا معاملہ اپنے رب کریم کے ساتھ محبت کا ہے، کلام الٰہی اس پر شاہد ہے، اور محبّ کے لیے اپنے محبوب کے حجاب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہوتا۔

اس سارے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ خلقتِ انسانیہ بمنزلہ جبریہ کے ہے، یعنی اس میں کسب کو کسی قسم کا

۱۔ پس دوڑو طرف اللہ کی۔ ۲۔ مراد پائی بہت بڑی مراد۔

۳۔ گم ہوگئی سعی ان کی زندگانی دنیا میں۔

۴۔ بسبب اس چیز کے کماتے تھے۔

۵۔ اور اللہ تعالیٰ نے ظلم نہ کیا اور لیکن آپ ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں

مطلق دخل نہیں ہے، اور ذرأنا انسانی تصرف کے سوانہیں ہے، اور ذرانا صرف اولاد کے لیے مخصوص نہیں بلکہ زراعت وغیرہ بھی اس میں شامل ہے، چنانچہ قرآن مبین میں فرمایا ہے:

۱. "وَجَعَلُوْالِلّٰهِ مِمَّاذَرَاَمِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا"[الانعام: ۱۳۶] ''اوراللہ نے جوکھیتی اورمویشی پیدا کئے ان میں اسے حصہ دار ٹھہرایا۔''

۲. "وَمَاذَرَاَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ"[النحل: ۱۳] ''اوروہ جوتمہارے لئے زمین میں پیدا کیا مختلف رنگوں میں۔''

۳. "وَهُوَالَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ"[المومنون: ۷۹] ''اوروہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اوراسی کی طرف اٹھنا ہے۔''

تو اس سے یہ مقصود حاصل کرنا ضروری ہے کہ جس طرح زمین میں بیج بونے سے بحکم خدااور تصرف وقدرت خداوندی سے اگتا اور بارآور ہوتا ہے، اسی طرح مملکت انسانیہ یعنی زمین قلب میں بھی جوتخم بویا جاتا ہے وہی نشو ونما پاتا ہواثمر تک پہنچ جاتا ہے، بمصداق۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جو ز جو

تو خواہ زمین قلب ہوجوعالم مثال کے مترادف ہے یاارض الدنیا جوعالم شہود یعنی موجودات میں سے ہے، ہردو کی خلقت میں کسی طرح کا تغیر وتبدل نہیں ہوا، ہاں تجربہ سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اچھی اور شیریں زمین جب کسی عارضہ (مثلاً سیم وغیرہ یا کسی اور وجہ) سے کڑوی ہوجاتی ہے تو اس میں خود بخود بلاتخم ایسی تاثیر پیدا ہوجاتی ہے کہ کڑوی اور نمکین جڑیاں مثلاً لانی وغیرہ پیدا ہوجاتی ہیں، اسی طرح عالم مثال کے میدان میں یامملکت انسانیہ کی زمین قلب میں بِمَاكَانُوْايَكْسِبُوْنَ کے عمل نیک یابد کی وجہ سے ایمان یا کفر کا شجر پیدا ہوجاتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے ثمر تک پہنچ جاتا ہے، بایں ہمہ غور وتعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خلقت یا فطرت میں تو کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا، محض کسب کی رو سے قُرب اور بعد کا باعث ہوگیا، جس سے ایمان اور کفر کے ماتحت مومن اور کافر بن کر جنتی اور جہنمی ہونے کا مستحق ہوا، جس کی علت

سراسر کسب اور عمل ہی ہے۔

سوال:

اس میں کلام نہیں کہ ظہور کے میدان میں علت عمل نیک و بد ہی ہے لیکن ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ یعنی پیدا کیا ہم نے اکثر جنوں اور انسانوں کو واسطے جہنم کے کسب اور عمل سے مبرا ہے، بلکہ نا کی ضمیر سے مولیٰ کریم نے اسے اپنے فعل کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

جواب:

اوپر گذر چکا ہے کہ خَلَقْنَا اور ذَرَأْنَا میں بڑا فرق ہے، خَلَقْنَا محض تصرف الٰہی سے ہے اور ذَرَأْنَا کسب انسانی سے، رہا یہ کہ اس کی نسبت اس خالق حقیقی نے اپنی ذات کی طرف رکھی ہے اور یہ بالکل بجا و درست بلکہ حق ہے، لیکن یہ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ [1] کے مطابق بلا حجت نہیں ہے، جیسے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ [2] کی نسبت تو فاعل حقیقی کی طرف ہے، اور حجت اس کی اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا [3] ہے، اسی طرح لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ [4] کی نسبت تو قادرِ مطلق کی طرف ہے، لیکن بموجب وعدہ روز ازل پیروی ابلیس كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ [5] حجۃ بالغہ اظہر من الشمس ہے، نیز نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ [6] دست قدرت کے تصرف کے سوا نہیں جو سراسر فاعل حقیقی کے فعل کے مترادف ہے، لیکن حجت اس کی مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ [7] ہے جو بالکل عیاں ہے۔

خبردار ہونا چاہیے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ [1] اس بات پر شاہد ہے کہ مولیٰ کریم نے انسان کو دِيْنُ الْقَيِّمِ پر خلقت فرمایا ہے کسی کو ازلی بد بخت

۱۔ پس واسطے اللہ کے ہے حجت پہنچی ہوئی۔ ۲۔ مہر کی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر۔

۳۔ بے شک جو لوگ کافر ہوئے۔ ٤۔ ضرور بھریں گے ہم جہنم کو جنوں اور آدمیوں سے۔

٥۔ تجھ سے اور تیرے پیرووں سے۔

٦۔ مسلط کرتے ہیں اس کیلئے شیطان پس وہ اس کا ساتھی ہے۔

۷۔ جو شخص آنکھیں موند لے رحمٰن کی یاد سے۔

نہیں بنایا ہے، ورنہ اس آیت کریمہ کا فائدہ نہیں رہتا ہے، گوسنت الٰہی کے مطابق نُوَلِّـهٖ مَـاتَوَلّٰی کی بساط پر غضبی صورت کا تصرف ظہور پذیر ہے، جوسراسر غیرت کی بناپر بعدوقرب کا باعث ہے تاہم فطرت یعنی خلقت لَاتَبْـدِيْـلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کے موافق تغیر وتبدل کا مقتضی نہیں ہے، اسی طرح لَـقَدْذَرَأْنَا بھی ہے، جس کی علت لَايَـفْقَهُوْنَ بِهَا،لَايُبْصِرُوْنَ بِهَا،لَايَسْمَعُوْنَ بِهَا ہے،قلوب واعین اوراذان خلقت کے مترادف کومذکور ہے اورغفلت بِـمَـا كَـانُـوْايَـكْسِبُـوْنَ کی وجہ پراس سے محروم رہناذرانـا کے موافق ہے جوسراسرکسب اورعمل بد کے مطابق ہے، گونُـوَلِّـهٖ مَـاتَوَلّٰی کی زبردست سنت کے موافق اس فاعل حقیقی کے سوانہیں ہے، لیکن فَـلِـلّٰـهِ الْـحُجَّةُالْبَالِغَةُ کے مطابق یہ سراسرکسب ہی کا نتیجہ ہے، اور جوحدیث شریف میں دوکتابوں کاذکر ہے جن میں اہل دوزخ اوراہل جنت کے نام درج تھے، اس کا بیان پہلے ’’تقدیرانسان ‘‘اور’’قضاوقدر‘‘ کے عنوانوں کے تحت میں گزرچکا ہے۔

حلف بالقرآن

یہ امرمسلمہ ہے کہ سوائے ذات ذوالجلال والاکرام کے کسی مخلوق کی قسم اٹھانا جائزنہیں ہے اورنہ ہی ایسی قسم کا کفارہ ہے، کیونکہ حلف جوبمنزلہ ضمانت، ہیبت اورشہادت کے ہواکرتی ہے بغیراللہ جل شانہ، کے کوئی اس لائق نہیں ہے، وہی خالق موجودات مالک کائنات، وارث زمین وآسمان ہے، جس کے ید قدرت میں ہرمخلوق کانفع وزیان ہے، فَيَـغْـفِرُلِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ کی شان اسی کوزیبا ہے، مخلوق میں سے کسی کویہ طاقت اورقدرت نہیں اس لیے کوئی من دون اللہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی حلف اٹھائی جائے، لیکن سوال حلف بالقرآن کا ہے جس کے غیرمخلوق ہونے پراتفاق ہے۔

بعض اس کے مخلوق ہونے کے قائل ہوئے اورخلیفہ ماموں رشید کے وقت میں یہ مسلہ کافی سے زیادہ اہمیت اختیار کرگیا، بلکہ غیرمخلوق کہنے والوں کوسخت سزاؤں کامتحمل ہوناپڑا۔

گو یہ مسئلہ غیرضروری اورعمل کے میدان میں بے معنی خیال کیا جاتا ہے جس کی تفصیل لاحاصل اور عوام الناس کے لیے فائدہ سے زیادہ نقصان کے خطرے کا باعث ہے، لیکن علمائے دین اس بناپرکہ اعتقاد کے تالاب میں تھوڑی تھوڑی غلاظت ایک دن اسے متعفن کردے گی جوہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے،

دین حق کی آواز کو بلند کرتے ہوئے تحقیق کے میدان میں اُتر آئے اور امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ اعلائے کلمتہ اللہ کے ''جرم'' کی سزا میں سخت ترین تکالیف کو آب حیات سمجھتے ہوئے سختی کے پیمانہ میں صبر واستقلال کے ساتھ پی گئے۔

آج یہ مسئلہ غیر ضروری کا پہلو بدلتا ہوا سخت اشکال کو اپنے دامن میں اٹھائے ہوئے بحث کے میدان میں حق کا طالب ہے، گو اس میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ کلام کرنا غیر مفید نہیں لیکن جس مرض کے علاج میں نمک اجوائن ہی کفائت کر سکے اس کے لیے مروارید حل کرنا لایعنی سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس بیان میں میرا مذہب نہایت اختصار کے ساتھ ہے۔

تعریف مخلوق:

مخلوق وہ ہے جو ارادہ الٰہی کے امر سے ہویدا ہو، یعنی کُنْ سے فَیَکُوْنُ کا لباس پہنے اور حدث کا وجود اس پر ثابت ہو، اور یہ صفات قدیمہ کے فعل کا ظہور ہے، جیسے کُنْ امر، فَیَکُوْنُ فعل، اور یہ صفت بالفعل مولیٰ کریم ہے جس کا ثبات امر کے تابع ہے۔

تعریف غیر مخلوق:

غیر مخلوق وہ ہے جو حدوث سے پاک ہو، وجود کی قیود سے مبرا و منزہ ہو، اور کسی امر الٰہی کے فعل کے ظہور کا مظہر نہ ہو، یعنی کُنْ سے فَیَکُوْنُ کے محل کا مترادف نہ ہو، تو یہ صفات بالذات مولیٰ کریم ہی ہیں، جو سوائے ذات ذوالجلال والاکرام کے کوئی مبدا نہیں رکھتیں، بلاواسطہ کسی تحریک کے صفات بالذات ہیں۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک خالق اور ایک مخلوق، اب یہ ایک تیسری چیز کا اثبات کن معنوں میں ہے؟ کیونکہ یہ محال ہے، شرح عقائد نسفی میں ہے کہ:

"لِاَنَّ الصِّفَاتَ لَیْسَتْ عَیْنًاوَّلَاغَیْرًا" ''یہ صفات نہ غیر ذات ہیں اور نہ عین''

دراصل نصاریٰ کے عقائد کے خلاف یعنی تثلیث کو رد کرنے کے لیے اور صفات کو عین ذات قرار دینے اور تعدد کے خوف سے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمیز کے میدان میں بلاوجود اس برزخ کو روا رکھا ہے،

جس سے مقصودِ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ کی ذات احد کے ان صفات کو متصف کے معنوں پر بیان کرنا ہے، اسی لیے فرمایا ہے کہ یہ اس کے غیر نہیں ہیں، گویا عین ذات ہی ہیں جو بلا تقسیم و تقطیع ذات سے متصف ہیں، اور وہ سات ہیں: حی، قدیر، مرید، کلیم، سمیع، بصیر، علیم، ان صفات ذاتیہ کا فعل سرزد ہو یا نہ ہو، کسی حال یا کسی صورت میں یہ ذات بابرکات سے منفصل اور معدوم نہیں ہوسکتیں، جیسے حیات کو حی سے، قدرت کو قدیر سے، ارادہ کو مرید سے، کلام کو کلیم سے، سماعت کو سمیع اور بصارت کو بصیر سے ایسا تعلق ہے جو کسی زمانہ میں نہ منفک ہوا ہے، نہ ہوسکتا ہے، ان صفات ذاتیہ کو ذات سے ایسا واسطہ ہے کہ گویا یہ عین ذات ہیں

اس میں کلام نہیں کہ قرآن شریف کے کاغذ، قلم، دوات، کاتب، سب کے سب مخلوق ہے، اور یہ کلام اللہ کی صحت اور ظہور کے اسباب ہیں نہ کہ کلام، کیونکہ اسباب بمنزلہ فرع کے ہیں اور کلام اصل، ہر فرع اصل کی طرف راجع ہوا کرتا ہے جو اصل کے سوا نہیں ہے، اور اصل فرع کے سوا ہوسکتا ہے، فرع اختلاف کا محل ہے اور اصل میں اختلاف روا نہیں ہے، جیسے ارشاد ہے:

"نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ" [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴]

''اترا ہے ساتھ اس کے روح الامین (جبریل) تیرے دل پر''

اور اس نزول کے ظہور کے اسباب مختلف ہیں، مثلاً عربی، عبرانی، اور سریانی مختلف زبانیں۔

گو مثالیں یہاں بیگانگی ہیں اور اس بے مثال، لم یزل ولا یزال کی ذات اور صفات کے لیے کوئی مثال درست نہیں آسکتی لیکن فہمائش کے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے، چنانچہ ارشاد مولیٰ کریم:

"وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ o وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" [الذّٰریٰت: ۲۰، ۲۱]

''اور بیچ زمین کے نشانیاں واسطے یقین کرنے والوں کے اور بیچ جانوں تمہاری کے کیا پس نہیں دیکھتے تم''؟

اظہر من الشمس ہے جس میں نشانیاں الٰہیہ کو خداوند کریم نے دو حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ حصہ اول موجودات فی الارض میں، اور دوسرا خود انسان کی ذات میں۔

۱۔ دیکھو، پانی ایک اصل ہے۔ عربی میں ماء کہلاتا ہے فارسی میں آب، انگریزی میں واٹر اور پنجابی میں

پانی علیٰ ہذاالقیاس۔ یہ اصل کے مختلف لباس اور وجود ہیں جو علم وعرف کے لیے پہنائے گئے ہیں۔ ہر ایک کی شکل وصورت مختلف ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی۔لیکن اصل ایک جس میں اس اختلاف سے کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا کسی عارضہ کی وجہ سے شکل تبدیل کرنا مثلاً حرارت پہنچنے کے سبب سے بھاپ بن جانا اور بخارات کا آسمان کی طرف چڑھ کر بادل کی شکل اختیار کرنا اور پھر سردی پہنچنے سے مینہ بن کر اپنی اصلی حالت پر لوٹنا، یہ تمام منازل ومدارج اصل معانی کے مقتضی نہیں ہوسکتے۔

۲۔ اسی طرح نشانات الٰہیہ سے فی انفسکم کے مطابق جو صفات ذات انسان میں موجود ہیں، ان سب صفتوں اور طاقتوں کا اصل روح ہی ہے۔اسی کی طاقت سے سماعت وبصارت، حیات وتکلم، علم وارادے اور قدرت رکھتا ہے۔ جو اپنے اپنے محل پر کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ کی صفت پر کام کرتے ہیں۔ جب بحکم خدا روح پرواز کر جاتی ہے تو یہ تمام افعال فوت ہوجاتے ہیں۔آلات حسی رہ جاتے ہیں جو وجود میں بمنزلہ فرع کے تھے۔لیکن اصل جو روح تھی ،اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔اور نہ ہی اس کی صفات (سماعت وبصارت وغیرہ) کی تقسیم وتقطیع باقی رہ جاتی ہے۔گو دوسرے وجود یعنی عالم روحانیت میں تقسیم ومنازل درست ہیں لیکن اس مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔تاہم ہر وجود اجسادی وروحی کے مدارج ومنازل کا محل فرع ہی ہے نہ کہ اصل، اصل کے لئے صفات کی تقسیم محال ہے۔ورنہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ کے جواب میں قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا فرمان صادر نہ ہوتا۔ان تمام مدارج روحی واجسادی پر انسان ہی کا لفظ بولا جاتا ہے جو بہر وجہ اصل کے تابع ہے۔یعنی وجود کو روح سے، فرع کو اصل سے، عرض کو جوہر سے، مفصل کو مجمل سے، اسم کو مسمیٰ سے، تلفظ کو معنی سے، ظہور کو سر سے اور دائرہ کو مرکز سے ایسا اتحاد ہے جس کی تمیز کسی حالت میں انفعال اور انقطاع نہیں رکھتی۔

عام فہمائش کیلئے جہاں بھر میں بے شمار مثالیں موجود ہیں، صرف گوش ہوش اور چشم بینا درکار ہے۔ مثلاً ہر پودے کا اصل اس کا تخم ہے، جو وجود اور روح رکھتا ہے۔اور اس میں پودا اپنی ہر شکل رکھتا ہوا نظروں سے مستور ہے۔ جب بحکم خدا تعلق ارضی سے نشوونما کے تغیر سے ظہور کی طرف مبذول ہوتا ہے تو اپنے برگ، ٹہنیوں، پھول اور پھل کا حامل ہوجاتا ہے۔جڑ سے لے کر پھل تک روح اور اس کے

ہر وجود کا تعلق ایسا بلا فصل ہوتا ہے جس کی تمیز محال ہے۔

اسی طرح کلام الٰہی جو بلا واسطہ محض صفات ذاتیہ ذوالجلال والاکرام سے ہے اور وجود کلام یعنی قرآن شریف میں تفریق محال ہے۔ اور نہ ہی کوئی صورت اور شکل اختیار کرنے سے یہ مخلوق ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جب کلام کا ظہور نہ تھا تو وہ ذات باری تعالیٰ کے علم میں متحقق تھا جب ظہور کا ارادہ فرمایا اور اپنے علم کو کلام پاک کا لباس پہنانا چاہا، تو اس کو لوح محفوظ کی طرف منسوب فرمایا: بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ عالم امر کے متعلق ہے جو موجودات فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ سے بدرجہا بالاتر ہے۔ لوح لغت میں پٹن یا تختی کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ پٹن یا تختی عقل کے تصور اور احاطہ میں ہرگز نہیں آسکتی۔ کیونکہ عقل کا ادراک عالم محسوسات و معلومات تک ہے۔ عالم معروفات جو عالم امر سے وابستہ ہے عقل و ادراک اس سے جاہل ہے۔ اس لئے عالم معلومات میں اس کو صرف مثالی صورت سے سمجھ لینے کے سوا چارہ نہیں۔ اور وہ اس طرح پر ہے کہ انسان کا قلب جو روح کا مرکز ہے (جس کو امر الٰہی سے تعبیر کرنے میں کلام نہیں) اس کے ارادہ سے کلام الٰہیہ کو اخذ کر کے قوت حافظہ کے سپرد کر لینا بمنزلہ لوح محفوظ کے ہوتا ہے۔ اب وہ حافظ قرآن جو الٓمّٓ سے وَالنَّاس تک کا حامل ہے، جس کے سینے میں تمام قرآن مجید محفوظ و مصون ہے، جہاں سے چاہے اس لوح محفوظ سے بغیر ان ظاہری آنکھوں کے بصارت روحی سے پڑھ کر سنا سکتا ہے اور اس کیلئے حروف و الفاظ اور شکل و صورت عبارت کی احتیاج نہیں ہوتی۔

لیکن اس مثال سے یہ بین فرق معلوم کرنا لازمی ہے کہ وہ لوح محفوظ کسی دل، دماغ یا حفظ کی محتاج نہیں۔ محض عالم امر میں جو اس قادر مطلق کے ارادہ پر منحصر ہے، بلا کسی قیود و حدود کے نوری لباس میں کلام نفسی کے مدارج و مراتب پر متعین ہوئی ہے۔

پھر جب اس لم یزل ولا یزال نے اپنے کلام پاک کو عام کی فہمائش کیلئے ظاہری لباس میں مزین فرمانے کا قصد فرمایا تو روح الامین کے توسل سے قلب اطہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نازل فرمایا۔ تب وہ کلام اللہ لحن و صوت کے تغیر و تبدل سے قرأت کے مدارج پر حروف و الفاظ کی شکلیں اختیار کرتا

ہوا عبارت کی صورت میں الواح وقرطاس یا چڑے وغیرہ پر منقوش ہو کر قرآن مجید کے اسم سے موسوم ہوا۔ اب اس قرآن مجید کو محض مصحف یا مخلوق تصور کرنے والے کو ذرا نور ایمان سے موازنہ کرنا لازم ہے کہ گو لوح محفوظ پر یا وہاں سے قلب اطہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بحکم خدا القا ہوتا رہا، الفاظ وعبادت سے مبرا ومنزہ ہے۔ لیکن کتب مرقوم (خواہ نوری ہو یا سری) کا ارشاد اظہر من الشمس ہے۔ خواہ وجود نوری ہو خواہ اجسادی، قرأت وکتابت کی نفی کسی حالت یا صورت میں نہیں ہو سکتی۔ دیکھو ارشاد مولیٰ کریم:

"وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ"[الطور: ۱ تا ۳] ''قسم ہے طور کی، اور کتاب لکھی ہوئی کی، بیچ جھلی کھلی ہوئی کے۔''

اس کتاب اور سطروں کے متعلق (جسے قرأت کا محل ہی کہا جائے گا۔) فرمان ہو رہا ہے:

"سَنُقْرِئُکَ فَلَاتَنْسٰی" [اعلیٰ: ٦] ''شتاب پڑھائیں گے ہم تمہیں کہ تم کبھی نہ بھولو گے۔''

تو یہ کلام اللہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، علیم خبیر ذوالجلال والاکرام کے علم کل سے لوح محفوظ کی طرف اور وہاں سے قلب اطہر حضور پر نازل ہوتا ہوا حروف والفاظ کی شکل اختیار کر کے میدان قرطاس میں قرآن کے اسم سے موجودہ صورت میں آج ہمارے روبرو ظاہر ہے۔ جس کیلئے هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنِ کی شہادت اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ۱ اور اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا ۲ کافی ہے۔ مزید تصدیق کیلئے دوسری جگہ مفصل ارشاد کس کروفر سے حق کا اظہار فرما رہا ہے:

"وَلَوْاَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْقُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْکُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰی بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا" [الرعد: ۳۱] ''اور اگر قرآن ہوتا کہ چلائے جاتے ساتھ اس کے پہاڑ یا کاٹی جاتی ساتھ اس کے زمین یا بلائے جاتے ساتھ اس کے مردے تو بھی ایمان نہ لاتے۔ بلکہ واسطے اللہ کے ہے حکم سب۔''

۱۔ ہم نے وحی کیا تیری طرف یہ قرآن۔

۲۔ بے شک ہم نے نازل کیا ہم نے اوپر تیرے قرآن نازل کرنا۔

توجوشخص حلف بالقرآن اٹھاتا ہے اس کا مدعا ان تختیوں، کاغذوں اور حروف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اصل کلام اللہ کی حلف دیتا ہے نہ کہ محض فرع کی۔ اگر اس حلف سے الفاظ وحروف یا اسباب ظہور قرآن شریف کے وجود کی قید لازم آتی ہے تو جوشخص اللہ جل شانہ کی حلف اٹھائے، اندریں صورت چاہیے کہ اس کا مدعا بھی اسی اسم معلیٰ کے حروف تک محدود وتصور کیا جائے جو الف، لام اور ہا کے حروف سے مرکب ہو کر لفظ کا لباس پہنے ہوئے صفحہ قرطاس پر منقوش ہوتا ہے۔ جوعین ذات ذوالجلال والاکرام نے عرف اور ظہور اسم ذات کیلئے اسباب مرتب فرمائے ہیں اور جن میں مدعا صرف صحت صورت اور ثبات اسم ذات ہے۔ سب کے سب مخلوق ہی ہیں۔ اور اگر اسم اور عبارت کی تخلیق محض ثابت ذات بابرکات کیلئے سمجھی جائے تو اختلاف اٹھ جاتا ہے۔

سوائے اسم ذات کے صفاتی اسماء مثلاً رحمٰن، رحیم، کریم بلکہ تمام اسماء الحسنٰی جو ہر ایک صفت فعلیہ سے موصوف ہیں سب صفات ذاتیہ مثلاً قدرت اور ارادہ کے فعل کا ظہور ہیں جو اصل ذات ہیں اور اسی کے تابع امر ہیں۔ گو صفات فعلیہ کا تعلق بھی صفات ذاتیہ سے اتصال عینی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ صفات فعلیہ کا مبداء صفات ذاتیہ سے وابستہ ہے اور صفات ذاتیہ کا ذات سے ایسا اتصال ہے جو کسی واسطہ کا محتاج نہیں۔ لہٰذا کلام اللہ تعالیٰ کو ذات پاک سے ایسی معیت ہے جس کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ الان کما کان اس لئے حلف بالقرآن یعنی حلف بالکلام (جوعین صفات ذاتیہ کے ساتھ متصف ہے) حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی حلف ہے۔ جس میں شک کرنا یا کلام اللہ کو مخلوق جاننا سراسر نادانی ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ سُوْءِ الْاِعْتِقَادِ بقول شخصے:

صفات را بہر ذات می جویم
ذات را بہر صفت می جویم

جوشخص کلام ذوالجلال والاکرم کو ماسوی اللہ جانتا ہے وہ کلام اللہ کے مخلوق ہونے کا قائل ہوتا ہے۔ صفات ذاتیہ اور ان کے اصل کو نہیں پہنچانتا اور محض اسباب ظہور پر نظر رکھتا ہوا اصل ذات سے جاہل ہوتا ہے۔ وہ ذات معلیٰ ان حدوث سے پاک ہے مع اپنی تمام صفات کے جن کی صفتیں کسی کی مانند نہیں ہیں۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْر اور جو کچھ کوئی کم فہمی کی وجہ سے اپنی عقل و سمجھ کے ترازو سے موازنہ کرتا ہے وہ ذوالجلال والاکرام اس سے پاک اور بلند و برتر ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۲ ۔ ۱

---

۱ ۔ نہیں ہے مثل اس کی کوئی چیز اور وہ خوب سننے دیکھنے والا ہے۔
۲ ۔ پاک ہے وہ اور بلند اس چیز سے کہ کہتے ہیں بہت بلند اور بہت بڑا۔

شمس العارفین سراج السالکین جامع البرکات غوث زماں خلیفۂ اعظم اعلیٰ حضرت شرقپوری قدس سرہ العزیز

حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری قدس سرہ العزیز

تاجدار آستانہ عالیہ حضرت کیلیانوالہ شریف